بھارت کے
فرعون
خُفیہ مِشن
اے حمید
50

گاڑی جالندھر کے ریلوے سٹیشن سے آگے نکل آئی تھی۔
اب امرتسر کا سٹیشن آ رہا تھا۔ مجھے امرتسر کے سٹیشن پر ہی اترنا تھا۔ جس ڈبے میں بیٹھا تھا وہ ہندو سکھ مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ تھرڈ کلاس کا ڈبہ تھا۔ سب مسافر اپنی باتوں میں لگے ہوئے تھے۔ صرف ایک مسافر اس ڈبے میں ایسا تھا جو تھوڑی بعد مجھے گھور کر دیکھ لیتا تھا۔ یہ آدمی سکھ نہیں تھا۔ اگر سکھ نہیں تھا تو ظاہر ہے ہندو وگا۔ کیونکہ پاکستان بن جانے کے بعد مشرقی پنجاب میں ایک بھی مسلمان نہیں رہا تھا۔ س آدمی کی عمر پچاس پچپن کے قریب ہوگی۔ سر کے بال سفید ہو رہے تھے۔ آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک لگی تھی۔ کھدر کا میلا سا تنگ پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ کھدر کے کرتے کے اوپر صدری پہن رکھی تھی۔ صدری کے اوپر کی جیب کی ساتھ انڈین پن لگا تھا۔ نچلی جیب میں رکھی پاکٹ بک کا اوپر والا حصہ صرف نظر آ رہا تھا۔ یہ ہندو یقیناً" انڈیا کی خفیہ پولیس یعنی سی آئی ڈی کا آدمی تھا۔ شاید وہ دلی سے ٹرین میں میرا پیچھا کر رہا تھا۔ کیونکہ مجھے یاد ہے جب جالندھر کے سٹیشن پر گاڑی رکی تھی تو میں پلیٹ فارم والی کھڑکی میں سے سر باہر نکالے دیکھ رہا تھا۔ اس آدمی کو میں نے ٹرین کے ایک ڈبے سے نکل کر اپنے ڈبے کی طرف آتا دیکھا تھا۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ وہ دلی سے میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔
میرے پاس باقاعدہ پاکستان کا پاسپورٹ تھا اور اس پر ویزا بھی لگا ہوا تھا۔ مگر ویزا صرف دلی شہر کا لگا ہوا تھا۔ میں دلی شہر سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے قانون شکنی کی تھی

اور دلی شہر سے ٹرین میں سوار ہو کر امرتسر کی طرف چل پڑا تھا۔ آخر میں نے یہ قانون
شکنی کیوں کی تھی؟ اس کا جواب میری زندگی کی وہ حیرت انگیز جذبہ حب الوطنی، قومی
حمیت، اور جذبہ غیرت میں ڈوبی ہوئی سچی داستان ہے جو میں آپ کو سنانے چلا ہوں۔ یہ
زمانہ پاک بھارت جنگ 65 سے ایک سال پہلے کا زمانہ تھا۔ مشرقی پنجاب میں خالصتان کی
تحریک کی وجہ سے بھارت کی حکومت نے پنجاب کے شہروں کا ویزا دینا بند کر رکھا تھا۔
چنانچہ میں نے دلی شہر کا ویزا لگوا لیا۔ وجہ دلی شہر کی درگاہوں اور تاریخی مقامات کی سیرو
سیاحت لکھی۔ دلی میں میرے والد صاحب کے ایک دوست سنگر مشینوں کی مرمت کا کام
کرتے تھے۔ میں سیدھا ان کے پاس پہنچا۔ بھارتی باڈر کی چیک پوسٹ والوں کو میں نے
والد کے اس دوست کا نام اور ایڈریس غلط لکھوایا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں دلی کی
سیرو سیاحت کے لئے بھارت میں داخل نہیں ہوا تھا۔ میرا ایک خاص مشن تھا اور مجھے دلی
سے بغیر ویزے کے امرتسر جانا تھا۔ اور یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ مجھے کتنے دن کتنے مہینے غیر
قانونی طور پر انڈیا میں رہنا ہو گا۔

میرا مشن ایک مقدس مشن تھا۔ یہ مشن کیا تھا؟ یہ آپ کو آگے چل کر خود بخود
معلوم ہو جائے گا۔ میں نہیں چاہتا تھا۔ میرے وقت مقررہ پر بھارت سے واپس پاکستان نہ
جانے کی صورت میں پولیس میرے والد کے دوست کو گرفتار کرے یا اسے تنگ کرے۔
میرے والد صاحب کے اس دوست کا نام ظہرالدین تھا اور چاندنی چوک میں اس کی ایک
چھوٹی سی دکان تھی۔ جہاں وہ سلائی مشینوں کی مرمت کا کام کرتا تھا۔ اس کو میں نے بالکل
نہ بتایا کہ میں اصل میں کس مشن کو لے کر بھارت آیا ہوں۔ اسے بتانے کی ضرورت بھی
نہیں تھی۔ اس شریف آدمی کے پاس میں دو دن رہا اور پنجاب او. انڈیا کے بارے میں
کافی معلومات حاصل کرتا رہا۔ کیونکہ اس سے پہلے میں نے امرتسر مجیٹھ، ویر کا بٹالہ، گور
داسپور اور کھتو نگل کے سوا انڈیا کا کوئی علاقہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جب پاکستان بنا تو اس
وقت میری عمر یہی کوئی بارہ تیرہ سال کی ہو گی اور میں اپنے قصبے مجیٹھ کے ایک ہائی سکول
میں پڑھ رہا تھا۔ میری والدہ کی وفات ہو چکی تھی۔ میری صرف ایک چھوٹی بہن تھی۔ والد

صاحب نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ انہوں نے ہم دونوں بہن بھائیوں کو پڑھا لکھا کر
لائق بنانا اور ہمیں باپ کے ساتھ ساتھ والدہ کی بھی شفقت عطا کرنا اپنی زندگی کا مقصد
بنا لیا تھا۔ جب پاکستان بن گیا اور مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا تو ہم
بھی ایک قافلے میں شامل ہو کر مجیٹھے نکل پڑے۔ پاکستان پہنچنے سے پہلے ہم پر کیا بیتی؟ یہ
میری سچی داستان کی اصل بنیاد ہے جو میں آپ کو ذرا آگے چل کر بتاؤں گا۔ ابھی میں
صرف یہ بتانا چاہوں گا کہ پاکستان آنے کے بعد میں دوبارہ کبھی انڈیا نہیں گیا تھا۔ اب میں
واپس اپنے والد صاحب کے دوست ظہرالدین کے پاس آتا ہوں جس سے میں نے ریل
گاڑیوں کے اوقات وغیرہ کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کیں۔ میرے پاس اتنی
ہی انڈین کرنسی تھی جتنی کرنسی کی قانونی طور پر مجھے اجازت تھی۔ میرا مشن ایسا تھا کہ
مجھے دلی سے نکلنے کے بعد اپنی تمام ضروریات جائز اور ناجائز طریقوں سے خود ہی پوری کرنی
تھیں۔ اس وقت میں چوبیس پچیس سال کا صحت مند بھرپور جوان تھا۔ میں نے جان بوجھ
کر شلوار قمیض نہیں پہنی تھی۔ کیونکہ یہ اس زمانے میں بھی مسلمانوں کا لباس سمجھا جاتا
تھا۔ اگرچہ ابھی یہ ہمارا قومی لباس نہیں بنا تھا۔ میں لاہور سے ہی پرانی مگر مضبوط کپڑے
کی بنی ہوئی ولایتی جینز ٹائپ کی پتلون اور اسی رنگ کی میلی سی جیکٹ پہن کر چلا تھا۔
پاؤں میں جوگر شوز پہن لئے تھے۔ دلی میں آ کر میں نے دیکھا کہ وہاں بھی نوجوانوں میں
اس قسم کا ہپی ٹائپ کا رف ٹف لباس بڑا مقبول تھا۔ اس لباس سے یہ بالکل نہیں پتہ چلتا
تھا کہ یہ آدمی مسلمان ہے یا ہندو ہے۔

ظہرالدین کے گھر میں دو دن رہنے کے بعد میں نے ایک روز انہیں کہا کہ میں جامع
مسجد دیکھنے جا رہا ہوں۔ وہاں سے میں سیدھا دلی کے ریلوے سٹیشن پر آ گیا۔ میں نے پہلے
سے معلوم کر لیا تھا کہ امرتسر جالندھر کی طرف گاڑی کس وقت چلتی ہے۔ میں نے سٹیشن
پر آ کر امرتسر کا ٹکٹ لیا اور پلیٹ فارم پر آ کر بیٹھ گیا۔ جب گاڑی پلیٹ فارم پر لگی تو میں
کچھ دوسرے مسافروں کے ساتھ تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں بیٹھ گیا۔ یہ موسم ایسا تھا
جس کو ہمارے پنجاب میں خوش بہار کا موسم کہتے ہیں۔ یعنی مارچ کے مہینے کا موسم۔ میں

پاکستان میں ہی تھا تو ایک دو بارشیں بھی ہوگئی تھیں جس سے موسم میں خنکی آگئی تھی۔ دلی میں بھی موسم خوشگوار تھا۔۔

گاڑی امرتسر کی طرف چل پڑی۔

دلی کے بارے میں میں نے سنا بھی تھا اور سکول کی کتابوں میں پڑھا بھی تھا کہ وہاں مسلمان بادشاہوں نے کئی سال تک حکومت کی ہے اور وہاں مسلمانوں کی بڑی یادگار عمارتیں محل اور قلعے ہیں۔ مگر میں نے سوائے جامع مسجد کے اور کچھ نہ دیکھا۔ میرا مشن ایسا تھا کہ میرا دھیان اپنے آباؤ اجداد کی تاریخی عمارتوں کی طرف جا ہی نہیں سکتا تھا۔ جامع مسجد میں بھی میں ایک دن نماز پڑھنے چلا گیا تھا۔ میں کوئی نمازی پرہیز گار نوجوان نہیں تھا۔ پاکستان میں کبھی کبھار ہی نماز پڑھ لیا کرتا تھا۔ مجھے نماز پڑھنی آتی بھی نہیں تھی۔ مگر دلی کی جامع مسجد میں میں خدا کے حضور سجدہ ریز ہو کر اپنے مشن کی کامیابی کے لئے ضرور دعا مانگنا چاہتا تھا۔ جب وہاں گیا تو نماز کا وقت ہوگیا تھا۔ نمازی پہلے سے موجود تھے۔ میں بھی وضو کر کے ان کے پیچھے بیٹھ گیا۔ نماز کے بعد ہاتھ پھیلا کر آنکھیں بند کر کے اللہ کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگی کہ وہ مجھے میرے مشن میں کامیاب کرے اور مجھے اتنی توفیق دے کہ میں اپنے مرحوم باپ کی روح کو سکون پہنچا سکوں۔ میں جامع مسجد کی عظمت اور شان و شوکت دیکھ کر حیران ضرور ہوا تھا اور سوچنے لگا تھا کہ اتنی عظیم الشان مسجد بنانے والے مسلمان اسے ہندوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر کیوں چلے گئے۔ کیونکہ میں نے دلی میں دیکھا تھا کہ مسلمانوں کی حالت ہندوؤں کے مقابلے میں اتنی اچھی نہیں تھی۔

گاڑی امرتسر کی طرف دوڑی چلی جا رہی تھی۔ ایکسپریس ٹرین تھی۔ اس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ اس کی رفتار کافی تیز تھی اور وہ چھوٹے چھوٹے سٹیشن چھوڑتی جا رہی تھی۔ پاکستانی پاسپورٹ میری جیب میں تھا اور اس پر صرف دلی کا ویزا لگا ہوا تھا۔ اگر پولیس کا کوئی آدمی میری چیکنگ کرتا تو مجھے گرفتار کر سکتا تھا۔ کیونکہ میں ویزے کے بغیر مشرقی پنجاب کے شہروں کی طرف جا رہا تھا۔ کئی بڑے شہروں کے سٹیشن آئے۔ گاڑی وہاں تھوڑی دیر کے لئے رکتی اور پھر آگے روانہ ہو جاتی۔ اس طرح سفر طے کرتے کرتے

گاڑی پنجاب میں داخل ہوگئی۔ لدھیانہ آیا اور گزر گیا۔ پھر جالندھر کے اسٹیشن پر گاڑی رکی۔ مجھے دلی سے چلتے وقت ہی اس بات کا دھڑکا لگا تھا کہ کہیں کوئی خفیہ پولیس کا آدمی میرے پیچھے نہ لگا ہو۔ جالندھر سکھوں کا شہر تھا۔ پلیٹ فارم پر تقریباً سبھی سکھ ہی سکھ نظر آئے۔ میں کھڑکی کے ساتھ بیٹھا باہر دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک ادھیڑ عمر ہندو کو دیکھا کہ پچھلے کسی ڈبے سے نکلا اور ہمارے ڈبے میں داخل ہوگیا۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ لیکن جب گاڑی چلی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ میری طرف تھوڑی تھوڑی دیر بعد گھور کر دیکھ لیتا ہے۔ یہ وہی ہندو تھا جو اب بھی میرے ڈبے میں دوسرے مسافروں کے ساتھ کونے میں بیٹھا کسی وقت مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگتا تھا اور جس کا ذکر میں اپنی داستان کے شروع میں کر چکا ہوں۔ جب میرے دل میں خیال پختہ ہوگیا کہ یہ شخص ضرور خفیہ پولیس کا آدمی ہے تو پہلا رد عمل مجھ پر یہ ہوا کہ میرے بدن میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میں پاکستان میں نہیں تھا۔ اپنے ملک میں نہیں تھا۔ بلکہ دشمن ملک میں تھا۔ ہندو سکھوں کے ملک میں تھا جہاں کے مسلمان شہریوں کی کوئی عزت آبرو نہیں تھی۔ پاکستانی مسلمان کی جان و مال کے تحفظ کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ویزا پاسپورٹ رکھنے کے باوجود بھارتی پولیس جس پاکستانی مسلمان کو چاہے پکڑ کر تھانے لے جا سکتی تھی۔ میں نے ایسے کئی واقعات سنے تھے کہ بھارتی پولیس کسی پاکستانی مسلمان کو دلی بمبئی یا کسی دوسرے شہر میں یونہی پکڑ کر تھانے لے گئی اور پھر اس کا کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں غائب ہوگیا۔ عام طور پر بھارتی پولیس ایسے پاکستانیوں پر جاسوسی کا الزام لگا کر انہیں جیلوں میں بند کر دیتی اور ان پر اسقدر تشدد کیا جاتا کہ وہ جیل میں ہی سسک سسک کر مر جاتے۔

یہی وجہ تھی کہ جب مجھے یقین سا ہوگیا کہ یہ ادھیڑ عمر کا نہرو کٹ صدری والا ہندو سی آئی ڈی کا آدمی ہے اور میرے پیچھے لگا ہوا ہے تو میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی تھی۔ یہ میرا پہلا رد عمل تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنا دھیان اپنے خدا کی طرف اور پھر اپنے مشن کی طرف کر لیا۔ میرا آدھا خوف دور ہوگیا۔ کیونکہ میں جان کی بازی لگا کر پاکستان سے اپنے مشن کی تکمیل کے لئے نکلا تھا۔ اور دل میں یہ عہد کر کے نکلا تھا کہ

اپنے مشن کی تکمیل سے پہلے مجھے مرنا نہیں ہے۔ اور اگر مرنے کا وقت آگیا تو چھ سات کافروں کو مار کر مروں گا۔ خدائے ذوالجلال اور اس کے نبی پاک پر یقین کامل نے مجھے حوصلہ دیا اور میرے دل سے خوف بالکل نکل گیا۔ اب میں اس خفیہ پولیس والے ہندو سے بچ نکلنے کی ترکیبوں پر غور کرنے لگا۔

اتنا مجھے معلوم تھا کہ یہ شخص اچانک مجھے نہیں پکڑے گا۔ کیونکہ ایسا وہ جب چاہے کر سکتا تھا۔ اس کا اپنا ملک تھا۔ اپنی حکومت اور اس کی اپنی پولیس تھی جو ٹرین کے ساتھ بھی سفر کر رہی تھی۔ اس کے اپنے ہندو سکھ لوگ تھے۔ اگر وہ مجھے پکڑ کر صرف یہ اعلان کر دے کہ میں پولیس کا آدمی ہوں اور یہ لڑکا پاکستان کا جاسوس ہے تو ڈبے کے سارے مسافر نہ صرف یہ کہ اس کے ساتھ ہو جائیں گے بلکہ مجھ پر حملہ بھی کر دیں گے۔ لیکن ابھی تک اس نے مجھ پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ اصل میں وہ میری نگرانی کر رہا تھا اور یہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کہ میں ویزے کے بغیر امرتسر کی طرف کہاں جا رہا ہوں۔ کس سے ملنے جا رہا ہوں اور میرے ساتھی جاسوس کہاں کہاں پر ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ مجھے اس پر خفیہ پولیس کے آدمی ہونے کا ذرا سا شک بھی ہو۔ مگر اس کے بار بار میری طرف گھور گھور کر دیکھنے سے مجھے نہ صرف اس پر شک ہوا تھا بلکہ یقین ہو گیا تھا کہ یہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے۔ جو بعد میں سچ ثابت ہوا۔ اس وقت دن ڈھل رہا تھا۔ گاڑی کی دونوں جانب دور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں میں دن کی روشنی ماند پڑتی جا رہی تھی۔ گاڑی ایک چھوٹے سے سٹیشن پر سے تیزی سے گزر رہی تھی۔ میں نے سر باہر نکال کر دیکھا۔ پلیٹ فارم کے آخر میں ایک تختے پر ہندی میں کسی سٹیشن کا نام لکھا ہوا تھا جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک سکھ مسافر سے پوچھا کہ یہ کونسا سٹیشن گزرا ہے تو اس نے کہا۔

"مانا والہ"

میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کیونکہ اس کا مطلب تھا کہ امرتسر کا سٹیشن آنے ہی والا تھا بارہ سال پہلے جب میں ضلع امرتسر کے قصبے مجیٹھے کے ہائی سکول میں پڑھا کرتا تھا تو

اسکول کے لڑکے آکر سیر کرنے گاڑی میں بیٹھ کر مانا والے آجایا کرتے تھے۔ یہ سٹیشن کا نام اردو میں لکھا ہوتا تھا۔ اب یہ نام ہندی میں لکھا ہوا تھا۔ اردو کا نام ہٹا دیا گیا تھا۔ یہ بھی ایک تبدیلی میں نے محسوس کی۔ دوسری تبدیلی میں نے یہ دیکھی کہ جالندھر سے لیکر مانا والے تک راستے میں دونوں جانب جو دیہات کھیتوں میں دکھائی دیئے ان میں کسی جگہ کوئی مسجد نظر نہیں آئی تھی۔ ورنہ پہلے ان دیہات میں کسی نہ کسی جگہ درختوں میں سے کسی نہ کسی مسجد کے مینار ضرور نظر آیا کرتے تھے۔ یہ سکھوں کے دیہات تھے اور پاکستان بن جانے کے بعد انہوں نے مسجدوں کو مسمار کر دیا تھا۔ کئی جگہ ان مسجدوں کو گردواروں یا مندروں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

گاڑی مانا والہ کے سٹیشن سے کافی آگے نکل گئی تھی۔ اب مجھے علاقہ اپنا جانا پہچانا لگنے لگا تھا۔ ایک پھاٹک آکر گزر گیا۔ اس کے ساتھ ہی آموں کا ایک گھنا باغ آیا جس کے گرد چار دیواری کھنچی ہوئی تھی۔ میں نے یہ باغ پہچان لیا۔ اسے سرداروں کا باغ کہتے تھے اور یہاں گرمیوں کے موسم میں ہم سکول کے لڑکوں کے ساتھ آم توڑنے آیا کرتے تھے۔ ہم باغ کی دیوار پر چڑھ کر آم توڑتے اور راکھے کے آنے سے پہلے آم توڑ کر چھلانگیں لگا کر بھاگ جایا کرتے تھے۔

اس کے بعد وہ ریلوے لائن آگئی جو امرتسر کے امرودوں کے باغ کے پہلو سے ہوتی ہوئی ہمارے گاؤں مجیٹھ کی طرف جاتی تھی۔ اس ریلوے لائن کو دیکھ کر میں اداس ہو گیا۔ میں کئی بار اپنے والد اور چھوٹی بہن کے ساتھ ٹرین میں بیٹھ کر اس لائن پر سے گزرا تھا۔ یہ ریلوے لائن آم اور امرود کے باغوں کی طرح ویسی کی ویسی تھی۔ اب ٹرین امرتسر شہر میں داخل ہو چکی تھی۔ اس کی ایک جانب شریف پورہ تھا جو پاکستان بننے سے پہلے مسلمانوں کا گڑھ تھا۔ اور دوسری طرف کمپنی باغ شروع ہو گیا تھا۔ ڈنڈا پولیس کا پھاٹک بھی گزر گیا تھوڑی دیر بعد ٹرین امرتسر کے سٹیشن میں داخل ہو گئی۔

ہندو سکھ مسافر اپنا اپنا سامان سمیٹ رہے تھے۔ میں نے آنکھ بچا کر خفیہ پولیس والے کی طرف دیکھا۔ وہ بھی میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی سیٹ پر بڑے سکون سے

بیٹھ سگریٹ پی رہا تھا اور اس نے نگاہ مجھ پر رکھی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ اس مصیبت سے کیسے بچا جائے۔ مجھے یہ خطرہ بھی تھا کہ ہو سکتا ہے یہ امرتسر سٹیشن کے پلیٹ فارم پر اترتے ہی مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دے۔ گاڑی پلیٹ فارم پر رینگتی ہوئی رک گئی۔ میں نے پلیٹ فارم پر تین چار سکھ پولیس کانسٹیبلوں کو دیکھا تو ایک بار پھر جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ گاڑی یہاں آکر ختم ہو جاتی تھی جس کی وجہ سے سارے کے سارے مسافر ٹرین سے باہر نکل رہے تھے اور کافی شور شرابا مچ گیا تھا۔ میں بھی اس ہجوم میں ڈبے سے اتر گیا۔ میں نے پہلے ہی دل میں سوچ لیا تھا کہ پلیٹ فارم کے گیٹ سے باہر نہیں نکلوں گا۔ ہر ڈبے کے باہر مسافروں کا کافی رش تھا۔ ایک قلی سر پر بہت سا سامان اٹھائے میرے آگے آگے جا رہا تھا۔ میں تیزی سے اس کے پہلو سے ہو کر اگلے ڈبے کے مسافروں میں گھس گیا اور وہاں سے دوسرے ڈبے کے دروازے میں سے گزر کر ڈبے کے اندر چلا گیا جو تقریباً خالی تھا۔ اس کے دوسرے دروازے میں جلدی سے لٹک کر نیچے ریلوے لائن پر اتر گیا۔ میں نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ یہاں لائن کے ساتھ ساتھ لوہے کا جنگلا لگا ہوا تھا۔ ایک جگہ جنگلے کا ایک پائپ اکھڑا ہوا تھا۔ کچھ مسافر اس میں سے گزر کر سامنے والے پلیٹ فارم کی طرف جا رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ سامنے والے پلیٹ فارم پر نکل گیا اور وہاں سے دوسری جانب جہاں ریل کی پٹڑیوں کا جال بچھا ہوا تھا اتر گیا۔

یہ ساری جگہیں میری دیکھی بھالی تھیں اور میں نے محسوس کیا تھا کہ بارہ سال میں یہاں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ میرا ارادہ ریلوے لائینوں پر سے گزر کر سامنے والی دیوار پھلانگ کر ریگو برج کو جانے والی سڑک پر نکل آنے کا تھا۔ جب کبھی ہم سکول کے دو دوست مجیٹھے سے بغیر ٹکٹ ریل گاڑی میں بیٹھ کر امرتسر آتے تھے تو اسی دیوار کو پھلانگا کرتے تھے۔ دیوار زیادہ دور نہیں تھی۔ دیوار کے قریب پہنچ کر میں نے پہلی بار پیچھے مڑ کر دیکھا کہ وہ سی آئی ڈی والا کہیں میرے پیچھے پیچھے تو نہیں آ رہا۔ مجھے اس کی شکل کہیں نظر نہیں آئی۔

میں بڑا خوش ہوا۔ ایک جگہ سے میں نے دیوار پھاندی اور دوسری طرف سڑک

آگیا۔ امرتسری مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ ریگو برج کو جو سڑک جاتی تھی اس کی بائیں جانب گول باغ ہوا کرتا تھا۔ اس گول باغ سے پہلے ایک چھوٹا سا میدان آتا تھا جہاں کوئی سبزہ نہیں تھا۔ بادامی رنگ کی مٹی کا میدان تھا۔ اس میدان میں دو بزرگوں کے مزار تھے۔ جن میں سے ایک بزرگ کا نام فتح شاہ بخاری” تھا اور دوسرے بزرگ کا نام شنکر شاہ” صاحب تھا۔ خدا معلوم دوسرے بزرگ کا اصلی نام کیا تھا مگر سب لوگ ان کے مزار کو شنکر شاہ کے مزار کے نام سے ہی یاد کرتے تھے اور ان کا یہ نام مشہور تھا۔ یہ دونوں مزار پاس پاس تھے۔ شنکر شاہ کے مزار کے احاطے میں درخت تھے اور ایک کنواں بھی تھا۔

فتح شاہ بخاری” کے مزار کے اردگرد دھریک کے درخت ہوتے تھے۔ اس مزار کو فتح شاہ بخاری کے مزار کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ بچپن میں مجھے یاد ہے میری والدہ تاری کے چاولوں کی دیگ پکوا کر یہاں مہینے کی پہلی جمعرات کو لایا کرتی تھی۔ میں اور میری چھوٹی بہن اور والد صاحب بھی ساتھ آیا کرتے تھے۔ تاری نمکین چاول ہوتے تھے جن میں ہلدی کی آمیزش کی جاتی تھی اور بڑے لذیذ ہوتے تھے۔ والدہ کی وفات کے بعد میرے والد صاحب نے یہ فرض سنبھال لیا۔ وہ ہر جمعرات کو دیگ پکا کر لاتے اور فتح شاہ بخاری” کے مزار پر خود لوگوں میں تقسیم کرتے۔ ہم سارا دن مزار شریف پر گزارتے۔ میں اپنی بہن کے ساتھ میدان میں دوڑیں لگاتا فتح شاہ بخاری” کے مزار کا متولی والد صاحب کا دوست بن گیا تھا۔ والد صاحب اسے شاہ جی کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ والد صاحب نے بستر مرگ پر لیٹے ہوئے مجھے جو اہم مشن تفویض کیا تھا اس کے سلسلے میں کہا تھا کہ میں امرتسر جا کر سید فتح شاہ بخاری” کے متولی سے ملوں۔ ہو سکتا ہے وہ ابھی تک زندہ ہو۔ وہ میرے مشن کے سلسلے میں میری مدد کر سکتا ہے۔

چنانچہ امرتسر کے ریلوے یارڈ کی دیوار پھاندنے کے بعد میں نے سڑک پار کی اور گول باغ میں داخل ہو گیا۔ میں بارہ سال کے بعد گول باغ میں داخل ہو رہا تھا۔ یہاں بھی سوائے چند ایک درختوں کے کوئی چیز نہیں بدلی تھی۔ کچھ درخت ضرور غائب ہو گئے تھے۔ گراؤنڈ میں گھاس بھی پہلے سے کم نظر آ رہی تھی۔ باقی سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ میں

باغ کی گراؤنڈ میں سے گزر کر خالی میدان میں داخل ہوگیا۔ اس میدان کا ایک کنارا امرتسر کے ہال کے گیٹ کے قریب سیڑھیوں والے پل کی طرف جا لگتا تھا۔ اسی میدان میں سید فتح شاہ بخاریؒ کا مزار تھا۔ یہاں ضرور تبدیلی آچکی تھی۔ میدان کے کنارے کنارے کھوکھے ہی کھوکھے بنے ہوئے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہاں پھلوں کی منڈی بن گئی ہوئی ہے۔ ایک طرف ریڑھے اور چھکڑے کھڑے تھے۔ مزار کی چاردیواری ویسے کی ویسی تھی اور معلوم ہوا کہ ہندو سکھ یہاں آکر چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور منتیں مانتے ہیں۔ میرے بچپن کے دھریک کے درخت بہت زیادہ گھنے ہوگئے تھے۔ مزار کے چھوٹے سے دروازے پر اسی طرح چمکدار جھالروں والا سہرا لٹک رہا تھا اور فضا میں اگربتیوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی شام کی سیاہی آہستہ آہستہ آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی اور مزار کے اندر مٹی کے کچھ دیئے بھی جل رہے تھے اور دروازے کے اوپر والا بلب بھی روشن ہوگیا تھا۔

ایک سکھ اپنی بیوی کے ساتھ ہاتھ باندھے سر جھکائے مزار کے اندر سے باہر نکل رہا تھا۔ دو تین ملنگ درختوں کے نیچے بیٹھے تھے۔ خدا جانے یہ مسلمان ملنگ تھے جو میرٹھ انبالے کے شہروں سے آگئے تھے۔ کیونکہ امرتسر شہر میں کوئی مسلمان نہیں تھا۔ مجھے ابھی تک سی آئی ڈی والے ہندو کا خیال لگا ہوا تھا۔ میں نے یہاں مزار میں داخل ہونے سے پہلے بھی پیچھے مڑ کر دیکھا۔ شام کا اندھیرا میدان میں پھیلنے لگا تھا۔ مجھے وہ خفیہ سروس کا ہندو کانسٹیبل کہیں نظر نہ آیا۔ یقیناً" اس سے میری جان چھوٹ گئی تھی۔ میں مزار کے اندر داخل ہوگیا۔ ایک طرف کھڑے ہوکر دعائے فاتحہ پڑھی اور پھر بائیں جانب ایک کوٹھڑی بنی ہوئی تھی اس طرف غور سے دیکھا۔ کوٹھڑی کے اندر بجلی کا بلب روشن تھا۔ ایک بوڑھا آدمی جس نے سبز رنگ کے کپڑے پہنے تھے اور سفید داڑھی تھی، کوٹھڑی کے باہر ایک طرف بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ میں نے قریب جاکر سلام کیا تو اس آدمی نے آنکھیں کھول دیں اور کسی قدر تعجب سے مجھے دیکھنے لگا۔

"کہاں سے آئے ہو یہاں؟"

اس کی اردو خالص اہل زبان والوں کی اردو لگتی تھی۔ میں نے کہا۔ "دلی سے آیا ہوں شاہ صاحب سے ملنا ہے"

میں نے شاہ صاحب کا نام لیا جو مجھے والد صاحب نے بتا دیا تھا۔ اس شخص نے کوٹھڑی کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"اندر چلے جاؤ"

کوٹھڑی کا دروازہ چھوٹا سا تھا اور کھلا تھا۔ میں نے جوتے باہر اتارے اور اندر داخل ہوگیا۔ ایک بزرگ صورت سبز پوش آدمی گاؤ تکئے سے ٹیک لگائے بڑے سکون کے عالم میں بیٹھا تھا۔ آنکھیں تھوڑی بند تھوڑی کھلی تھیں۔ ہاتھ میں تسبیح تھی۔ منہ میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ انگلیاں تسبیح کے دانوں پر چل رہی تھیں۔ میں سلام کرکے ادب سے ایک طرف بیٹھ گیا۔ بزرگ نے نیم وا آنکھوں سے مجھ پر ایک نگاہ ڈالی۔ وعلیکم السلام کہا اور پھر اپنی کیفیت میں ڈوب گئے۔ کوٹھڑی میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ موقع بڑا مناسب تھا۔ میں بات شروع کرنے ہی والا تھا کہ بزرگ نے فرمایا۔

"بھائی کہاں سے آئے ہو؟ پہلے تمہیں یہاں کبھی نہیں دیکھا"

میں نے فتح شاہ بخاریؒ کے متولی کا نام لے کر کہا کہ مجھے شاہ صاحب سے ملنا ہے۔ میں دلی سے آیا ہوں۔ میں نے ابھی انہیں بالکل نہ بتایا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں۔ بزرگ نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور کہا۔

"برخوردار! شاہ صاحب کو انتقال فرمائے تو سات برس ہوگئے ہیں۔ مجھے بتاؤ۔ میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ میں ان کا چھوٹا بھائی ہوں۔ مجھے سید غلام علی شاہ کہتے ہیں۔"

میں سوچ میں پڑ گیا کہ ان پر اپنے دل کا راز افشا کرنا مناسب رہے گا یا نہیں۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ باہر کچھ شور و غل کی آوازیں بلند ہوئیں۔ سید صاحب نے کڑک دار آواز میں پوچھا۔

"یہ باہر کیا ہو رہا ہے حیدر علی؟"

مزار کا ایک ملازم گھبرایا ہوا اندر آیا اور بولا۔

"شاہ جی باہر پولیس آئی ہے۔ تھانیدار بھی ساتھ ہے۔ کہتا ہے یہاں کوئی پاکستان کا جاسوس چھپا ہوا ہے۔"

میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ سی آئی ڈی والا ہندو جو جالندھر یا شاید دلی سے میرے پیچھے لگا ہوا تھا وہ پولیس لے کر مجھے گرفتار کرنے آگیا ہے۔ میں نے جلدی سے سید صاحب کے پاؤں پکڑ لئے اور کہا۔

"شاہ جی! میں پاکستان سے ایک نیک مقصد لے کر آپ کے دولت خانے پر حاضر ہوا ہوں۔ یقین کریں میں پاکستانی جاسوس نہیں ہوں۔ میں مسلمان ہوں اور آپ کے بڑے بھائی میرے والد صاحب کے دوست تھے۔ میں ان کا ایک خاص پیغام لے کر آیا ہوں۔ اس وقت مجھے پولیس سے بچالیں باقی باتیں میں آپ کو بعد میں بتا دوں گا"

سید صاحب بڑے دلیر انسان تھے۔ کوٹھڑی کے کونے میں لکڑی کا ایک کافی بڑا صندوق پڑا تھا۔ انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔"

"اس صندوق میں چھپ جاؤ۔ جلدی کرو"

میں نے صندوق کھولا۔ صندوق میں سبز رنگ کی کچھ چادریں تہہ کرکے رکھی ہوئی تھیں۔ میں اس میں ٹانگیں سینے کے ساتھ لگا کر لیٹ گیا۔ سید صاحب نے صندوق بند کرکے تالا لگا دیا۔ مجھے ایسی آواز آئی جیسے انہوں نے صندوق کے اوپر کوئی ٹوکرا رکھ دیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی سید صاحب بلند آواز میں بولتے کوٹھڑی سے باہر نکل گئے۔

یہاں پاکستانی جاسوس کا کیا کام۔ یہ فقیروں کا ڈیرا ہے"

سید صاحب کی آواز ذرا دور ہی گئی تھی کہ مجھے اندازہ ہوا کہ تھانیدار سپاہیوں کے ساتھ مزار کے اندر آچکا تھا۔ وہ کوٹھڑی کے باہر کھڑا سید صاحب سے پوچھنے لگا۔

"شاہ جی! ہمارے مخبر نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ ایک پاکستانی مزار میں آیا ہے جو دلی سے چلا تھا۔ اس کے پاس صرف دلی کا ویزا ہے مگر وہ امرتسر پہنچ گیا ہے۔

ہمیں مزار کی تلاشی لینی ہو گی"

سید صاحب نے فرمایا۔

"شرما جی! آپ بے شک تلاشی لے لیں مگر یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ ہم بھارتی حکومت کے وفادار ہیں۔ اگر کوئی پاکستانی جاسوس یہاں آتا تو سب سے پہلے ہم آپ کو اس کی اطلاع کرتے۔ بلکہ اسے پکڑ کر باندھ لیتے۔ آپ ضرور تلاشی لیں آیئے"

صندوق کے اندر میرے تو پسینے چھوٹ گئے۔ ایک تو اندر حبس تھا اس کی وجہ سے دوسرے اس خوف سے کہ اگر ہندو تھانیدار نے صندوق کھلوا لیا تو میں بھی مارا گیا اور میرے ساتھ سید صاحب پر بھی آفت نازل ہو جائے گی۔ مگر سید صاحب نے بھارتی حکومت اور انڈیا کے ساتھ اپنی وفاداری کی باتیں کچھ ایسے انداز میں کیں کہ ہندو تھانیدار کو زیادہ غور کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ تھانیدار کی آواز آئی۔

"شاہ جی! ہمیں آپ کی وفاداری پر ذرا بھی شک وشبہ نہیں ہے۔ مگر ہم بھی اپنی نوکری سے مجبور ہیں۔ ہمارے مخبر نے بتایا ہے کہ اس نے پاکستانی جاسوس کو جو نوجوان لڑکا ہے مزار کی طرف جاتے دیکھا ہے۔"

سید صاحب نے فوراً تھانیدار کی بات کاٹی۔

"حضور والا! اگر پاکستانی جاسوس یہاں آتا تو وہ ہماری نظروں سے بچ کر نہیں جا سکتا تھا۔ ہم تو اسی وقت اسے پکڑ کر بٹھا لیتے۔ ہو سکتا ہے کوئی ایسا نوجوان ادھر سے گزرا ہو۔ آپ خود ملاحظہ فرمالیں۔ ہاں وہی لوگ ہیں جو روز یہاں پر موجود ہوتے ہیں"

ہندو تھانیدار نے اپنے کسی سپاہی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"اوئے بھاگ سنگھ یہاں سے! پوڑیوں والے پل کی ناکہ بندی کی تھی کہ نہیں؟ ہو سکتا ہے وہ ادھر سے نکل گیا ہو"

بھاگ سنگھ شاید کوئی کانسٹیبل تھا۔ اس نے فوراً کہا۔

"ہاں جی! ادھر دو کانسٹیبل لگا دیئے ہوئے ہیں۔"

"تو پھر چلو۔ وہ ادھر ہی گیا ہوگا۔ یہاں وہ نہیں ہے۔ اچھا شاہ جی آپ کو تکلیف دی۔ ایک بات ہے۔ اگر کوئی اجنبی چہرہ آپ کو یہاں نظر آجائے تو اسے کسی طریقے سے یہیں روک لیں اور ہمیں تھانے میں اطلاع کر دیں"

سید صاحب نے جواب میں کہا۔

"حضور والا! آپ فکر ہی نہ کریں کسی پاکستانی جاسوس کی کیا مجال کہ مزار پر آئے اور پھر بچ کر نکل جائے۔"

یہ لوگ باتیں کرتے کوٹھڑی سے باہر نکل گئے۔ میری جان میں جان آگئی۔ بند صندوق کے اندر مجھے سانس لینے میں دشواری پیش آرہی تھی اور میرا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا تھا۔ بند صندوق میں کہیں کہیں جو تھوڑی بہت درزیں تھیں بس ان میں سے تھوڑی بہت تازہ ہوا اندر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سبز رنگ کی چادروں میں سے جو دیسی عطر کی تیز خوشبو آرہی تھی اس نے بھی میرا ناک میں دم کر دیا تھا۔ مجھے زبردست گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔

اس طرح دو تین منٹ مزید گزر گئے۔ پھر کسی کے قدموں کی آواز آئی صندوق کے اوپر سے ٹوکرا ہٹا دیا گیا۔ صندوق کا تالا کھلا اور ڈھکن اوپر اٹھ گیا۔

مجھے باہر کی تازہ ہوا لگی تو نیم مردہ جسم میں جیسے جان پڑ گئی۔ جلدی سے صندوق سے نکل آیا۔ سید صاحب کوٹھڑی کے دروازے کے آگے اس طرح کھڑے تھے کہ باہر سے کسی کی نظر اندر نہیں پڑ سکتی تھی۔ انہوں نے پلٹ کر باہر دیکھا اور پھر دروازہ بند کر دیا۔

بھائی تم نے تو ہمیں مروا دیا تھا۔ پہلے کیوں نہیں بتایا کہ تم پاکستان سے یہاں جاسوسی کرنے آئے ہو"

میں نے سانس درست کرتے ہوئے کہا۔

"شاہ جی! میں جاسوس نہیں ہوں"

سید صاحب نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"میاں آہستہ بولو۔ تھانیدار اپنا کوئی نہ کوئی آدمی سفید کپڑوں میں یہاں ضرور چھوڑ گیا ہوگا"

میں نے کہا۔

"براہ کرم مجھے آج کی رات کسی طرح اپنے پاس چھپا لیں۔ میں جو کوئی بھی ہوں صبح ہوتے ہی یہاں سے چلا جاؤں گا"

سید صاحب دری پر بیٹھ گئے تھے۔ میں بھی ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ انہوں نے ایک دوبار گہرا سانس لیا چھت کی طرف منہ اٹھا کر یا اللہ خیر! اسلام کی خیر! پاکستان کی خیر کہا اور صندوق کی طرف اٹھ کر گئے۔ صندوق میں سے سبز رنگ کی چادر نکال کر میری طرف پھینکی اور کہا۔

"اسے اس طرح اوڑھ لو کہ تمہاری پتلون وغیرہ بالکل دکھائی نہ دے۔"

پھر انہوں نے تکیے کے پیچھے سے سبز رنگ کی کپڑے کی ٹوپی نکال کر مجھے دی۔ ٹوپی پر گوٹہ لگا ہوا تھا۔ کہنے لگے۔

"اسے سر پر پہن لو"

یہ ٹوپی ایسی تھی جو مزاروں میں جو مرید اور بالکے ہوتے ہیں وہ پہنتے ہیں۔ میں نے ٹوپی سر پر کھینچ کر اس طرح پہن لی کہ میرے کان بھی اس میں چھپ گئے۔ سید صاحب نے میرا جائزہ لیا اور اٹھتے ہوئے فرمایا۔

جب تک میں نہ آؤں یہیں کونے میں چھپ کر بیٹھے رہو۔"

وہ کوٹھڑی سے باہر چلے گئے۔ انہوں نے دروازہ بند کر کے کوٹھڑی پر تالا ڈال دیا۔ میں کونے میں بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور الحمد شریف پڑھ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے لگا کہ اس نے مجھے بچا لیا۔ ورنہ میرا بچنا مشکل تھا۔ جب مجھے بند کوٹھڑی کے اندر بیٹھے بیٹھے کافی دیر گزر گئی تو اچانک باہر سے کسی ملنگ کے دھمال ڈالنے کی آواز سنائی دی۔ یہ

آواز کوٹھڑی کے باہر سنائی دے رہی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ کوئی ملنگ کوٹھڑی کے باہر دھمال ڈال رہا ہے۔ پھر یہ آواز رک گئی۔ اب کوٹھڑی کا تالا کھلنے کی آواز آئی۔ دروازہ کھلا اور کوٹھڑی میں جلتے بلب کی روشنی میں ایک سبز پوش ملنگ اندر آیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اٹھایا اور کہا۔

"میرے ساتھ دھمال ڈالتے باہر آجاؤ۔ جب تک میں نہ کہوں دھمال ڈالتے رہنا۔"

وہ مجھے کھینچ کر باہر لے گیا۔ اور دھمال ڈالنے لگا۔ میں نے بھی اس کے ساتھ دھمال ڈالنی شروع کردی۔ مزار پر اس وقت دو تین درویش قسم کے لوگ ادھر ادھر بیٹھے تھے۔ ان کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ملنگ دھمال ڈالتا مجھے مزار کے پچھلے دروازے سے نکال کر مزار کے عقب میں لے گیا جہاں کچھ قبریں تھیں۔ ان کے پیچھے درخت تھے اور درختوں کے پیچھے دو چار کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس نے مجھے ایک کوٹھڑی میں دھکیل دیا اور کہا۔

"یہاں سے باہر مت نکلنا"

یہ کوٹھڑی شاہ جی والی کوٹھڑی کے مقابلے میں تنگ اور خالی خالی تھی۔ چھت کے ساتھ ایک دھیمی روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ فرش پر صرف صف بچھی تھی اور کچھ نہیں تھا۔ میں صف پر بیٹھ گیا۔ قلندروں والی سبز ٹوپی اتار کر میں نے پرے رکھ دی۔ شاہ صاحب نے مجھے مزار سے اس کوٹھڑی تک پہنچانے کا بڑا کامیاب طریقہ نکالا تھا۔ پولیس اگر مزار سے جاتے ہوئے پیچھے اپنا کوئی خفیہ آدمی چھوڑ بھی گئی ہوگی یا ان ملنگوں میں پولیس کا کوئی جاسوس ہوگا تو اسے مجھ پر شک نہیں پڑ سکتا تھا کیونکہ میں جس شکل صورت میں شاہ جی کی کوٹھڑی میں داخل ہوا تھا وہاں سے نکلتے وقت میرا حلیہ بالکل بدلا ہوا تھا۔

میں اپنی زندگی کے حیرت انگیز اور سچے واقعات بیان کر رہا ہوں۔ یہاں میں ایک بات کی شروع میں ہی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ بھی اسے نوٹ کرلیں۔ بات یہ ہے کہ میں اپنی زندگی کے واقعات بیان کرتے ہوئے اکثر لوگوں کے اصلی نام نہیں

لکھوں گا۔ شہروں کے نام اور محل وقوع بھی درست اور صحیح ہوگا مگر نام اور لوگوں کے حلیے میں نے بدل دیئے ہوں گے۔ کیونکہ بھارت ہمارا دشمن ملک ہے اور مقبوضہ کشمیر ابھی آزاد نہیں ہوا۔ کشمیری حریت پرستوں کی قربانیاں اور جدوجہد جاری ہے۔ لوگوں کے صحیح نام اور حلیے اور بعض جگہوں کے حقیقی نام لکھنے سے جہاد آزادی کشمیر کی تحریک کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ مثال کے طور پر امرتسر میں سید فتح علی شاہ بخاری" کا مزار موجود ہے۔ مگر ان کے متولی شاہ جی اور ان کے فرزند سید صاحب کا نام میں نے بدل دیا ہے۔ سید صاحب سے میری ملاقات بھی امرتسر میں کسی دوسری جگہ پر ہوئی تھی۔ مگر میں اس جگہ کا نام نہیں لکھ سکتا۔ لیکن جو واقعات میں بیان کروں گا وہ بالکل سچے ہیں۔ اس وضاحت کے بعد میں واپس مزار کی اس کوٹھڑی میں آتا ہوں جہاں ایک درویش نے مجھے چھپا دیا تھا۔

کوٹھڑی میں بیٹھے مجھے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔ کوئی اندازہ نہیں تھا کہ رات کتنی گزر چکی ہے۔ باہر مزار پر بھی خاموشی چھا گئی تھی۔ آخر مجھے باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ جو درویش مجھے کوٹھڑی میں بند کر گیا تھا اس نے دروازے پر باہر سے تالا لگا دیا تھا۔ قدموں کی چاپ کوٹھڑی کے پاس آکر رک گئی۔ پھر تالہ کھلنے کی آواز آئی۔ دروازہ کھلا اور سید صاحب اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے دروازہ بند کر دیا اور میرے پاس صف پر بیٹھ گئے اور مجھ سے پوچھا۔

"اب مجھے بتاؤ تم کس مقصد کو لیکر بھارت میں آئے ہو اور تم نے اپنی جان خطرے میں کیوں ڈالی ہے"

میں جس مقصد کو لے کر اپنے دشمن ملک بھارت میں داخل ہوا تھا اور جس کی خاطر میں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈالا تھا وہ میری زندگی کا مشن تھا۔ اس مشن کو بیان کرنے کے لئے مجھے واپس اگست 1947ء کے اس خون میں ڈوبے ہوئے دن کی طرف لوٹ کر جانا ہوگا جب میرا باپ مجھے اور میری چھوٹی بہن کو لیکر اپنے گاؤں سے نکلا تھا۔ گاؤں پر سکھوں نے حملہ کر دیا تھا۔ یہ حملہ گاؤں کے مسلمانوں پر تھا۔ سکھوں نے ہندوؤں کے

ساتھ مل کر مسلمانوں کو بے دریغ قتل کرنا شروع کردیا۔ گاؤں میں ایک شور مچ گیا۔ دیکھ
دیکھتے مسلمانوں کے مکان جلنے لگے۔ ہمارا باپ مجھے اور میری چھوٹی بہن کو لے کر مکا
کے صحن کی پچھلی دیوار والے دروازے سے باہر کو بھاگا۔ میری عمر اس وقت آٹھ نو سا
کی ہوگئی۔ میری بہن مجھ سے ایک ڈیڑھ دو سال چھوٹی تھی۔ ہم دونوں بہن بھائی رو
لگے تھے۔ ہمارے باپ نے ہم دونوں کو بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا اور ہمیں بھی اپنے سا
دوڑا رہا تھا۔ آگے اونچی فصل والے کھیت آگئے۔ وہ ہمیں لے کر فصل میں گھس گ
اس نے ہمیں وہیں چھپا دیا اور خود بھی ہمارے پاس چھپ کر بیٹھ گیا۔ ہم نے رونا بند کر
تھا۔ ہم پر دہشت طاری تھی۔ ہمارے باپ کا رنگ بھی اڑا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹ خش
تھے اور وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہمیں آہستہ سے کہتا۔

"اللہ کرم کرے گا۔ اللہ کرم کرے گا۔ آواز نہ نکالنا"

گاؤں کی طرف سے ہمیں عورتوں بچوں کے چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ سکھ
کے ست سری اکال کے نعرے بھی سنائی دے رہے تھے۔ میں ان نعروں سے واقف تھا
سکھوں نے مجھے جب دوسرے گاؤں سے آتے تھے تو ہمارے گاؤں کے گردوارے
رات جاتے ہوئے یہی نعرے لگایا کرتے تھے۔ فصل چاولوں کی تھی اور زیادہ اونچی نہ
تھی۔ باپ نے ہمیں اپنے ہاتھ فصل میں لٹا رکھا تھا۔ کچھ سکھوں کی آوازیں سنائی دیں
کھیتوں کی طرف آرہے تھے۔

ہمارے باپ نے ہم دونوں کو اپنے ساتھ لگالیا۔ مجھے میرے باپ کے دل کی تیز
دھڑکن صرف سنائی دے رہی تھی۔ سکھ آپس میں باتیں کرتے ہمارے قریب سے گ
گئے۔ ایک سکھ نے کہا۔

"فصل کو آگ لگا دو۔ اندر کوئی مسلا نہ چھپا ہوا ہو"

دوسرے نے کہا۔ "سارے مسلے وڈ چھڈے نے۔ ایتھے کنے آناں سی۔۔۔۔"

پھر ایک عورت کی چیخ اور منتیں کرنے کی آواز آئی۔ وہ کوئی مسلمان عورت
جس کو سکھ اغوا کرکے لے جارہے تھے۔ اور جو ان کو خدا اور سکھوں کے کسی گورو صا

کا واسطہ دے کہہ رہی تھی کہ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے چھوڑ دو۔ عورت کی بلکتی ہوئی آوازیں
دور ہوتے ہوتے غائب ہوگئیں۔ ہم اپنے باپ کے ساتھ کھیت کے کیچڑ میں جانے کتنی دیر
تک چھپے رہے پھر چاروں طرف خاموشی چھاگئی۔ میرے باپ نے سہمی ہوئی آواز میں
ہمیں کہا۔

"ابھی لیٹے رہنا"

پھر اس نے آہستہ سے فصل میں سے سر باہر نکال کر دیکھا۔ وہ کچھ دیر تک دھان
کے خوشوں میں سے سر باہر نکالے دیکھتا رہا۔ پھر سر نیچے کرلیا اور ہمارے پاس منہ لاکر سر
گوشی میں کہا۔

وہ لوگ چلے گئے ہیں۔ اللہ نے ہمیں بچالیا ہے۔ ابھی باہر نہیں نکلنا۔ سمجھے؟
ابھی باہر نہیں نکلنا۔ اللہ کو یاد کرو۔ گھبراؤ مت۔ اللہ نے ہمیں بچالیا ہے"

میں نے کرتا اور دھوتی پہن رکھی تھی۔ میری بہن نے شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی۔
ہمارے کپڑے کھیت کے کیچڑ میں لت پت ہوگئے تھے۔ آہستہ آہستہ دن کی روشنی دھندلی
ہونے لگی۔ جب سورج غروب ہوگیا اور اندھیرا سا چھاگیا تو ہمارا باپ ہم دونوں کو لے کر
کھیتوں میں سے نکلا اور چھوٹی نہر والے پل کی طرف چل دیا۔ میں نے مڑ کر اپنے گاؤں
مجیٹھ کی طرف دیکھا۔ یہ ہمارا گاؤں بھی تھا اور قصبہ بھی تھا۔ کئی مکان جل رہے تھے۔
میرے باپ نے میرا سر سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

"پیچھے مت دیکھو"

نہر کے پل سے پہلے ٹاہلیوں کے بے شمار درخت آتے تھے۔ یہاں ہم گولیاں اور گلی
ڈنڈا کھیلا کرتے تھے۔ نہر کے پل پر سے گزرنے سے پہلے ہمارے باپ نے ہمیں درختوں
کے پاس بٹھا دیا اور کہا۔

"یہاں سے ہلنا مت۔ میں آگے دیکھ کر آتا ہوں"

ہم دنوں بہن بھائی سہم کر وہیں بیٹھ گئے۔ ہم پر اس قدر دہشت چھائی ہوئی تھی کہ
ہم آپس میں ایک دوسرے سے کوئی بات بھی نہیں کر رہے تھے۔ شام کے گھرے ہوتے

اندھیرے ہی ہم نے اپنے باپ کو دیکھا کہ وہ جھک جھک کر چلتا چھوٹی نہر کے پل کے پار گیا۔ ایک طرف بیٹھ گیا۔ پھر وہاں سے اٹھا اور دوڑ کر ہمارے پاس واپس آیا۔ ہمیں بازوؤں سے پکڑا اور اپنے ساتھ دوڑاتا نہر کے پل پر سے گزر کر دوسری طرف کھیتوں میں گھس گیا۔ کھیتوں کے درمیان چلنے کے لئے چھوٹی سی پگ ڈنڈی بنی ہوئی تھی جسے پنجابی میں وٹ کہتے ہیں۔

ہم وٹ پر چلتے چلے گئے۔ شام کو اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ ہمارے باپ کو پتہ تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ وہ ہمیں کھیتوں میں چلاتا رہا۔ ہم دونوں بہن بھائی ننگے پاؤں تھے۔ ہمارے باپ نے اپنی پرانی جوتی پہنی ہوئی تھی۔ یہ جوتی میں کئی سالوں سے اس کے پاؤں میں دیکھ رہا تھا۔ یہ پنجابی جوتی تھی جو اس زمانے میں گاؤں کے لوگ پہنا کرتے تھے۔ اگر ذرا ٹوٹ جاتی تو وہ اسے مرمت کروا کر پھر پہن لیتا تھا۔ آگے ریلوے لائن آگئی۔ ریلوے لائن شام کے اندھیرے میں ویران ویران تھی۔ یہ ریلوے لائن امرتسر کی طرف جاتی تھی۔ ہمارا باپ ہمیں ریلوے لائن پار کرا کر دوسری طرف لے گیا۔ ادھر ایک کھال تھا جس میں بارش کا پانی جمع رہتا تھا۔ کھال پر پل بنا ہوا تھا۔ ہم پل پر سے گزر کر آگے گئے تو اندھیرے میں درختوں کی دور تک جاتی قطار دھندلی دھندلی سی نظر پڑی۔ ہمارے باپ نے ہمیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"پترو! گھبرانا نہیں۔ اللہ کو یاد کرتے رہو خدا نے چاہا تو ہم پاکستان پہنچ جائیں گے"

مجھے یاد ہے۔ میں نے اپنے باپ سے پوچھا تھا۔ "میاں جی! پاکستان کہاں ہے؟" میرے باپ نے جواب میں کہا تھا۔ "امرتسر سے آگے جہاں لاہور ہے وہاں پاکستان ہے۔" آگے امرودوں کے باغ آگئے۔ یہاں امرود توڑ کر کھایا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ یہ مسجد کچھ دیواروں والی تھی۔ ہمارا باپ ہمیں اس مسجد میں لے آیا۔ مسجد بالکل خالی پڑی تھی۔ مسجد میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جو کھلی تھی یہاں مسجد کے مولوی صاحب رہتے تھے۔ مولوی صاحب وہاں نہیں تھے۔ ان کا سامان مسجد کے

صحن میں بکھرا پڑا تھا۔ برسات کا موسم ہونے کی وجہ سے شام حبس آلود تھی۔ پہلے ہمارا باپ ہمیں مولوی صاحب کی کوٹھری میں لے گیا۔ مگر وہاں سخت گرمی اور حبس تھا۔ پھر وہ ہمیں مسجد کی چھت پر لے آیا۔ یہاں اتنا حبس نہیں تھا۔ ہم نے نیچے باری باری آکر وضو کرنے والی ٹوٹیوں کے ساتھ منہ لگا کر پانی پیا۔ باپ نے ہمیں اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔ اس نے میری بہن اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"پترو! گھبرانا نہیں۔ ہم اللہ کے گھر میں ہیں۔ سکھ ہندو نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان اپنا ملک پاکستان بنائیں۔ اس لئے انہوں نے مسلمانوں کو قتل کرنا اور ان کے گھروں کو آگ لگانی شروع کر دی ہے۔ ہمیں بھوک لگی ہوگی۔ مگر یہاں کھانے کے لئے کچھ نہیں ملے گا۔ صبر شکر کر کے رات گزار دو صبح اللہ مالک ہے۔"

ہم نے ساری رات مسجد کی چھت پر کبھی جاگ کر کبھی سو کر گزار دی۔ صبح ہونے سے پہلے جب پو پھٹ رہی تھی تو ہمارا باپ ہمیں لے کر مسجد سے نکل آیا۔ اب ہم کھیتوں کی آڑ لیتے درختوں کی ان قطاروں کی طرف چلنے لگے جو شام کو ہمیں دور نظر آتی تھیں۔ ان درختوں کے درمیان سے ایک چھوٹی سی پکی سڑک گزرتی تھی۔ یہاں ہمیں مسلمان مہاجرین کا ایک قافلہ مل گیا جو گورداسپور سے پاکستان کی طرف جا رہا تھا۔ ہم بھی اس قافلے میں شامل ہوگئے۔ قافلہ جب امرتسر شہر کے باہر کھیتوں میں پہنچا تو سکھوں کے ایک بہت بڑے جتھے نے حملہ کر دیا۔ قافلے میں ایک کہرام مچ گیا۔ کچھ سکھ گھوڑوں پر سوار تھے۔ باقی دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔ وہ مسلمانوں کو قتل کرنے لگے۔ بچوں کو میری آنکھوں کے سامنے نیزوں پر اچھالا۔ ہمارا باپ ہمیں پکڑ کر کھیتوں کی طرف بھاگا۔ میں اور میری چھوٹی بہن چیخ چیخ کر رونے لگے تھے۔ اچانک سامنے سے ایک سکھ کا گھوڑا دوڑا آیا۔ اس کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ اس نے ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے جھک کر میری چھوٹی بہن پر تلوار کا وار کیا تلوار میری بہن کی گردن پر پڑی اور اس کی گردن

آدھی کٹ کر ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ وہ گر پڑی۔ میرا باپ اس کے اوپر گر پڑا۔ میں
نے پہلی بار اپنے باپ کو روتے ہوئے دیکھا۔ میری بہن کی گردن سے خون کا فوراہ نکل
تھا۔ میں زور زور سے رو رہا تھا۔ میرے باپ نے میری بہن کو کاندھے پر ڈالا۔ میرا بازو
پکڑا اور کھیتوں میں ایک طرف دوڑ پڑا۔ کچھ دور جا کر وہ کسی چیز سے ٹکرا کر گر پڑا۔
میاں جی میاں جی پکارتا روتے ہوئے اپنے باپ کو اٹھانے لگا۔ میری بہن کھیت میں
طرح پڑی تھی کہ اس کی گردن آدھی سے زیادہ کٹ کر ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی
میرا باپ رو رہا تھا۔ میری بہن کا نام لے کر پکار رہا تھا۔ مگر میری بہن مرچکی تھی۔
میں ہمارے پیچھے سکھوں کے نعرے سنائی دیئے۔ میرے باپ نے میری بہن کی لاش
ایک طرف رات ڈالا اور میرا بازو پکڑ کر ایک طرف کو بے تحاشا دوڑ پڑا اور مجھے بھی سا
دوڑانے لگا۔

کھیتوں سے نکل کر ایک کھلی جگہ آگئی جہاں ایک کچا راستہ بنا ہوا تھا۔ یہاں ایک ف
ٹرک سامنے سے آرہا تھا۔ ٹرک ہمیں دیکھ کر ایک فوجی جس کے ہاتھ میں رائفل
ٹرک میں سے چھلانگ لگا کر اترا اور میرے باپ سے پوچھا۔

"مسلمان ہو؟"

میرے باپ نے کہا۔ "ہاں جی مسلمان ہیں۔ میری بیٹی سکھوں نے شہید کر دی ہے
اور ایک بار پھر میرا باپ رونے لگا۔ اپنے باپ کو روتے دیکھ کر میں بھی رونے لگا
یہ بلوچ رجمنٹ کے جوان تھے۔ انہوں نے ہمیں ٹرک میں بٹھایا اور امرتسر کے ریفو
کیمپ میں لے آئے۔ اس کیمپ میں ہم دو دن رہے۔ میرا باپ میری بہن کو یاد کر
روتا رہتا تھا۔ میں بھی ساتھ رونے لگتا تھا۔ اپنی بہن کی لاش میری آنکھوں کے سا
آجاتی تھی۔ اس کی کٹی ہوئی گردن اور گردن میں سے ابلتا ہوا خون شاید میں ساری ز
فراموش نہ کرسکوں۔

تیسرے دن ہمیں ایک مال گاڑی میں دوسرے مہاجرین کے ساتھ بٹھا دیا یا اور
مال گاڑی نے ہمیں لاہور پاکستان پہنچا دیا۔ پاکستان آکر دو تین دن والٹن کے ریفوجی ک

یہیں پڑے رہے۔ پھر گوجرانولے چلے گئے۔ وہاں میرے والد کے قریبی رشتے دار رہتے
تھے۔ انہوں نے والد صاحب کو ایک دکان الاٹ کروا کر دے دی۔ مجیٹھ قصبے میں میرے
والد صاحب کی پرچون کی دکان تھی جہاں آٹا دال چاول وغیرہ بیچتے تھے۔ گوجرانولے میں یہ
دھندا نہ چل سکا تو والد صاحب لاہور آگئے۔ میری چھوٹی بہن کا غم والد صاحب کو اندر ہی
اندر گھن کی طرح کھانے لگا تھا۔ مگر وہ میری تعلیم سے بھی غافل نہیں تھے۔ وہ خود تو چار
جماعتیں پڑھے ہوئے تھے۔ قصبے میں اسلامی تاریخی ناول بڑے شوق سے پڑھا کرتے
تھے۔ کوئی لفظ سمجھ میں نہ آتا تو مجھ سے پوچھ لیا کرتے تھے۔ محمود غزنوی ان کا پسندیدہ
ہیرو تھا۔ ہم نے باغبان پورے میں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا۔ والد صاحب نے
یہاں پرچون کی ایک چھوٹی سی دکان کھول لی۔ مجھے سکول میں داخل کرا دیا۔ وہ مجھے مسجد
میں قرآن شریف پڑھنے کے لئے بھی بھیجتے تھے۔ میں نے قران پاک حفظ تو نہیں کیا مگر
پورا ترجمے کے ساتھ پڑھ لیا۔ قرآن پاک نے میرے اندر اسلام اور پاکستان کے لئے
گہری محبت کا جذبہ پیدا کر دیا۔ والد صاحب سردیوں کی رات کو مجھے اپنی چارپائی پر پاس
بیٹھا کر محمود غزنوی اور محمد بن قاسم کے کارنامے کتاب میں سے پڑھ کر سناتے ذرا ہوش
سنبھالا تو میں نے بھی ان کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ کبھی کبھی رات کو میں سو رہا ہوتا تو
والد صاحب کے ہچکیاں بھر کر رونے کی آواز سے میری جاگ کھل جاتی۔ وہ میری چھوٹی
بہن کو یاد کر کے روتے رہتے تھے۔

دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد میں کالج میں داخل ہوگیا۔ والد صاحب کو بیٹی کے
غم نے وقت سے پہلے بوڑھا اور کمزور کر دیا تھا۔ میں ان کی بڑی دلجوئی کرتا مگر بیٹی کے قتل
کا منظر نہ وہ بھولتے تھے نہ میں ہی بھول سکا تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ میں زیادہ تفصیل میں
نہیں جاؤں گا۔ میں نے بی۔ اے پاس کرلیا اور ایک کارخانے میں مجھے کلرک کی نوکری
مل گئی۔ اس زمانے میں مجاہدین کشمیر کی تحریک اپنے عروج پر تھی۔ بھارت نے کشمیر میں
کشمیریوں کی مرضی کے خلاف اپنی فوجیں بھیج کر وہاں قبضہ کرلیا تھا۔ بھارتی فوج بھارتی
حکومت کے اشارے پر کشمیریوں پر طرح طرح کے ظلم و ستم توڑ رہی تھی۔ کشمیری مجاہدین

پر بے پناہ تشدد کیا جارہا تھا۔ عورتوں کو اغوا کیا جاتا۔ حریت پرست کشمیریوں کو گولیوں کا نشانہ بنا کر انہیں شہید کیا جارہا تھا۔ والد صاحب یہ سب کچھ اخباروں میں پڑھتے تو ان کا چہرہ شعلے کی طرح تمتمانے لگتا۔ وہ بہت کمزور ہوگئے تھے۔ مگر مسلمان کشمیری مجاہدین پر انڈین فوجیوں کے ظلم وستم کی خبریں پڑھ کر وہ سینے پر ہاتھ مار کر کہتے۔

"مرنے سے پہلے میں جہاد کشمیر میں ضرور حصہ لوں گا اے خدا مجھے اتنی طاقت عطا فرما کہ میں مقبوضہ کشمیر میں جاکر مجاہدوں کے شانہ بشانہ کافروں کے خلاف جہاد کروں"

ایک رات وہ دکان بند کرکے گھر آئے تو ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں نے کہا۔ "میاں جی! میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں"

والد صاحب نے مجھے بازو سے پکڑ کر بٹھادیا اور کمزور آواز میں کہا۔

"اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

سردیوں کی رات تھی۔ گھر میں نوکرانی ہوتی تھی جو گھر کی صفائی وغیرہ کے علاوہ کھانا بھی تیار کردیتی تھی۔ والد صاحب چارپائی پر لحاف اوپر کرکے لیٹ گئے۔ میں ان کے لئے چاول تھالی میں ڈال کر لایا تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے چاول واپس لے جانے کو کہا۔ میں دوسری چارپائی پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد مجھے نیند آگئی اور میں سوگیا۔ آدھی رات گزر چکی تھی کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ والد صاحب مجھے آواز دے رہے تھے۔ میں جلدی سے اٹھ کر ان کے پاس چلا گیا۔ ان کا کمزور چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے بدن میں خون بالکل نہیں ہے۔ میں گھبرا سا گیا۔ والد صاحب نے آہستہ سے کہا۔

"میں کلثوم کو نہ بچاسکا۔ مجھے اس کا بڑا غم ہے"

میں نے ان کا کمزور ٹھنڈا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

"میاں جی! اللہ کو یہی منظور تھا۔ آپ غم نہ کیا کریں"

والد صاحب نے جیسے میری بات بالکل نہیں سنی تھی۔ انہوں نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھڑا کر میرا بازو پکڑ لیا۔ ان کے ہاتھ کی گرفت حیرت انگیز طور پر بڑی سخت تھی۔ انہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"ایک دن تمہیں بھی مرنا ہے۔ مگر میری طرح بستر پر لیٹے لیٹے مت مرنا۔ کشمیر کے جہاد میں کافروں سے لڑتے لڑتے شہید ہونا۔ مجھے دفن کرکے بعد امرتسر جانا۔"

والد صاحب نے فتح شاہ بخاریؒ کے مزار کے متولی کا نام لے کر مجھے ہدایت کی میں مزار کے شاہ جی سے جاکر ملوں۔ وہ مجھے جہاد کشمیر کے میدان جنگ میں پہنچادے گا۔ والد صاحب نے میرے بازو کو اپنی گرفت میں مزید مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

"جب مقبوضہ کشمیر آزاد ہو جائے تو میری قبر پر آکر مجھے یہ خبر ضرور سنانا۔ مجھ سے وعدہ کرو"

میں نے کہا۔ "میاں جی! میں وعدہ کرتا ہوں"

والد صاحب کے چہرے پر ایک چمک سی آگئی۔ انہوں نے میرا بازو چھوڑ دیا۔ اور آہستہ آہستہ بولے۔

"جس کھیت میں میں اپنی بیٹی کی لاش چھوڑ آیا تھا۔ وہاں جاکر فاتحہ پڑھنا۔ اور اونچی آواز میں کہنا کہ کلثوم اپنے باپ کو معاف کردینا وہ تجھے دشمنوں کی زمین پر بے گور وکفن چھوڑ آیا۔ وعدہ کرو۔ وعدہ کرو۔۔۔۔"

میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے میاں جی کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں میاں جی۔ وعدہ کرتا ہوں"

اس کے ساتھ ہی میاں کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ والد صاحب سے کئے ہوئے دونوں وعدے میرے سینے پر لکھے تھے۔ ان دونوں وعدوں کو پورا کرنا میری زندگی کا

مشن بن گیا تھا۔ یہی وہ مشن تھا جس کو لے کر میں بھارت میں داخل ہوا تھا۔ چھوٹی بہن پاکستان کے نام پر اسلام کے نام پر شہید ہوئی تھی وہاں فاتحہ پڑھ کر اس کی روح کو ثواب پہنچانا۔ میاں جی کا پیغام اس کی روح کو پہنچانا اور اپنی زندگی جہاد کشمیر کے لئے وقف کر دینا۔

یہ ساری باتیں یہاں تو میں نے پوری تفصیل سے لکھی ہیں۔ لیکن اس رات فتح شاہ بخاری کے مزار کی کوٹھڑی میں سید صاحب کے چھوٹے بھائی کو میں نے مختصراً بیان کیں اور اس شخص کا نام لیا جس کے پاس میرے والد صاحب نے کہا تھا مزار کا متولی بڑے شاہ جی مجھے پہنچا دیں گے۔ یہ کوئی خاص مجاہد تھا۔ میں اس کا اصلی نام یہاں نہیں لکھوں گا۔ آپ جو چاہے اس کا نام رکھ لیں۔ چلیں کمال شاہ نام رکھ لیں۔ سید صاحب میری ساری باتیں سن کر سوچ میں پڑ گئے۔ پھر سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور کہا۔

"میرے عزیز! تم بڑا نیک مقصد لے کر پاکستان سے آئے ہو۔ جن صاحب کا تم نے نام لیا ہے۔ میں انہیں جانتا ہوں۔ وہ کبھی کبھی رات کے وقت پولیس والوں کی نظروں سے چھپ کر میرے بڑے بھائی صاحب کو ملنے یہاں آیا کرتے تھے۔"

میں نے کہا۔ "بس آپ کسی طرح مجھے ان کے پاس پہنچا دیں۔"

سید صاحب کہنے لگے۔

"ان کے بارے میں میں صرف اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ ہردہ ضلع ہوشنگ آباد مدھیہ پردیش سے آیا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں میرے بڑے بھائی صاحب نے بتایا تھا کہ وہ زبردست مجاہد اور تربیت یافتہ کمانڈو ہیں۔ بھارتی فوج کی کمانڈو فورس میں ہوا کرتے تھے۔ وہاں سے ریلیز ہونے کے بعد اب ہردہ ضلع ہوشنگ آباد کے کسی قریبی جنگل میں رہتے ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں۔ اس بارے میں بڑے شاہ صاحب نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔"

اب یہ بات میری سمجھ میں آنے لگی تھی کہ والد صاحب مجھے اس مجاہد اور تربیت یافتہ کمانڈو کے پاس کیوں بھجوا رہے تھے۔ جہاد کشمیر میں شریک ہو کر شہید ہونا کوئی مشکل

نہیں ہے۔ آپ فائرنگ کرتے ہوئے بھارتی فوج کی کسی پوسٹ کے سامنے آکر کھڑے ہو جائیں۔ آپ کی فائرنگ سے کوئی دشمن مرے یا نہ مرے، دشمن کی گولی آپ کو آکر لگے گی اور آپ اسی وقت شہید ہو جائیں گے۔ آپ کی شہادت میں کسی کو ذرا سا بھی شک نہیں ہوگا۔ لیکن اس شہادت کا آزادی کشمیر کی تحریک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ وہ شہادت تحریک کے لئے بے حد مفید ہوتی ہے جو دشمن کو کسی فوجی آپریشن کے بعد زبردست اور دور رس نقصان پہنچانے کے بعد حاصل کی جائے۔ دشمن کو ایسا نقصان میں کمانڈو بن کر ہی پہنچا سکتا تھا اور اگر خدا نے میری قسمت میں شہادت کی سعادت لکھی ہوئی ہے تو میں یہ شہادت کمانڈو آپریشن کے ساتھ دشمن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کے بعد ہی حاصل کر سکتا تھا۔ والد صاحب یہی چاہتے تھے کہ میں جہاد کشمیر میں شامل ہونے سے پہلے کمانڈو کی پوری تربیت حاصل کروں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے کمال شاہ صاحب کو منتخب کیا تھا جو مجھے مزار کے متولی سید صاحب کے توسط سے ہی مل سکتے تھے۔ اب جب چھوٹے سید صاحب نے مجھے بتایا کہ کمانڈو کمال شاہ بھارت کے صوبہ مدھیہ پردیش کے ہردہ ضلع میں کسی جنگل میں رہتے ہیں تو صورت حال میرے لئے مزید پیچیدہ ہو گئی تھی۔ میں نے سوائے امرتسر مجیٹھ کے علاقے کے ہندوستان کا اور کوئی علاقہ دیکھا ہی نہیں تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ مدھیہ پردیش کس بلا کا نام ہے اور ہردہ نام کا جنگل کہاں پر ہے۔ مگر میں نے کمانڈو کمال شاہ صاحب کے پاس جانے کا دل میں فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ میرے والد صاحب کی آخری خواہش بھی تھی اور میں بھی کمانڈو بن کر کافروں سے اپنی چھوٹی بہن کے خون کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ اور اب تو ہر وہ لڑکی جو مقبوضہ کشمیر میں کافروں کے ظلم و تشدد سے شہید ہوتی تھی وہ مجھے اپنی بہن کلثوم ہی لگنے لگتی تھی۔ میں نے سید صاحب سے کہا۔

"میں کمال شاہ صاحب کے پاس جانا چاہتا ہوں مجھے بتائیے کہ میں ان کے پاس کیسے پہنچ سکتا ہوں۔"

سید صاحب نے باہر کوئی آہٹ محسوس کی ہوگی۔ انہوں نے مجھے چپ ہو جانے کا

اشارہ کیا اور جلدی سے اٹھ کر دروازے کے پاس گئے اور کسی سوراخ میں سے باہر د
لگے۔ پھر پیچھے ہٹے اور مجھے کہا۔

"برخوردار! اس وقت رات کافی گزر چکی ہے تم یہیں سو جاؤ۔ صبح میں خود
تمہارے پاس آؤں گا۔ تم میرے آنے سے پہلے باہر نہ نکلنا"

سید صاحب چلے گئے۔ بند کوٹھڑی میں حبس اور گرمی ضرور تھی۔ یہاں پنکھا
نہیں تھا۔ مگر چونکہ ابھی گرمی کا موسم باقاعدہ شروع نہیں ہوا تھا اس لئے کوٹھڑی
تھوڑے سے حبس اور گرمی نے مجھے زیادہ دیر تک تنگ نہ کیا اور مجھے نیند آ گئی۔

صبح مجھے سید صاحب نے ہی آکر جگایا۔ میرا لباس بس ابھی تک سوائے سبز ٹوپی
ملنگوں والا ہی تھا۔ وہ اپنے ساتھ میرے اتارے ہوئے کپڑے یعنی جینز پتلون جیکٹ
جوگر شوز بھی لائے تھے۔ انہوں نے میرے کپڑے ایک طرف رکھ دیئے اور کہا۔

"میرے ساتھ آجاؤ۔ ہم ناشتے پر باتیں کریں گے۔"

میں کوٹھڑی سے نکل کر کھلی فضا میں آیا تو بڑا اچھا لگا۔ دن کافی نکل چکا تھا۔
صاحب مجھے ایک دوسری کوٹھڑی میں لے آئے جس کا فرش پکا اور چھت بھی اونچی ت
اندر ایک پلنگ بچھا تھا دو تین کرسیاں اور چھوٹی تپائی بھی تھی۔ یہاں میں نے ان کے سا
حلوے پوڑی کا ناشتہ کیا۔ ناشتے پر وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت زار کی باتیں کر
رہے۔ کہنے لگے۔

"یہاں وہ بات نہیں ہے جو انگریزوں کے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ انگریزوں
کے زمانے میں تو ہم مسلمان ہندوؤں کے ساتھ برابر کی حیثیت سے رہتے
تھے۔ مگر اب یہاں ہندوؤں کے غلام ہیں۔ ہم چاہے کچھ کرلیں بھارت کی
حکومت ہمیں ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھے گی۔ وہ ہندوستان کے ہر مسلمان کو
پاکستان کا جاسوس سمجھتی ہے۔ تم پاکستان کے مسلمان ہر لحاظ سے خوش نصیب
ہو۔ تم ایک آزاد ملک میں رہتے ہو۔ تمہاری اپنی حکومت ہے خواہ کیسی بھی
حکومت ہے مگر تمہاری اپنی حکومت ہے۔ تم اسلام کے راستے پر چل کر زندگی

بسر کر سکتے ہو۔ یہاں مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ اعلیٰ سرکاری عہدے
صرف ہندوؤں کے لئے وقف ہیں۔ مسلمان لڑکا چاہے کتنا ہی لائق کیوں نہ ہو
اسے کوئی نہیں پوچھتا۔ نوکری دی بھی جاتی تو گھٹیا درجے کی نوکری دی جاتی
ہے ہم بھارت کے مسلمان تو ہمیشہ پاکستان کی خیر سگالی کی دعائیں مانگتے رہتے
ہیں۔ پاکستان کی وجہ سے تھوڑی بہت ہماری بھی یہاں عزت بن جاتی ہے۔"

ناشتے کے بعد سید صاحب کہنے لگے۔

"میں نے چائے کے لئے کہہ دیا ہے۔ چائے پر اصلی باتیں کریں گئے"

میں نے ان سے پولیس کے بارے میں پوچھا کہ باہر اب کوئی خطرہ تو نہیں ہے۔ سید
صاحب بولے۔

"میرے عزیز! یہاں کچھ پتہ نہیں کہ باہر جو ملنگ بیٹھے ہیں ان میں سے کوئی
خفیہ پولیس والا ہے۔ ایک ملنگ پر مجھے شک تھا۔ کیونکہ اس کی شکل نئی نئی
تھی۔ وہ چلا گیا ہے۔ اس لئے فی الحال تو کوئی خطرہ نہیں"

میں نے کہا۔ "یہاں کا تھانیدار کیا نام تھا اس کا؟"

"شرما جی"

"ہاں وہ تو آپ کو میرے بعد پریشان نہیں کرے گا"

سید صاحب سر کو ہلکا سا جھٹک کر بولے۔

"ہم چاہے کچھ کرلیں یہ انڈین پولیس والے کبھی کسی مسلمان پر اعتبار نہیں
کرتے۔ وہ ہمیں بھی پاکستان کا جاسوس ہی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ تم نے خود دیکھ
لیا ہے کہ ہمارا پاکستان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن شرما تھانیدار کو کبھی
یقین نہیں آسکتا۔ ہم بھی ان کی زیادہ پروا نہیں کرتے۔ اور پھر کبھی ایسا ہوا
بھی نہیں کہ تمہاری طرح سے کوئی پاکستانی یہاں آئے اور ہمیں اسے چھپانا پڑ
جائے۔ میرے بڑے بھائی یعنی بڑے شاہ صاحب ہوا کرتے تھے تو ان سے ملنے
کبھی کبھار وہی کمانڈو مجاہد صاحب ضلع ہوشنگ آباد کے جنگلوں سے نکل کر آیا

کرتے تھے۔ ان دنوں امرتسر کا ایک سکھ تھانیدار ہوتا تھا۔ ایک بار وہ ان کی بو لیتا یہاں آگیا تھا اور بڑے شاہ صاحب سے اس کی بابت پوچھ گچھ کی تھی مگر بڑے شاہ صاحب نے سکھ تھانیدار کی خوب خبرلی تھی اور اسے یہ کہہ کر مزار سے نکال دیا تھا کہ اگر اب تم یہاں آئے تو میں دلی سیدھا پنڈت نہرو کی بیٹی سے جاکر تمہاری شکائت کروں گا۔ بس اس کے بعد یہاں کوئی پولیس والا نہیں آیا۔"

اتنے میں ایک لڑکا چائے لے کر آگیا۔ چائے کا دور چلنے لگا۔ لڑکا چلا گیا تو سید صاحب کہنے لگے۔

"تمہاری بات اور ہے میاں۔ تم پاکستانی جاسوس نہیں ہو۔ اگر جاسوس ہوتے بھی تو خدا کی قسم ہم تمہیں اپنے سینے سے لگاتے۔ پاکستان کے لئے تو ہماری جان بھی حاضر ہے۔ مگر تم ایک بلند ترین مقصد لے کر یہاں آئے ہو۔ اگر تمہارے پاسپورٹ پر امرتسر کا بھی ویزا لگا ہوتا تو شاید تمہیں اتنی پریشانی نہ اٹھانی پڑتی۔ مگر چونکہ تمہارے پاس دلی کا ہی ویزا تھا اور تم وہاں سے چھپ کر یہاں آئے ہو اس لئے قدرتی بات ہے کہ تمہارے پیچھے خفیہ پولیس لگ گئی۔ کیونکہ دلی دار الحکومت ہے جو پاکستانی دلی کا ویزا لگوا کر آتے ہیں پولیس ان کی نگرانی کرتی رہتی ہے اگر کوئی پاکستانی دلی سے سے باہر کسی شہر کا رخ کرے تو پھر وہ اسے جاسوس سمجھ کر اس کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ تمہارے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ مگر تم فکر نہ کرو میں یہاں اب تمہیں پریشان کرنے کوئی پولیس والا نہیں آئے گا۔"

میں نے مطلب کی بات شروع کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے یہ بتائیے کہ میں مجاہد کمانڈو کمال شاہ صاحب کے پاس کس طرح پہنچ سکتا ہوں"

سید صاحب کہنے لگے۔

"میں تمہیں ہروہ ضلع ہوشنگ آباد تک پہنچنے کا راستہ تو بتا دوں گا۔ مگر اس کے آگے تمہیں خود کمال شاہ صاحب کو تلاش کرنا ہوگا۔ مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ ہروہ سے کوئی دس گیارہ میل دور دریائے زبدا کے کنارے سابق ریاست اندور کی حدود میں گویت نام کا ایک گاؤں ہے بس یہیں سے وہ جنگل شروع ہوتا ہے جس کے اندر کہیں کمال شاہ صاحب لئے اپنا ٹھکانہ بنایا ہوا ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ وہاں وہ خاص خاص کشمیری حریت پرستوں کو کمانڈو کی ٹریننگ دیتے ہیں۔"

میں کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ باہر سے کسی نے دروازے پر دستک دی۔ سید صاحب جلدی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھے۔

باہر کوئی عورت آئی تھی۔

سید صاحب باہر نکل کر عورت سے کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر اندر آکر دروازہ بند کر کے میرے پاس بیٹھ گئے۔ میں نے پوچھا۔

"ہردہ شہر جس کا آپ نے نام لیا ہے یہ کہاں پہ ہے۔ اور یہاں جانے کے لئے مجھے کونسی ریل گاڑی پکڑنی ہوگی"

سید صاحب نے کہا۔

میاں تم ہندوستان۔ میں بالکل نئے نئے آئے ہو۔ اب تمہیں کیا بتاؤں کہ مدھیہ پردیش کہاں ہے اور کیا ہے۔ بھوپال اور بمبئی کا نام تو تم نے ضرور سنا ہوگا"

میں نے یہ نام پاکستان میں اخباروں اور رسالوں میں پڑھے ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔

"نام ضرور سنے ہیں مگر معلوم نہیں یہ شہر کہاں پر واقع ہیں۔"

سید صاحب کہنے لگے۔

"یہاں سے آدمی بمبئی جائے تو بمبئی بھوپال لائن پر ایک شہر آتا ہے جس کا نام ہردہ ہے۔ یہ ضلع ہوشنگ آباد کا بڑا اہم شہر ہے اور اناج کی بڑی منڈی ہے۔ یہاں پسنجر ٹرین بھی ٹھہرتی ہے اور ایکسپریس ٹرین شاید تھوڑی دیر کے لئے رکتی ہے۔ بس تمہیں یہیں جانا ہوگا۔ امرتسر سے تمہیں ہردہ کا ٹکٹ مل جائے گا۔

میں اپنا آدمی تمہارے ساتھ کر دوں گا۔ وہ خود تمہیں گاڑی میں بٹھا آئے گا۔ آگے تمہیں خود احتیاط سے کام لینا ہوگا۔"

میں نے ابھی تک سید صاحب کو اپنے والد صاحب کی دوسری وصیت کے بارے میں میں بتایا تھا کہ میری چھوٹی بہن کو سکھ غنڈے نے فسادات میں شہید کر دیا تھا اور میرا پ بٹی کی لاش کھیتوں میں جس جگہ چھوڑ کر میرے ساتھ بھاگا تھا مجھے وہاں جاکر فاتحہ بھی ھنا ہے اور اپنی شہید بہن کی روح سے والد صاحب کی طرف سے معافی بھی مانگنی ہے۔

جب میں نے انہیں اس بارے میں بتایا تو وہ بولے۔ یہ بڑا جذباتی سا کام تمہارے الد صاحب تمہارے سپرد کر گئے ہیں۔ تمہارے پیچھے پہلے ہی خفیہ پولیس لگی ہوئی ہے۔ کہاں کھیتوں میں وہ جگہ تلاش کرتے پھرو گے۔ بارہ سال گزر گئے ہیں اس بات کو۔ معلوم میں اب وہاں کھیت ہوں گے کہ کوئی بلڈنگ بن گئی ہوگی"

میں نے کہا۔

"یہ میرے والد صاحب کی وصیت تھی۔ میں ہر حالت میں ان کی وصیت کو پورا کرنا چاہتا ہوں۔ امرتسر شہر کے اردگرد کا سارا علاقہ میرا جانا پہچانا ہے۔ جب پاکستان بنا تو مجھے اس وقت کافی ہوش تھا۔ میں وہ جگہ پہچان لوں گا جہاں میرے میاں جی نے میری بہن کی لاش کو زمین پر رکھ دیا تھا۔ میں اس وقت ان کے ساتھ تھا۔"

سید صاحب کچھ تذبذب میں پڑ گئے۔ سر ہلا کر بولے۔

"برخوردار! میں تمہیں وہاں جانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ آگے تمہاری مرضی ہے جو چاہے کرو"

میں نے کہا۔

"میں شام کے وقت جب اندھیرا ہو جائے گا تو جاؤں گا۔ مجھے وہ جگہ یاد ہے۔ قریب ہی ریلوے پھاٹک تھا اور امرتسر شہر کے شریف پورے کی آبادی شروع ہو جاتی تھی۔"

سید صاحب کہنے لگے۔

"""اب شریف پورے کا نام سکھوں نے سنگھ پورہ رکھ دیا ہے۔ ٹھیک ہے اگر تم نے ارادہ کرہی لیا ہے تو پھر آج شام کو وہاں چلے جانا۔ لیکن ایک بات کا تمہیں مجھے یقین دلانا ہوگا"

"فرمایئے" میں نے پوچھا۔

سید صاحب نے کہا۔

"اگر خدا نہ کرے تمہیں پولیس نے پکڑ لیا تو پوچھ گچھ کے وقت ہمارا نام نہ لینا۔"

میں نے کہا۔

آپ یقین رکھیں۔ پولیس مجھ پر کیسا بھی تشدد کیوں نہ کرے۔ میری زبان پر آپ کا نام نہیں آئے گا"

سید صاحب کا چہرہ بتا رہا تھا کہ انہیں میری بات پر یقین نہیں آیا۔ سر کو ہلاتے ہوئے بولے۔

"بھائی! تم یہاں کی پولیس کے تشدد سے واقف نہیں ہو۔ خدا نہ کرے۔ خدا نہ کرے-----"

اور وہ سر جھکائے اٹھ کر چلے گئے۔ دوپہر تک میں اسی کمرے میں رہا۔

پھر سید صاحب آگئے۔ کہنے لگے۔

"جتنا کچھ میں نے اپنے طور پر پتہ کرایا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ امرتسر پولیس کو یقین ہوگیا ہے کہ تم امرتسر سے نکل چکے ہو۔ اب ایسا ہے کہ میں چاہتا ہوں۔ یہ کام تم آج شام ہی کرلو۔ مگر تمہارا اکیلے ہی جانا بہتر ہوگا"

میں سورج غروب ہونے تک وہیں اسی کمرے میں رہا۔ جب سورج ڈوب گیا شام کا ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنے لگا تو میں سید صاحب کو بتا کر مزار سے نکل کھڑا ہوا۔ میں

اور جیکٹ والے لباس میں ہی تھا۔ مزار والے میدان کو پار کرنے کے بعد میں گندے نالے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ نالہ آگے کی طرف جاتا ہے۔ اس نالے نے مجھے جی ٹی روڈ پر پہنچا دیا۔ ابھی اتنا اندھیرا نہیں ہوا تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک جاری تھی۔ میں جی ٹی روڈ پر رام تلائی تک چلتا گیا۔ یہاں سے میں بائیں جانب ریلوے پھاٹک کی طرف ہوگیا۔ میرے اندازے کے مطابق کوئی خفیہ پولیس والا میرا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔ ریلوے پھاٹک پر آکر میں نے سامنے کی جانب دیکھا جدھر آگے جا کر مجیٹھ جانے والی ریلوے لائن جاتی تھی۔

یہاں کھیتوں کی ایک تکون سی بنی ہوتی تھی۔ حیرت کی بات ہے کہ یہاں ابھی تک کھیت ہی تھے۔ کوئی نئی بستی نہیں بنی تھی۔ میں یادداشت کے سہارے ان کھیتوں میں آگیا۔ چلتے چلتے اس مقام پر پہنچا جہاں سے میرے باپ نے مجھے اور میری چھوٹی بہن کلثوم کا بازو پکڑ کر ریلوے لائن پار کی تھی۔ آگے جو چھوٹی سی کچی مسجد ہوا کرتی تھی وہ اب وہاں نہیں تھی۔ امرودوں کے باغ بھی ویسے کے ویسے ہی تھے۔ آگے وہ کھیت آگئے جہاں میرا باپ ہمیں لے کر بھاگا تھا اور سامنے سے ایک گھوڑ سوار سکھ گھوڑا دوڑاتا آیا تھا اور اس نے میری بہن کی گردن پر تلوار کا وار کیا تھا۔ یہاں سے میرا باپ میری زخمی بہن کو اٹھا کر کھیتوں میں بھاگتا ہوا چلا گیا تھا۔ میں روتا ہوا اس کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔ میں ایک جگہ رک گیا۔ میں اپنے ذہن پر زور ڈال کر سوچنے لگا کہ کیا یہی وہ جگہ ہے جہاں میری پیاری بہن کی لاش ہم چھوڑ گئے تھے؟ پورا یقین نہیں آرہا تھا۔ میں کچھ قیاس کر رہا تھا۔ کچھ اندازہ لگا رہا تھا۔ شام کا اندھیرا بھی گہرا ہوگیا تھا۔ کھیتوں پر رات کے اولیں اندھیرے کی چادر سی پھیلنے لگی تھی۔ اچانک مجھے چنبیلی کے پھولوں کی ہلکی سی مہک آئی۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے ادھر ادھر کسی کھیت میں چنبیلی لگی ہو اور یہ اس کے پھولوں کی خوشبو ہوا کے ساتھ ادھر آگئی ہو۔ میں نے دوسرے کھیت میں جانے کے لئے قدم اٹھائے تو چنبیلی کی خوشبو تیز ہوگئی۔ بالکل اس طرح لگنے لگا جیسے کسی نے چنبیلی کے پھول میرے چہرے کے قریب کر دیئے ہوں۔ ایک دم سے مجھے یاد آگیا کہ

میری چھوٹی بہن کلثوم بالوں میں چنبیلی کا تیل لگایا کرتی تھی۔ میں وہیں ساکت سا ہوگیا۔ چنبیلی کی خوشبو پہلے سے زیادہ تیز ہوگئی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری شہید بہن کی روح میرے پاس کھڑی ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آئے۔ یقیناً یہی وہ جگہ تھی جہاں ہم کلثوم کی لاش چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھی۔ اور میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے بلند آواز میں کہا۔

"کلثوم! میاں جی نے کہا تھا مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہاری میت بے گور کفن چھوڑ آیا تھا۔ میری بہن مجھے بھی معاف کر دینا"

اور میں روتے روتے وہیں کھیت میں بیٹھ گیا اور مٹی کو ہاتھ لگا کر اپنے ہاتھ کو بار بار چومنے اور اپنی شہید بہن سے معافیاں مانگنے لگا۔ میں دیر تک کھیت میں بیٹھا دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھے روتا رہا۔ جب میرا غم کچھ ہلکا ہوا تو آہستہ آہستہ چلتا کھیت سے باہر نکل آیا۔ اس وقت چاروں طرف رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ چنبیلی کی خوشبو میرے ساتھ ساتھ آرہی تھی۔ جب میں ریلوے پھاٹک پر پہنچا تو چنبیلی کی خوشبو پہلے سے ہلکی ہوگئی۔ میں جی ٹی روڈ پر آیا تو چنبیلی کی خوشبو مجھ سے جدا ہوگئی تھی۔ اپنی شہید بہن کو یاد کر کے میری آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آگئے۔ میں نے رک کر پیچھے دیکھا۔ پیچھے اندھیرے میں ٹاہلیوں کے درختوں کے ہیولے نظر آرہے تھے۔ میں نے آہ بھر کر کہا۔

"الوداع میری بہن! اب حشر کے روز ملاقات ہوگی"

جس وقت میں مزار پر واپس آیا تو مزار کی بتیاں روشن تھیں۔ سید صاحب مزار کے باہر ایک طرف بے چینی سے ٹہلتے نظر آئے۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے میرے پاس آئے اور سخت ناراض ہو کر بولے۔

"تم نے کمال کر دیا۔ اتنی دیر لگا دی۔ میں تو سخت پریشان ہوگیا تھا۔ جلدی سے پیچھے کواٹروں والی کوٹھڑی میں چلے جاؤ۔ تمہارے پیچھے تو کوئی نہیں لگا ہوا؟"
میں نے کہا۔

"میرا نہیں خیال پیچھے کوئی لگا ہو"

"خدا کے واسطے جلدی سے اندر جاؤ۔ میں آتا ہوں"

یہ کہہ کر سید صاحب مزار کے اندر چلے گئے۔ میں دوسری طرف والے دھریک کے درختوں میں سے گزر کر عقبی کواٹر نما کوٹھڑی میں آگیا جس کا دروازہ کھلا تھا۔ تھوڑی دیر بعد سید صاحب بھی آگئے۔ انہوں نے واسکٹ کی جیب سے ریل گاڑی کا زرد رنگ کا ایک ٹکٹ نکال کر مجھے دیا اور کہنے لگے۔

"یہ امرتسر سے ہردہ سٹیشن تک کا ریل گاڑی کا ٹکٹ ہے۔ یہ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ ہے۔ گاڑی رات کو 9 بج کر چالیس منٹ پر امرتسر سے روانہ ہوتی ہے۔ تم آج رات ہی یہاں سے نکل جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے ساتھ ہم بھی کسی مصیبت میں پھنس جائیں۔"

میں نے ٹکٹ لے کر جیب میں رکھ لیا اور سید صاحب کا شکریہ ادا کیا انہوں نے دوسری جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا بٹوہ نکالا۔ اسے کھولا۔ اور اس میں سے انڈین کرنسی کے دس دس کے چھ نوٹ نکال کر مجھے دیئے اور کہا۔

"کاش میں اس سے زیادہ تمہارے لئے کچھ کر سکتا اسے میری جانب سے نذر سمجھ کر قبول کر لینا"

میں نے کہا۔

"شاہ جی! میرے پاس انڈین کرنسی موجود ہے۔ آپ زحمت نہ کریں۔"

مگر سید صاحب نے روپے واپس لینے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگا۔

"اس وقت ساڑھے سات بجے ہیں۔ ابھی ٹرین میں کافی ٹائم ہے۔ میں نے کھانا منگوایا ہے۔ کھانا میرے ساتھ کھا کر ہی جانا۔"

میں نے پوچھا کہ ٹرین ہردہ سٹیشن پر کس وقت پہنچے گی۔ سید صاحب نے کہا۔

"یہ بڑا لمبا سفر ہے میرے عزیز۔ بس تم ڈبے کے کسی کونے میں بیٹھ جانا۔ جب

آج کی رات اور کل کی رات بھی ٹرین میں گزر جائے تو کسی مسافر سے پوچھ لینا کہ بھوپال کتنی دور ہے۔ بھوپال کے بعد ہوشنگ آباد کا سٹیشن آئے گا۔ اس کے بعد ہردہ کا چھوٹا سٹیشن آئے گا۔ بس وہیں اتر جانا۔"

پھر انہوں نے جیب ہی سے چھوٹی سی نوٹ بک نکال کر کھولی۔ اس میں سے کسی کا نام پڑھا۔ اور نوٹ بک بند کر کے جیب میں رکھی اور مجھے کہا۔

"ہردہ جا کر ایک شخص سے مل لینا۔ وہ مجاہد کمانڈو کمال شاہ کا ٹھکانہ تمہیں بتا دے گا۔ یہ آدمی دو ایک بار کمال شاہ کمانڈو کے ساتھ یہاں بھی آچکا ہے۔ اس کے آگے میرا نام لینا۔ ہرگز ہرگز کسی اور سے کمال شاہ کمانڈو کا ذکر نہ کرنا۔"

میں نے سید صاحب کو یقین دلایا کہ میں کمال شاہ کا نام کسی کے آگے نہیں لوں گا۔ سید صاحب کہنے لگے۔

"اس شخص کا نام ہے۔۔۔۔۔"

مگر میں آپ کو اس شخص کا نام نہیں بتاؤں گا۔ کیونکہ وہ آج بھی زندہ ہے۔ میں اس کا پتہ بھی آپ کو نہیں بتاؤں گا جو سید صاحب نے مجھے بتایا تھا۔ اس طرح اس شخص کو نقصان پہنچنے کا شدید خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ میں اس شخص کا فرضی نام جمیل رکھ لیتا ہوں۔ سید صاحب نے مجھے جمیل کا پورا ایڈریس بھی بتا دیا اور کہا۔

"دنیاوی اخلاق کے اعتبار سے جمیل کی شہرت اچھی نہیں ہے۔ وہ بدمعاش ٹائپ آدمی ہے۔ مگر پاکستان کا سچا عاشق ہے اور کشمیر کے جہاد میں بھی حصہ لے چکا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ تمہیں خود لے کر کمانڈو کمال شاہ کے پاس نہ جائے مگر تمہیں اس کا ٹھکانہ بتا دے گا۔"

میں نے سید صاحب سے کہا کہ مجھے جمیل کا نام اور پتہ کاغذ پر لکھ دیں۔ انہوں نے کہا۔

"نہیں۔ تم دشمن ملک میں ہو اور تمہارے پاس ہردہ بھوپال وغیرہ کا ویزا نہیں ہے۔ تم جمیل کا نام پتہ اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔"

میں اپنے ذہن میں جمیل کا نام اور اس کا ایڈریس دہرانے لگا۔ مجھے سب یاد ہو گیا۔ اتنے میں کھانا آگیا۔ میں نے سید صاحب کے ساتھ کھانا کھایا۔ اتنی دیر میں رات کے پونے نو بج گئے۔ سید صاحب بولے۔

"اپنا پاسپورٹ سنبھال کر رکھنا۔ یہ پاکستانی پاسپورٹ ہے اگر راستے میں کوئی پوچھ بھی لے تو کہہ دینا کہ میں نے دلی کا ویزا لگوایا تھا مگر بھوپال کی سیر کرنے آگیا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کوئی بات نہ کرنا۔ اب تم یہاں سے سیدھا ریلوے سٹیشن پر چلے جاؤ۔ بمبئی جانے والی گاڑی یہیں سے تیار ہوتی ہے۔ قلی سے پوچھ لینا۔ یہ ٹرین کسی نہ کسی پلیٹ فارم پر ایک طرف کھڑی ہو گی۔ مسافر بھی بیٹھے ہوں گے۔ تم بھی تھرڈ کلاس کے ڈبے میں کسی کونے میں دبک کر بیٹھ جانا اور زیادہ باہر نہ پھرنا۔۔۔۔"

پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا مجھے امرتسر سٹیشن کا راستہ معلوم ہے؟ میں نے کہا۔

"جی ہاں۔ جب میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا تو اپنے والد کے ساتھ یہیں سے گاڑی میں بیٹھ کر لاہور جایا کرتا تھا"

"بس ٹھیک ہے۔ لو پھر خدا حافظ۔ میں پہلے نکل جاتا ہوں تم کوٹھڑی سے نکل کر پچھلی طرف سے گراؤنڈ پار کر کے سیڑھیوں والے پل کی طرف چلے جانا"

سید صاحب نے مجھے گلے لگایا۔ پھر مصافحہ کیا اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے دو منٹ بعد میں بھی کوٹھڑی سے نکل کر مزار کے پیچھے جو درخت تھے ان کے درمیان سے ہوتا ہوا گراؤنڈ میں آگیا۔ گراؤنڈ کے آگے ریلوے لائن کی اونچی دیوار تھی۔ ذرا آگے سیڑھیوں والا پل تھا جو ریلوے یارڈ کے اوپر بنا ہوا تھا۔ یہ سارے راستے میرے جانے پہچانے تھے۔ جب میں گراؤنڈ میں سے رات کے اندھیرے میں گزر رہا تھا تو

میں نے محسوس کیا تھا کہ کوئی شخص میرا پیچھا کر رہا ہے۔ ایک جگہ رک کر میں نے پیچھے کر دیکھا بھی مگر مجھے کوئی آدمی دکھائی نہیں دیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ ایک آدمی ب تعاقب کر رہا تھا۔

رات کے پونے نو بجے کا وقت تھا۔ امرتسر شہر میں کوئی اتنی زیادہ روشنیاں نہ تھیں۔ ریلوے لائن پر سگنل کی سرخ سبز بتیاں نظر آتی تھیں۔ دائیں جانب مکانوں ب روشنی تھی۔ سڑک پر کافی فاصلے فاصلے پر سٹریٹ لیمپ روشن تھے۔ سیڑھیوں والا ریلو کا پل مجھ سے تھوڑی دور ہی رہ گیا تھا۔ میں سڑک پار کر کے پل کی طرف بڑھا تو اچا کسی نے پیچھے سے میرے بازو کو پکڑ کر پنجابی میں پوچھا کہ میں کدھر جا رہا ہوں؟ ایک ک کے لئے میرا جسم خوف کے مارے بے جان سا ہو گیا۔ وہ آدمی اب میرے سامنے آگیا تھ یہ وہ ہندو نہیں تھا۔ جو اس سے پہلے میرے خیال کے مطابق دلی سے میرا پیچھا کر رہا تھ اور جس نے مجھے گرفتار کرانے کے لئے مزار پر بھی چھاپہ ڈلوایا تھا۔ یہ آدمی بھی ہندو تھ سکھ نہیں تھا مگر جوان اور اچھے ڈیل ڈول والا تھا۔ تنگ ہندووانہ پاجامہ اور کرتا پہنا تھا۔ اوپر صدری پہن رکھی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ صدری کی جیب میں تھا۔ میں نے گھبراہٹ پر بہت حد تک قابو پا لیا تھا۔ میں نے بھی پنجابی میں بڑے اعتماد سے کہا۔

"گھر جا رہا ہوں"

"کہاں ہے تمہارا گھر؟"

وہ میرے بالکل سامنے تھا۔ اس نے میرا ایک بازو ابھی تک اپنی گرفت میں لے ر تھا۔ میں نے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تم میرا بازو تو چھوڑو۔ ر سینما کے پاس ہے میرا گھر۔"

وہ شخص بڑی عیاری سے مسکرا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے میرا نام پوچھا۔

میں نے فوراً کہا۔

"موہن چند۔"

موہن چند نام کا ایک ہندو لڑکا مجیٹھہ کے سکول میں میرے ساتھ پڑھا کرتا تھا۔

وقت اچانک مجھے اس کا نام یاد آگیا تھا۔ اس آدمی نے ایک ہاتھ سے میرا بازو پکڑے رکھا۔ دوسرا ہاتھ جو اس کی صدری میں تھا اس نے باہر نکالا تو اس میں ایک پستول تھا۔ کہنے لگا۔

"تمہیں میرے ساتھ تھانے چلنا ہو گا وہاں تم اپنا اصلی پاکستانی نام بتاؤ گے"

میرے جسم میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ تھانے جانے کا مطلب یہ تھا کہ پولیس کو معلوم ہو جاتا کہ میں پاکستانی ہوں۔ پاسپورٹ پر دلی کا ویزا لگا تھا مگر میں غیر قانونی طور پر امرتسر آگیا ہوں۔ پولیس نے ظاہر ہے مجھے پاکستانی جاسوس سمجھ کر گرفتار کر لینا تھا اور پھر مجھ پر تشدد اور اذیتوں کا ایک ناقابلِ ختم سلسلہ شروع ہو جاتا۔ ایک سیکنڈ میں مجھے اپنے مقاصد اور امیدوں کے محل مسمار ہوتے نظر آئے۔ ایک بات بالکل واضح تھی کہ میں اس شخص سے بچ نہیں سکتا تھا۔ وہ خفیہ پولیس کا آدمی تھا اور پولیس میری تلاش میں مزار پر پہلے بھی چھاپہ مار چکی تھی۔ اب میں اس کے شکنجے میں جکڑا جا چکا تھا۔ میں نے اس کے باوجود آخری کوشش کے طور پر اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں پاکستانی نہیں ہوں۔ میرا نام موہن چند ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس پر میری کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے پستول والا ہاتھ صدری کی جیب میں ڈال لیا اور بولا۔

"میرا نشانہ بڑا پکا ہے۔ تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو میرے پستول کی گولی تمہیں وہیں سڑک پر گرا دے گی۔ چپ چاپ میرے ساتھ تھانے چل پڑو"

وہ میرا بازو پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ چلانے لگا۔ اس کا رخ ہال بازار کی طرف تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے کوتوالی لے جا رہا ہے۔ کوتوالی کا تھانہ ہال بازار کے آخری سرے پر تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے جب کبھی میں اپنے میاں جی کے ساتھ امرتسر آتا تھا تو کوتوالی کے قریب سے کئی بار گزرا تھا۔ مجھے یہ بھی پتہ تھا کہ ہال بازار میں دو مسجدیں بھی ہیں۔ مگر ظاہر ہے پاکستان بن جانے کے بعد اور مسلمانوں کے امرتسر شہر خالی کر دینے کے بعد یہ مسجدیں ویران ہو گئی تھیں۔ میں اس خفیہ پولیس والے کے شکنجے میں جکڑا ہوا اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ہم لال گیٹ کے نیچے سے گزر کر ہال بازار میں آگئے۔ میں نے دل میں پکا فیصلہ کر لیا تھا کہ ایک بار تو فرار ہونے کی کوشش ضرور کروں گا چاہے گولی لگنے

سے زخمی کیوں نہ ہو جاؤں۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ شخص فائر کرے اور گولی مجھے نہ لگے رات کا وقت ہے میں اندھیرے میں کسی نہ کسی طرف نکل سکتا ہوں۔ ہال بازار میں [...] سکھ آجا رہے تھے۔ دکانیں کھلی تھیں۔ کچھ دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ ہم مسجد خیرالدین [...] آگے سے گزر گئے۔ اس کے آگے گول ہٹی والا چوک آتا تھا۔ مجھے یاد تھا کہ یہاں [...] ایک بازار رام باغ کی طرف نکلتا ہے۔ اس بازار میں طوائفیں بیٹھتی تھیں۔ مجرا بھی [...] تھا۔ میں اپنے والد صاحب کے ساتھ اس بازار میں سے بھی دو تین بار گزرا تھا۔ کیونکہ وہاں آٹے دال اور پرچون کی دکانیں بھی تھیں۔

میں نے دل میں طے کرلیا کہ جیسے ہی گول ہٹی والا چوک آئے گا میں رام باغ [...] طرف دوڑ پڑوں گا۔ اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ کیونکہ تھانے پہنچنے کے بعد میر[...] اور میرے مشن کی موت یقینی تھی۔ مجھے ہر حالت میں اپنی جان بچانے کے لئے جان [...] بازی لگانی تھی۔ میں نے دور سے دیکھا چوک میں گول ہٹی کھلی تھی۔ یہ سکھوں کی مش[...] دکان ہوا کرتی تھی جہاں منیاری کا سامان اور تلواریں کرپانیں بکا کرتی تھیں۔ خفیہ پولی[س] والے نے میرا بایاں بازو پکڑ رکھا تھا۔ اپنا دوسرا ہاتھ جس میں پستول تھا اس نے صدری [...] جیب میں ڈالا ہوا تھا۔ میں نے گہرے گہرے لمبے لمبے سانس لینے شروع کردیئے اور [...] میں خدا سے کہا۔

”میرے مولا! اس وقت میری مدد فرما۔ میں تیرے دین کے راستے پر جہاد کرنے نکلا ہوں۔ مجھے ان کافروں کے ہاتھوں مرنے سے بچالے“

میرا بھی وہ بھرپور شباب کا زمانہ تھا۔ میرا ہڈ کاٹھ بھی بڑا مضبوط تھا۔ بدن میں جوا[ن] خون اور اسلام کا جوش و جذبہ موجزن تھا۔ گہرے سانس لینے سے میرے خون میں پو[...] آکسیجن شامل ہوگئی تھی۔ جیسے ہی میں چوک میں پہنچا۔ میں نے یا علی ؑ کا نعرہ لگا[...] ایک ہی جھٹکے سے اپنے آپ کو کافر پولیس والے سے چھڑایا اور رام باغ کی طرف [...] والے طوائفوں کے بازاروں میں اندھا دھند بھاگ اٹھا۔ مجھے یقین تھا کہ بازار میں [...]

ہے۔ خفیہ پولیس والا میرے پیچھے ضرور بھاگے گا مگر گولی فائر نہیں کرے گا۔ اور ایسا ہی ہوا میرے پیچھے کوئی فائر نہ ہوا۔ شور ضرور اٹھا۔ پکڑو پاکستانی جاسوس کو پکڑو خفیہ پولیس والا چلاتا ہوا میرے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ مگر میرے اندر کوئی ایسی طاقت آگئی تھی کہ ایک دو آدمیوں نے مجھے پکڑنے کی کوشش بھی کی مگر میں انہیں گرا کر آگے نکل گیا۔ لیکن یہ بات میں جانتا تھا کہ جہاں سارا شہر میرا مخالف ہو وہاں زیادہ دیر تک میں بھاگ نہیں سکتا۔ مجھے فوراً کسی جگہ چھپ جانے یا جل دے کر کسی دوسری طرف نکل جانے کی ضرورت تھی۔

یہ بازار اگر چہ میرا دیکھا بھالا تھا مگر میں اس کی گلیوں کی بھول بھلیوں سے واقف نہ تھا۔ مجھے بائیں جانب ایک گلی نظر آئی۔ میں گلی میں گھس گیا۔ گلی آگے جا کر مڑ گئی۔ میں بھی بھاگتا بھاگتا اسی طرف گھوم گیا۔ میرے پیچھے مجھے لوگوں کے قدموں کی آواز دور ہوتی محسوس ہوئی۔ شاید کسی نے لوگوں کے ہجوم میں مجھے گلی میں مڑتے نہیں دیکھا تھا۔ گلی میں اندھیرا اندھیرا سا تھا۔ بجلی کا کوئی کھمبا نہیں تھا۔ مگر میری بد قسمتی کہ جیسے ہی بھاگتا بھاگتا میں ذرا آگے گیا تو معلوم ہوا کہ گلی آگے جا کر بند ہوگئی ہے۔ اب میرا پکڑا جانا یقینی تھا۔ بازار میں مجھے پاکستانی جاسوس کو پکڑو کا شور صاف سنائی دے رہا تھا۔ میں کسی مکان کی سیڑھیاں تلاش کرنے لگا کہ کسی مکان کے اوپر چڑھ کر چھتوں چھتوں پر سے ہوتا ہوا دوسرے بازار میں نکل جاؤں۔ ایک دروازہ نظر آیا۔ مگر وہ اندر سے بند تھا میں نے اندھیرے میں دوسری طرف گھوم کر دیکھا۔ اچانک مجھے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔

”میرے سوامی! میرے ناتھ! تم آگئے؟“

گلی میں اندھیرا ضرور تھا مگر اسی اندھیرے میں میں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ جہاں گلی بند ہوتی تھی اس کی دیوار کے ساتھ ہی ایک مکان کی بیٹھک کی کھڑکی کھلی تھی۔ اس میں ایک عورت کا چہرہ نظر آیا جو مجھے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلاتے ہوئے بار بار کہہ رہی تھی۔

”میرے سوامی! میرے ناتھ تم آگئے۔ آجاؤ میرے پاس آجاؤ۔ میں تمہاری

داسی ہوں"

مجھے اس وقت یہ معلوم کرنے کی فرصت ہی نہیں تھی کہ یہ عورت کون ہے اور اس کے سوامی کون ہیں۔ میں اس کی طرف لپک کر گیا۔ کھڑکی زمین سے کوئی چار فٹ اونچی تھی اور کھلی تھی۔ مجھے قریب آتا دیکھ کر عورت پیچھے ہٹ گئی۔

میں کھڑکی میں سے اندر کود گیا۔ اندر بھی اندھیرا تھا۔ میں نے عورت سے کہا۔

"کھڑکی بند کردو"

اس عورت نے جو خدا جانے کون تھی فوراً کھڑکی بند کر کے کنڈی لگا دی۔ اب میں فرش پر بیٹھا ہانپ رہا تھا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ کسی مکان کی اس قسم کی بیٹھک تھی کہ جس کی کھڑکی اس گلی میں کھلتی تھی اور دروازہ کسی دوسری گلی میں کھلتا تھا۔ مجھے طبلے بجنے اور گھنگھروؤں کی جھنکار کی آوازیں سنائی دیں۔ میں کسی طوائف کے مکان کی نچلی بیٹھک میں آ گیا تھا۔ مگر سوال یہ تھا کہ یہ عورت کون تھی۔

اس عورت نے بے اختیار مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور خوشی سے نہال ہو کر جذباتی لہجے میں بولی۔

"میرے سوامی! میرے ناتھ! آخر تم نے اپنی پتنی کو معاف کر دیا۔ آخر تم میرے پاس آ گئے۔ ہے بھگوان! تیری کرپا ہے۔۔۔۔"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ عورت کون ہے اور مجھ سے کس قسم کی باتیں کر رہی ہے۔ میرا ایک کان باہر کی آوازوں پر بھی لگا تھا۔ مجھے دھڑکا لگا تھا کہ خفیہ پولیس والا لوگوں کو لے کر گلی میں ضرور آئے گا۔ اگرچہ مکان کی کھڑکی بند تھی مگر وہ کھڑکی کھلوا بھی سکتا تھا۔ اگر انہوں نے مجھے اس گلی میں گھستے دیکھ لیا ہے اور گلی آگے جا کر بند ہو جاتی ہے تو لا محالہ وہ یہی سمجھیں گے کہ میں اسی مکان میں گھسا ہوں۔ مگر گلی میں خاموشی تھی۔ اس خاموشی کو صرف طبلے اور گھنگھروؤں کی آواز ہی پریشان کر رہی تھی۔ اوپر چھت

کوئی طوائف مجرا کر رہی تھی جس کے پاؤں کی تھاپ بھی چھت پر سنائی دینے لگی تھی۔

میں نے آہستہ سے عورت سے کہا۔

"یہاں کوئی اور دروازہ بھی ہے؟"

عورت نے ابھی تک مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ رکھا تھا اور بار بار میری بلائیں لے رہی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے آزاد کیا۔ اتنے میں اس عورت نے خدا جانے کہاں سے موم بتی اور ماچس نکالی اور موم بتی روشن کر دی۔ موم بتی کی روشنی میں جو چیز مجھے سب سے پہلے نظر آئی وہ اس عورت کے ایک پاؤں میں پڑی ہوئی لوہے کی زنجیر تھی۔ میں ٹھٹک سا گیا۔ پھر عورت کو دیکھا۔ یہ پچیس تیس سال کی جوان ہندو عورت تھی۔ ماتھے پر تلک لگا تھا۔ سفید ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ مانگ میں سیندور بھی بھرا ہوا تھا۔ رنگ گورا تھا اور بڑی صحت مند عورت تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی وحشت سی جھلک رہی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے جا رہی تھی۔ جلتی ہوئی موم بتی اس نے دونوں ہاتھوں میں تھام رکھی تھی۔ اس نے موم بتی میرے چہرے کے آگے لا کر اس طرح دائیں بائیں تین چار مرتبہ گھمائی جس طرح آرتی اتاری جاتی ہے اور آہستہ آہستہ ڈانس کرتے ہوئے گانے لگی۔ وہ دھیمی آواز میں کوئی بھجن گا رہی تھی جس کے یہ بول مجھے آج بھی یاد رہ گئے ہیں۔

میں تیری داسی جنم جنم کی

کرپا کر اپنایو

میرے رام رمیا

او میرے رام رمیا

میں معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ یہ اس کوٹھے کی طوائف کی کوئی پاگل بیٹی یا بہن تھی جسے بیٹھک میں زنجیر ڈال کر بند کر دیا گیا تھا کہ گھر کی عزت گھر میں ہی رہے۔ بیشک طوائفوں کی بھی اپنی ایک عزت ہوتی ہے جسے ہم نہیں سمجھ سکتے۔ اگر یہ عورت طوائف کی بیٹی یا بہن نہ ہوتی تو وہ اسے کبھی اپنے گھر میں نہ رکھتی۔ میرے لئے یہ پاگل عورت

بھی اس وقت فرشتہ رحمت ثابت ہوئی تھی۔ مگر میں وہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتا تھا
میرے لئے وہاں سے نکل جانا بہت ضروری تھا۔ پولیس پاکستانی جاسوس کی آسانی سے جا
نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ پولیس نے سارے علاقے میں گھر گھر تلاشی لینی تھی۔ ابھی میں
سوچ ہی رہا تھا کہ گلی میں قدموں کی آواز گونجی۔ میں گھبرا کر اٹھا۔ عورت نے بھجن گانا او
رقص کرنا بند کر دیا۔ کھڑکی کو اندر سے اس عورت نے کنڈی لگا دی تھی۔ باہر سے ک
نے زور زور سے کھڑکی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”کھڑکی کھولو۔ کھڑکی کھولو“

میں نے عورت سے کہا۔ ”خبردار کھڑکی نہ کھولنا“

پاگل عورت کو ایک دم غصہ آگیا۔ سا نے موم بتی بجھا دی اور بولی۔

”راکھشس پھر میرے رام کو مجھ سے الگ کرنے آگئے ہیں؟ یہ راون نے بھیجے
ہیں۔ میں ابھی ان کی خبر لیتی ہوں“

وہ لپک کر کھڑکی کی طرف گئی۔ کھڑکی کی کنڈی اتار کر کھڑکی کھولی باہر منہ نکالا اور با
جو لوگ بھی کھڑے تھے ان کو ایسی ایسی فحش گالیاں دینے لگی کہ میں ہکا بکا ہو کر رہ گیا کہ
عورت جو ابھی میرا بھائی یا تلسی داس کا بھجن گا رہی تھی اتنی فحش گالیاں کیسے دینے لگ
ہے۔ باہر ہی سے کسی نے پکار کر کہا۔

”اوئے یار یہ تو روپا کنجری کی پاگل بیٹی ہے“

اور وہ لوگ واپس چلے گئے۔ پاگل عورت اس وقت تک کھڑکی سے منہ باہر نکا
انہیں گالیاں دیتی رہی جب تک کہ وہ لوگ گلی سے باہر نہیں نکل گئے۔ پھر اس نے کھڑ
بند کر کے کنڈی لگا دی ور ساڑھی کی ڈھب میں سے ماچس نکال کر موم بتی روشن کر
کھڑکی کی سل پر رکھ دی اور میرے آگے ہاتھ باندھ کر دوزانو ہو کر بیٹھ گئی وہ آگے پیچھے
آہستہ آہستہ ہل رہی تھی اور بولے جا رہی تھی۔

”میرے رام رمیا! میرے کرشن کنہیا! اب اپنی داسی کو چھوڑ کر نہ جانا۔“

اس کے ساتھ ہی وہ ایک خاص طرز کے ساتھ ایک بار پھر آہستہ آہستہ بھجن گا

لگی۔

”میرے تو رام رمیا پر بھوجی
میرے تو گردھر گوپال
دوسرا نہ کوئی رے
میں تیری داسی جنم جنم کی

اس عورت کے پاؤں میں جو پتلی سی لوہے کی زنجیر پڑی تھی اس کا ایک سرا فرش میں
کھونٹی گاڑ کر اس کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ میں نے موم بتی کی روشنی میں کمرے کا جائزہ
لیا۔ کونے میں ایک چارپائی بچھی تھی جس پر میلا کچیلا سا بستر لگا ہوا تھا۔ ایک عجیب سی بو
کمرے کی فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ چارپائی کی پائنتی کی طرف ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔
میں نے اٹھ کر دروازے کو ذرا سا دھکیلا۔ دروازہ باہر سے بند کیا ہوا تھا۔ پاگل عورت
نے مجھے دروازے کی طرف جاتے دیکھا تو دوڑ کر میری طرف آئی اور پیچھے سے مجھے اپنی
لپیٹ میں لے لیا اور روتے ہوئے بولی۔

”میرے گھن شام! اپنی داسی کو چھوڑ کر نہ جانا۔ میں تو جنم جنم سے تمہارے
درشن کی پیاسی یہاں بیٹھی تھی۔ تم آئے تو میری بگھیا میں بہار آگئی۔
میرے سوامی! میرے ناتھ!۔۔۔۔“

وہ روئے جا رہی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے چپ کرایا اور اسے لے کر
چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اسے حوصلہ دیا کہ میں اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ چھت کے
اوپر کوٹھے میں طبلے باقاعدہ کھڑک رہے تھے۔ گھنگھرو بج رہے تھے اور کوئی طوائف جو اس
پاگل عورت کی ماں یا بہن تھی گانا گا رہی تھی اور ڈانس بھی کر رہی تھی۔ چھت پر اس
کے پاؤں زور زور سے پڑنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔

میں نے اس عورت سے پوچھا۔

”تمہارا نام کیا ہے میری داسی؟“

میں اس کی زبان میں اس سے بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس عورت نے ہاتھ

جوڑ رکھے تھے۔ کہنے لگی۔

"سوامی جی! آپ اپنی بالکی کا نام بھی بھول گئے؟ ہائے میرے بھاگ پھوٹے۔
میں سچ مچ بڑی ابھاگن ہوں۔ سوامی جی! آپ کی پتنی کا نام سوگندی ہے۔"

پھر وہ جھوم جھوم کر گانے لگی۔

ہے رہی میں تو پریم دیوانی
میرا درد نہ جانے کوئی
وستوا مولک دی میرے ست گورو
کرپا کر اپنائیو
ہے ری میں تو پریم دیوانی۔۔۔۔۔۔

میں ایک مصیبت سے نکل کر دوسری مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ اگرچہ یہ دوسرا
مصیبت ہلاکت خیز نہیں تھی اور اس سے میں آسانی سے چھٹکارا حاصل کر سکتا تھا۔ مگر
ابھی میں کھڑکی میں سے کود کر فرار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اس
سارے علاقے کو پولیس نے گھیرے میں لے رکھا ہوگا۔ مجھے یاد آگیا کہ آگے رام باغ
پولیس سٹیشن بھی تھا۔ میں جانتا تھا کہ جیسے ہی گلی میں سے نکل کر بازار میں آیا پکڑا جاؤں
گا۔ اسی لئے میرا کچھ دیر اسی دیوانی عورت کے پاس رہنا بہت ضروری تھا۔ مجھے یہ ڈر بھی
لگا ہوا تھا کہ اوپر سے کوئی آدمی نیچے آگیا تو وہ مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کردے گا۔ اور
شور مچادے گا۔ لیکن اوپر مجرا بڑے عروج پر تھا۔ اس لئے کسی کے ابھی نیچے آنے کا
امکان نہیں تھا۔ مشکل یہ تھی کہ اس نیم دیوانی عورت سے مجھے اپنے سوال کے صحیح
جواب کی توقع نہیں تھی۔ میں اس سے پوچھتا کچھ تھا اور وہ کچھ اور ہی جواب دے دیتی
تھی یا پھر ہاتھ باندھ کر بھجن گانے لگتی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ جو دروازہ ہے یہ باہر کہاں کھلتا ہے؟"

ایک دم سے جیسے وہ اپنی عقل میں واپس آگئی۔ کہنے لگی۔

"باہر گلی میں کھلتا ہے سوامی جی!"

میں نے جلدی سے پوچھا۔

"دروازہ باہر سے کس نے بند کیا ہے؟ یہ کون آکر کھولتا ہے؟"

اسی ہوش مندی کے موڈ میں اس نے جواب دیا۔

"میری بڑی دیدی آدھی رات کے بعد جب مجرا ختم ہو جاتا ہے تو آکر کھولتی
ہے مجھے دودھ اور پیڑے کھلاتی ہے۔ پھر چلی جاتی ہے۔"

اس وقت وہ ہوش مندی کے موڈ میں تھی۔ میں جلدی جلدی اس سے اپنے مطلب
کی معلومات حاصل کرلینا چاہتا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"اوپر اور کون کون رہتا ہے؟"

عقل کی جو لہر ایک پل کے لئے آئی تھی وہ گزر گئی۔ کہنے لگی۔ "سوامی
جی! آپ پرلوک سے آرہے ہیں تھک گئے ہوں گے۔ میں آپ کے پاؤں
داب دیتی ہوں"

پھر وہ میرے بوٹ اتارنے لگی۔ میں نے پاؤں پیچھے کرلئے۔ وہ چارپائی سے اٹھ کر
نیچے فرش پر پاؤں کے بل بیٹھی تھی۔ پھر اس نے میرے کپڑے اتارنے کی کوشش کرتے
ہوئے کہا۔

"لائیے میں آپ کے شریر کو پرسن کرتی ہوں"

میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ "نہیں نہیں۔ ایسا مت کرنا۔ خبردار"

اس نے اپنے ہاتھ پیچھے کرلئے اور بولی۔

"اچھا تو پھر میں اپنے کپڑے اتار دیتی ہوں"

میں نے جلدی سے اس کے ہاتھ پکڑ لئے اور ڈانٹ کر کہا۔

"خبردار! ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ یہاں چارپائی پر بیٹھی رہو۔ نہیں تو ہم
واپس چلے جائیں گے"

وہ رونے لگی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"بھگوان کے لئے مجھے چھوڑ کر نہ جانا میرے سوامی! آپ جیسا کہو گے میں ویسے

ہی کروں گی۔ میں اپنی ساڑھی نہیں اتارتی۔۔۔۔۔" اش میں مجھ سے پہلے پہنچ چکی ہوگی۔ میں جی ٹی روڈ پر جاکر اس کے ساتھ ساتھ کھیتوں
اور وہ وہیں فرش پر چوکڑی مار کر بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کر کے جھومنے اور دھیمی چلا جالندھر کی طرف جانا چاہتا تھا۔ راتوں رات جس قدر آگے نکل سکتا نکل جانا چاہتا
آواز میں بھجن گانے لگی۔ اوپر مجرے کی دھا چوکڑی مچی ہوئی تھی اور طبلے کی تھاپ اور صبح اگر راستے میں کوئی بڑا سٹیشن آگیا تو وہاں سے ٹرین میں بیٹھ کر امرتسر شہر سے دور
گھنگھروؤں کی گھٹی گھٹی آوازیں آرہی تھیں۔ صرف ناچنے والی کے قدموں کی تاپ جر جانا چاہتا تھا۔ یہی میرا پروگرام تھا۔ اب میں اس انتظار میں تھا کہ رات کچھ اور گزر
چھت پر پڑتی تھی زور سے سنائی دے رہی تھی۔ اے۔ اوپر مجرے کی آواز رک گئی تھی۔ میں پونے نو بجے مزار سے چلا تھا۔ اس وقت
میں سوچنے لگا کہ کہاں میں ریل گاڑی میں بیٹھ کر بھوپال کی طرف جارہا تھا اور کہاں ہے اندازے کے مطابق رات کے دس سوا دس بجے کا وقت تھا۔ مجرا رک گیا تھا۔
اس جگہ آکر پھنس گیا ہوں۔ وقتی طور پر اس پاگل عورت کے پاس آکر میں پولیس سے بچ آدمیوں کے اونچی آواز میں بولنے کی ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں۔ میری بالکی دیوانی
ضرور گیا تھا مگر ابھی خطرے کی تلوار میرے سر پر لٹک رہی تھی۔ پولیس اس طوائف عورت میرے سامنے اسی طرح فرش پر بیٹھی ہاتھ باندھے آنکھیں بند کئے جھوم جھوم کر
مکان پر آکر اس کی تلاشی بھی لے سکتی تھی اور وہ نیچے پاگل عورت کے کمرے میں بھی بلوئی اشلوک پڑھ رہی تھی جو میری سمجھ میں بالکل نہیں آرہا تھا۔
دیکھنے آسکتی تھی کہ کہیں پاکستانی جاسوس وہاں تو نہیں چھپا ہوا۔ ہردہ سٹیشن تک کا تھ میں اٹھ کر کھڑکی کی طرف گیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ گلی میں کوئی ہے یا نہیں۔
کلاس کا ریلوے ٹکٹ اور بھارتی کرنسی نوٹ میں نے مزار سے چلتے وقت ہی اپنی جرابوں ایک دم سے دیوانی اچھل کر اٹھی اور پیچھے سے آکر مجھے لپٹ گئی اور میری منتیں کرنی
میں چھپا کر رکھ لئے تھے۔ میری جیب میں صرف ایک عام سا چاقو پاسپورٹ اور پندرہ بیں لگی۔
روپے انڈین کرنسی کے تھے۔ ریل کے ٹکٹ کی معیاد چھ سات دنوں تک ہوتی تھی اور "سوامی! میرے ناتھ! مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔ مجھے
میں دوسرے تیسرے روز بھی ٹرین پکڑ سکتا تھا مگر اتنے روز میں وہاں ٹھہر ہی نہیں سکتا چھوڑ کر نہ جانا"
تھا۔ آدھی رات کے بعد اس پاگل عورت کی بڑی بہن جو اوپر مجرا کر رہی تھی مجرا ختم میں سوچ میں پڑ گیا کہ جب میں یہاں سے فرار ہونے لگوں گا تو یہ عورت تو مجھے
کر کے نیچے آنے والی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر ضرور شور مچائے گی۔ اس کے ساتھ ایک آدھ کھڑکی سے باہر چھلانگ لگاتے دیکھ کر شور مچادے گی۔ یہ ایک بہت بڑا خطرہ تھا۔ شور کی
آدمی بھی ہو سکتا ہے۔ آدھی رات کے بعد میرا پکڑا جانا یقینی تھا۔ مجھے آدھی رات سے آواز سن کر اوپر سے لوگ نیچے آسکتے تھے۔ کیونکہ اب مجرا بھی نہیں ہو رہا تھا اور شور کی
پہلے پہلے وہاں سے فرار ہو جانا تھا۔ فرار ہونے کا راستہ ایک ہی تھا۔ کمرے کی کھڑکی کھول آواز اوپر جاسکتی تھی۔ میں جلدی سے واپس چارپائی پر آکر بیٹھ گیا۔
کر میں باہر چھلانگ لگاؤں گا اور گلی میں سے نکل جاؤں گا۔ مجھے صرف اس بات کا انتظا میں عورت کو تسلیاں دینے لگا۔
تھا کہ ذرا رات گہری ہو جائے۔ مگر یہ طوائفوں کا بازار تھا جس کی رونق رات گئے تک "تم کیوں گھبراتی ہو؟ میں تمہیں چھوڑ کر تھوڑے جارہا ہوں۔۔۔۔۔ تم تو
قائم رہتی تھی۔ میری بالکی ہو میری پتنی ہو"
میں نے سوچ لیا تھا کہ میں یہاں سے واپس ریلوے سٹیشن پر نہیں جاؤں گا۔ ریلوے عورت یہ سن کر جیسے نہال ہوگئی اور میرے گھٹنوں پر سر رکھ کر بولی۔
سٹیشن پر جانا اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈالنے کے برابر تھا۔ وہاں تو پولیس میرا "میرے گردھر گوپال! میرے سوامی دکھ بھنجن"

اتنا مجھے معلوم تھا کہ یہ عورت مجھے کھڑکی سے کودتا دیکھ کر صرف اپنے انداز ہد تھیں۔
شور ہی مچا سکتی ہے۔ میرے پیچھے نہیں آسکتی۔ کیونکہ اس کے پاؤں میں زنجیر بندھی ہوئی ساتھ
تھی۔ وہ صرف کھڑکی کی تک ہی جاسکتی تھی۔ میں کچھ وقت اور وہاں گذرانا چاہتا تھا کہ
رات ذرا زیادہ گزر جائے۔

اوپر چھت پر ایک بار پھر طبلے کھڑکنے گھنگھرو بجنے لگے۔ مجرا پھر شروع ہوگیا تھا۔
اس مجرے کے دوران ہی وہاں سے بھاگنا تھا۔ مجرے کے شور میں اوپر والے اس عورو والے
کے شور مچانے کی آواز نہیں سن سکتے تھے اور گلی بالکل خالی تھی۔ گلی میں کسی مکان و والا باز
دروازہ نہیں تھا۔ یہ ایک ایسی گلی تھی جس میں سارے مکانوں کے پچھواڑے لگتے تھے۔
جب میرے اندازے کے مطابق رات اتنی گزر گئی کہ مجھے وہاں سے نکل جانا چاہیے
میں بھاگنے کے لئے تیار ہوگیا۔ دیوانی عورت ابھی تک میرے گھٹنوں پر سر رکھے ہوئے
تھی۔ خدا جانے وہ منہ ہی منہ میں کیا الا بلا پڑھ رہی تھی۔ موم بتی اس کھڑکی کی سل
لگی ہوئی تھی جس کو کھول کر مجھے گلی میں کودنا تھا۔ میں نے بڑے پیار سے عورت کے
پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"مجھے پانی پلاؤ۔ پیاس لگی ہے"

چارپائی کے پاس ایک صراحی رکھی ہوئی تھی جس کے اوپر گلاس اوندھا پڑا تھا۔
بے چاری عورت یہ سن کر جلدی سے اٹھی اور صراحی کے پاس جاکر گلاس میں پانی ڈا
لگی۔

بس یہی وہ لمحہ تھا جس کا مجھے انتظار تھا۔ میں جلدی سے اٹھا۔ لپک کر کھڑکی کے
گیا۔ کھڑکی کی کنڈی کھولی اور دوسرے لمحے میں اندھیری گلی میں تھا۔ مجھے اپنے
دیوانی عورت کے رونے کی آواز سنائی دی۔ وہ میرے سوامی میرے سوامی کہہ کر مجھ
رہی تھی۔ یہ آواز طبلے اور گھنگھروؤں کے شور میں دب کر رہ گئی اور میں گلی میں سے
کر بازار میں آگیا۔ گلی میں میں دوڑتا ہو آیا تھا۔ بازار میں آتے ہی میں آہستہ آہستہ
لگا۔ بازار میں پہلے جتنا رش نہیں تھا۔ سوائے پان سگریٹ کی دکانوں کے باقی ساری د

تھیں۔ تماش بین گلے میں ہار ڈالے ادھر ادھر منڈلاتے پھر رہے تھے۔ میں بند دکانوں
کے ساتھ ساتھ چلتا رام باغ والے چوک کی طرف چل پڑا۔ چوک میں رونق زیادہ تھی۔
وہاں ایک شرابی نے ہڑبونگ مچا رکھا تھا۔ لوگ اس کے گرد جمع تھے۔ مجھے موقع مل گیا۔ یہ
میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہاں پولیس کا سپاہی کوئی نہیں تھا۔ چوک کے بائیں جانب رام باغ کا
پولیس سٹیشن تھا۔ میں اس طرف جانے کی بجائے سامنے والی گلی میں گھس گیا۔ یہ گلی بد
بازار کی طرف نکل جاتی تھی۔ ان راستوں سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ بد
بازار خالی پڑا تھا۔ یہاں سے میں پاتھی گراؤنڈ میں داخل ہوکر آگے جی ٹی روڈ پر
آگیا۔ میرے بائیں جانب شریف پورہ کی آبادی تھی جو پاکستان بننے سے پہلے مسلمانوں کا
اڈہ ہوا کرتی تھی۔ اب اس کا نام سید صاحب کے بیان کےمطابق سنگھ پورہ رکھ دیا گیا
ہے۔ جی ٹی روڈ پر سے میں دوسری جانب کھیتوں میں اتر گیا اور اللہ کا نام لے کر چل پڑا۔
رات کا وقت تھا۔ سڑک پر سے کبھی کبھی کوئی ٹرک یا تانگہ گزر جاتا تھا۔ کھیت
سنسان تھے۔ چاروں طرف رات کے اندھیرے نے چادر تان رکھی تھی۔ میں رام تلائی
سے بھی آگے نکل گیا۔ پھر بائیں جانب مقبول پورے والی بستی آئی اور وہ بھی گزر گئی۔
اس کے بعد بجلی والی نہر کا پل آگیا۔ میں نے اچھی طرح چاروں طرف دیکھ بھال کر پل
عبور کیا اب میں غیر آباد علاقے میں داخل ہو چکا تھا۔ کھیتوں کی بجائے اب میں سڑک کے
کنارے ٹاہلیوں کے درختوں کے نیچے سے ہو کر چلنے لگا تھا۔ دور سے کسی ٹرک یا بس کی
روشنی نظر آتی تو میں کھیت میں چھپ جاتا۔ اس طرح میں نے کافی فاصلہ طے کر لیا۔
میرے بدن میں جوانی کا خون تھا۔ تھکاوٹ بالکل محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن رات
بھر پیدل چلنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ میں نے سوچا مجھے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلنا
چاہیے۔ تاکہ اگر کسی سٹیشن پر جالندھر کی طرف جانے والی کوئی گاڑی نظر آئے تو اس
میں سوار ہو جاؤں۔ ریل گاڑی کا ٹکٹ میرے پاس ہی تھا۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ
ریلوے لائن کس طرف ہے۔ میں جی ٹی روڈ سے ہٹ کر کھیتوں میں آگیا۔ فصل اونچی
نہیں تھی۔ مجھے کسی سگنل کی بتی کی تلاش تھی۔ میں کھیتوں میں چلتا رہا۔

کوئی آدھا گھنٹہ چلنے کے بعد مجھے دور ریلوے سگنل کی سرخ بتی نظر آئی۔ میں ا
طرف چلنے لگا۔ وہاں سے ریلوے لائن زیادہ دور نہیں تھی۔ ریل کی پٹڑی زمین سے ز
اونچی تھی۔ میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ کچھ اندازہ نہیں کہ میں کتنی
تک چلا ہوں گا۔ مجھے تھکاوٹ محسوس ہونے لگی۔ جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ ا
تک کوئی سٹیشن بھی نہیں آیا تھا۔ میں سانس لینے کی خاطر ریلوے لائن کے پاس بیٹھ گ
پیچھے سے ریل کے انجن کی سیٹی کی آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ دور انجن کی لائ
چمک رہی تھی۔ میں لائن سے نیچے اتر گیا۔ تھوڑی دیر بعد ریل گاڑی شور مچاتی گزر گ
جب تک ٹرین کی پچھلی لال بتی میری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گئی میں اسے دیکھتا
میں اس گاڑی کو نہیں پکڑ سکتا تھا۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اگلا سٹیشن کتنی دور ہ
جب تھکاوٹ کچھ دور ہوئی تو میں اٹھ کر لائن کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ یہ اطمینان ض
تھا کہ میں امرتسر پولیس کے چنگل سے نکل آیا تھا۔ رات بڑی خاموش تھی۔ آسمان
تارے چمک رہے تھے۔ راستے میں ایک بڑی نہر کا پل آیا۔ میں نے لائن کے درمیان
سے سنبھل سنبھل کر پاؤں رکھتے ہوئے پل عبور کیا۔ دور کھیتوں میں کسی گاؤں کی دو
بتیاں جلتی نظر آئیں۔ پھر یہ گاؤں بھی گزر گیا۔ میں چلتے چلتے واقعی تھک گیا تھا۔ میں
سوچا کہ کوئی محفوظ سی جگہ دیکھ کر باقی رات وہاں آرام کرنا چاہیے۔ جب صبح ہو تو ان
روشنی میں سفر کرنا چاہیے۔

اندھیرے میں سوائے کھیتوں پر پھیلی ہوئی دھندلی سی تاریکی کے اور کچھ نظر نہیں
تھا۔ میں ایک جگہ تھک کر بیٹھ گیا۔ میری آنکھیں اب اندھیرے کی عادی ہو چکی تھی
میں نے دیکھا کہ ریلوے لائن کے نشیب میں ایک چبوترہ سا بنا ہوا ہے۔ میں ڈھلا
سے اتر کر وہاں آ گیا۔ یہ چبوترہ پکی اینٹوں کا بنا ہوا تھا اور چھوٹا سا تھا۔ پتہ نہیں یہ کس
بنوایا ہوا تھا۔ بہر حال رات بسر کرنے کے لئے یہ اچھی جگہ تھی۔ پنجاب میں مارچ ا
کے دنوں میں راتیں خشک ہوتی ہیں۔ میرا بدن گرم تھا۔ میں چبوترے کے فرش پر ہا
سر رکھ کر لیٹ گیا۔ جب ذرا بدن کی گرمی دور ہوئی تو سردی محسوس ہونے لگی۔ میں

گھٹنے اپنی چھاتی کے ساتھ لگا لئے اور گیند سا بن کر آنکھیں بند کر لیں۔ بہت تھکا ہوا تھا۔
نیند نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔

آنکھ اس وقت کھلی جب ایک ریل گاڑی شور مچاتی لائن پر سے گزری۔ میں نے
آنکھیں کھول کر دیکھا۔ آسمان پر صبح کا نور پھیلنے لگا تھا۔ پو پھٹ رہی تھی۔ میں اگرچہ دو
تین گھنٹے ہی سویا تھا مگر میری ساری تھکاوٹ دور ہو گئی تھی۔ میں نے کلمہ شریف پڑھ کر
منہ پر ہاتھ پھیرا اور آگے روانہ ہو گیا۔ میں ریلوے لائن سے ہٹ کر کھیتوں کے ساتھ
ہو کر چل رہا تھا۔ دن کی سفیدی آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی۔ پھر سورج نکل آیا۔ دور
تک کھیت ہی کھیت تھے۔ کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ بھی دکھائی دے رہے تھے۔ بائیں
جانب کافی فاصلے پر ایک گاؤں آیا۔ میں آگے نکل گیا۔ یہ سارے گاؤں سکھوں کے ہی ہو
سکتے تھے۔ ظاہر ہے وہاں کوئی مسلمان گھر نہیں تھا۔ میں کسی گاؤں میں نہیں جا سکتا تھا حیرانی
کی بات تھی کہ ابھی تک کوئی سٹیشن نہیں آیا تھا۔

میں کافی دیر تک چلتا رہا۔ کھیت ختم ہو گئے تو ویران زمین کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک
چھوٹی سی ندی آئی جس کے کنارے کیکر کے درخت تھے۔ میں نے کیکر کی ایک شاخ توڑ
کر اس کی مسواک بنائی۔ اس سے دانت صاف کئے۔ ندی کے پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔
تھوڑا سا پانی بھی پیا۔ اس کے بعد دوبارہ آگے چل پڑا۔ کہیں کہیں سکھ ہندو کسان کھیتوں
میں ہل چلاتے نظر آ رہے تھے۔ مگر وہ مجھ سے کافی دور تھے۔ دور سے ایک گڈ آتی نظر
آئی۔ میں ایک درخت کی اوٹ میں چھپ گیا۔ گڈ چارے سے لدی ہوئی تھی۔ اس پر
ایک سکھ بیٹھا تھا۔ گڈ کے آگے دو بیل جتے ہوئے تھے۔ جب گڈ گزر گئی تو میں درخت کی
اوٹ سے نکل آیا۔ اب پھر کھیت شروع ہو گئے تھے۔ ایک جگہ دور رہٹ چل رہا تھا۔
رہٹ کی روں روں کی آواز آ رہی تھی۔ میں چلتا گیا۔ ایک گاؤں آ گیا جو کافی بڑا لگتا تھا۔ کچے
مکانوں کی سفید سفید دیواریں اور ان پر جھکے ہوئے درخت دھوپ میں صاف نظر آ رہے
تھے۔ مگر یہ گاؤں مجھ سے کافی فاصلے پر تھا۔ میں اس گاؤں سے کترا کر آگے نکل گیا۔
مجھے بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ مگر وہاں میں کسی سے کھانے پینے کو طلب نہیں

کر سکتا تھا۔ یہ گاؤں بھی ظاہر ہے ہندو سکھوں کا ہی تھا۔ دھوپ کافی نکل آئی تھی اور
چلتے مجھے پسینہ آرہا تھا۔ وہاں کوئی سڑک یا راستہ تو تھا نہیں۔ میں کھیتوں کھیت چل رہا
کبھی چلتے چلتے ایک کھیت میں آجاتا۔ کبھی دوسرے کھیت کی مینڈھ پر چلنے لگتا۔ یہاں فصلیں
میرے قد کے برابر اونچی تھی۔ میں ایک کھیت کی مینڈھ پر سے گزر رہا تھا۔ میری
ست ہو گئی تھی۔ مجھے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی سے باتیں کر رہی تھی۔
وہیں رک گیا۔ یہ عورت کسی بچے کو کچھ کہہ رہی تھی۔ میں وہیں سے واپس مڑنے
تھا کہ میرے قدم اپنے آپ رک گئے۔ اصل میں اس عورت نے جو
ایک ایسا جملہ بول دیا تھا جس نے میرے قدم روک دیئے تھے۔ اس عورت نے
زبان میں کہا تھا۔

"کہو پتر لا الہ الا اللہ........"

ساتھ ہی کسی آٹھ نو سال کے لڑکے نے کہا۔

"لا الہ الا اللہ........"

میں حیران سا ہو کر وہیں کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا یہ مسلمان عو
کہاں سے آگئی ہے اور یہ اپنے بیٹے کو کھیتوں میں بٹھا کر کلمہ شریف کیوں پڑھا رہی
مشرقی پنجاب میں جتنے مسلمان خاندان آباد تھے انہیں سن 1947ء میں ہندو سکھوں نے
کر دیا تھا اور جو بچ گئے تھے وہ بھاگ کر پاکستان آگئے تھے۔ یہ مشرقی پنجاب کا علاقہ
یہاں کسی مسلمان گھرانے کا موجود ہونا ناممکن بات تھی۔ میں کان لگا کر سننے لگا۔ وہ عو
اپنے بیٹے کو کلمہ شریف پڑھنا سکھا رہی تھی۔ میں نے فصل میں سے دیکھنے کی کوشش
مگر فصل اتنی گھنی تھی کہ مجھے وہ عورت نظر نہیں آرہی تھی۔ فصل اونچی بھی
میرے سامنے کھیت کی مینڈھ دور تک چلی گئی تھی۔ میں مینڈھ سے ایک طرف ہٹ
فصل کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھا تھا۔

عورت نے تین چار مرتبہ لڑکے کو کلمہ شریف یاد کرایا اور پھر کہا۔

"جا پتر اب سکول جا۔ دیر نہ ہو جائے"

مجھ سے کوئی پچاس گز دور ایک جگہ سے فصل کے پودے ایک طرف ہٹے اور فصل
کے اندر سے ایک سات آٹھ سال کا لڑکا باہر نکلا جس نے قمیض اور نیکر پہن رکھی تھی۔
یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ لڑکا سکھ تھا۔ اس کے سر پر پگڑی تو نہیں تھی لیکن اس نے
بالوں کا جوڑا سر کے اوپر بنا کر جوڑے کو رومال سے باندھا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے وہ
عورت بھی کھیت سے باہر نکل آئی جو اس سکھ لڑکے کو کلمہ شریف یاد کرا رہی تھی۔
میرے لئے یہ عجیب و غریب لمحہ تھا جس کو میرا دماغ حل نہیں کر سکا تھا۔ سکھ لڑکے کے
گلے میں سکول کا بستہ لٹک رہا تھا۔ وہ ایک جگہ اپنی ماں سے جدا ہو کر دوسرے کھیت کی
طرف چل دیا۔ اس کا اسکول اس طرف ہوگا۔ اب مینڈھ پر وہ عورت اکیلی جا رہی تھی۔
وہ شلوار قمیض میں تھی۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ اس بات سے بھی مجھے حوصلہ ہوا کہ یہ
عورت مسلمان ہے اس سے مجھے نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

میں جلدی اٹھا اور عورت کے پیچھے تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ عورت دوسرے
کھیت کی طرف مڑنے لگی تو میں نے اسے آواز دے کر کہا۔

"بہن جی! ذرا رکنا"

عورت وہیں رک گئی۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور سر پر دوپٹہ ٹھیک
کرنے لگی۔ میں نے اس کے قریب جا کر اسے اسلام علیکم کہا تو وہ مجھ سے بھی زیادہ حیران
ہو کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اسے زیادہ سوچنے کا موقع نہ دیا۔ میں نے پنجابی میں
کہا۔

"بہن جی! میں بھی مسلمان ہوں"

میں نے کلمہ شریف پڑھ دیا اور کہا۔

"بہن جی! یہ راز میری سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ کا بیٹا سکھ ہے اور آپ اسے
کلمہ شریف یاد کرا رہی تھیں۔"

میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ میں فصل میں چھپ کر ان ماں بیٹے کی باتیں سن رہا
تھا۔ عورت کی عمر تیس بتیس سال کے قریب ہوگی۔ رنگ صاف تھا اور چہرے پر ایک

عجیب سی اداسی کا تاثر تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

"تم مسلمان ہو تو یہاں کیسے آ گئے ہو"

میں نے کہا۔

"بہن جی! میں پاکستان سے ویزا لگوا کر امرتسر آیا تھا۔ ریل گاڑی میں بیٹھ کر دلی جا رہا تھا۔ راستے میں ایک سٹیشن پر گاڑی رکی۔ میں پانی پینے کے لئے اترا اور گاڑی چل دی۔ اب پیدل ہی اگلے اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا کہ ذرا سیر بھی ہو جائے گی اور اگلے سٹیشن پر دوسری گاڑی بھی پکڑ لوں گا۔ کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے آپ کی آواز سنی کہ آپ کسی لڑکے کو کلمہ شریف یاد کرا رہی تھیں۔ میں وہیں رک گیا۔ میں ابھی تک حیران پریشان ہوں کہ آپ سکھ عورت ہیں مگر اپنے بیٹے کو مسلمانوں کا کلمہ شریف یاد کراتی ہیں۔ یہ کیا راز ہے؟"

اتنا میرے دل کو یقین تھا کہ یہ عورت مسلمان ہے۔ کیونکہ کسی سکھ عورت ضرورت ہے کہ وہ اپنے سکھ بیٹے کو اسلام کا کلمہ یاد کرائے۔ لیکن میں نے اپنے اس کو اس پر ظاہر نہ کیا اور سے یہی کہا کہ وہ سکھ عورت ہو کر اپنے بیٹے کو کلمہ پاک کیوں کرا رہی تھی۔ عورت کی نظریں میرے چہرے پر جمی تھیں۔ اس نے میرے سوال جواب دینے کی بجائے مجھ سے سوال کیا۔

"کیا تم پاکستان سے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ یہ میرا پاسپورٹ دیکھ لو"

اور میں نے اسے پاسپورٹ نکال کر دکھایا۔ عورت پڑھی لکھی لگتی تھی۔ اس پاکستانی پاسپورٹ کو غور سے دیکھا۔ پھر اس پر لگی ہوئی میری تصویر دیکھی۔ پھر پاسپورٹ سامنے چوم کر آنکھوں سے لگایا جب اس نے پاسپورٹ مجھے واپس کیا تو اس کی آنکھوں میں تھے۔ معمہ اور پیچیدہ ہو گیا تھا۔ میں چپ کھڑا اس کو تک رہا تھا۔ عورت نے دوپٹے آنسو پونچھے۔ ایک نظر پیچھے کھیتوں کی طرف دیکھا اور اداس لہجے میں کہا۔

"وہاں آ جاؤ بھائی"

وہ مجھے فصل کے اندر لے گئی۔ یہاں تھوڑی سی کھلی جگہ تھی۔ وہ بیٹھ گئی۔ میں بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اب اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لئے اور سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ میں پریشان ہو گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو میں یونہی اسے تسلیاں دینے لگا۔ رونے سے جب اس عورت کے دل کا غبار ذرا دھلا تو وہ کہنے لگی۔

"میں سکھ نہیں ہوں۔ میں مسلمان ہوں۔ مگر ایک سکھ کی بیوی بنا دی گئی ہوں"

میں دم بخود سا ہو کر رہ گیا۔ تب اس بدنصیب مسلمان عورت نے اپنی جو دردناک کہانی سنائی وہ میں آپ کو اپنے لفظوں میں سناتا ہوں۔ جب پاکستان کے قیام کا اعلان ہوا تو مشرقی پنجاب میں ہندو سکھوں نے مل کر مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کے گھروں کو جلا دیا۔ انہیں بے دردی سے قتل کیا گیا۔ ان کے بچوں کو نیزوں پر اچھالا گیا۔ مسلمان عورتوں کو اغوا کر لیا گیا۔ ہر طرف مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ جو مسلمان کسی طرح جانیں بچا کر قافلوں کی شکل میں پاکستان کی طرف چلے انہیں بھی معاف نہیں کیا گیا۔ پاکستان کی سرحد تک پہنچتے پہنچتے جگہ جگہ سکھوں نے ان پر حملہ کئے۔ نوجوان لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے۔ اس عورت کا نام رضیہ بانو تھا۔ وہ بتاتی ہے کہ ان کا گھر کرتار پورہ کے قصبے میں تھا۔ جب فسادات شروع ہوئے تو اس وقت رضیہ بانو کی عمر سولہ سترہ سال کی تھی۔ اس کے دو چھوٹے بھائی بھی تھے۔ ایک ماں تھی۔ باپ تھا۔ سکھوں نے قصبے کے مسلمانوں پر اچانک حملہ کر دیا۔ رضیہ بانو کا باپ اپنی بیوی اور بچوں کو لے کر گھر سے بھاگا۔ سکھوں نے اس کا پیچھا کیا۔ رضیہ بانو کا بیان ہے کہ سکھوں نے اس کے اس کے ماں باپ اور دو چھوٹے بھائیوں کو کرپانیں مار مار کر شہید کر دیا۔ وہ بے ہوش ہو گئی۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ ایک سکھ کے گھر میں تھی۔ یہ سکھ اسے اغوا کر کے لے آیا تھا۔ پہلے تو ایک سال تک اس نے رضیہ کو ویسے ہی گھر میں ڈال رکھا۔ پھر اس سے سکھوں کے رواج کے مطابق شادی کر لی۔ رضیہ کے تین بچے پیدا ہوئے جو دو چار

چار سال کی عمر تک پہنچ کر مرگئے۔ پھر یہ لڑکا پیدا ہوا جس کا نام باپ نے بشن سنگھ رکھ
رضیہ بانو نے بتایا کہ میرے ساتھ قسمت نے جو کچھ کرنا تھا وہ ہوگیا تھا۔ مگر میں چاہتی تھ
کہ میرا بچہ سکھ نہ بنے وہ مسلمان بن کر زندگی گزارے۔ چنانچہ اس نے اپنے سکھ خاو
سے چھپ کر اسے نماز پڑھنی اور کلمہ شریف پڑھنا بھی سکھا دیا تھا۔ رضیہ کہہ رہی تھی۔

"میں نے اپنے سکھ بیٹے کا خفیہ نام غلام علی رکھا ہے۔ لڑکا مجھ سے بڑی محبت کرتا ہے۔ میں نے اسے نماز پڑھنی بھی سکھا دی ہے۔ جب ہم گھر میں اکیلے ہوتے ہیں تو وہ میرے ساتھ مل کر دو نفل بھی ادا کرلیتا ہے۔ میں اسے باقاعدہ نماز نہیں پڑھا سکتی۔ اس کا سکھ باپ بڑا ظالم اور متعصب سکھ ہے۔ ہم نے یہ بات اس سے چھپا کر رکھی ہوئی ہے۔ میرے بیٹے نے کلمہ شریف کے علاوہ الحمد شریف بھی مجھ سے سیکھ کر زبانی یاد کر رکھی ہے۔ مگر میں ہر روز جب وہ اسکول جاتا ہے تو اس کے ساتھ یہاں تک آتی ہوں اور راستے میں اسے کلمہ شریف یاد کراتی رہتی ہوں۔ میرا بیٹا اندر سے پورا مسلمان بن چکا ہے۔ اب میری زندگی کی صرف ایک ہی خواہش ہے کہ کسی طرح اپنے بیٹے کو لے کر پاکستان جاؤں اور پھر وہاں سے کبھی واپس نہ آؤں۔ مگر میرا خاوند مجھے پاکستان کا نام تک نہیں لینے دیتا۔"

پھر اس نے ہندو سکھ عورتوں کی طرح میرے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"بھائی! میرے بیٹے کو کسی طرح پاکستان پہنچا دو۔ میں تمہارا احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گی"

میں اس مسلمان عورت کی الم ناک داستان سن کر سکتے میں آگیا تھا۔ میرے سا
ایک ایسی مظلوم عورت ہاتھ جوڑے بیٹھی تھی جس نے اپنے ماں باپ بھائیوں کو ہی ن
اپنی عزت کو بھی پاکستان پر قربان کر دیا تھا۔ یہ سن سنتالیس میں مشرقی پنجاب میں
سکھوں کے ہاتھوں اغواہ شدہ ایک مسلمان عورت کا المیہ نہیں تھا۔ بلکہ ایسی ہزار
لاکھوں مسلمان عورتوں کا المیہ تھا جو نہ جانے بھارت کے دیش میں کافروں کے دیش

کہاں کہاں کیسی کیسی ذلت کی زندگیاں بسر کر رہی تھیں۔ یا مرکھپ گئی تھیں میں قوم کی ان بدنصیب بیٹیوں کی تصویر پاکستان کی نئی نسل کے نوجوانوں کو دکھانا چاہتا ہوں جو وی سی آر پر بھارتی فلموں کے گانے لگا کر رقص کرتے ہیں۔ یہ عورت جو کبھی ایک غیرت مند باپ کی مسلمان بیٹی رضیہ بانو تھی' اب کلدیپ کور کے نام سے اپنی کوکھ سے ایک سکھ لڑکے بشن سنگھ کو جنم دے کر پال رہی تھی اور چھپ چھپ کر اسے قرآن شریف پڑھا رہی تھی' نماز پڑھا رہی تھی اور کلمہ شریف یاد کرا رہی تھی۔ اور میرے آگے رو رو کر ہاتھ جوڑ کر کہہ رہی تھی کہ میرے بچے کو کسی طرح پاکستان پہنچا دو میں تمہاری احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گی۔

میں نے اپنے ہاتھ سے رضیہ بانو کے ہاتھ نیچے کر دیئے اور کہا۔

"میری بہن! اگر یہ بات میرے اختیار میں ہوتی تو میں ابھی تمہیں اور تمہارے بیٹے کو یہاں سے نکل کر پاکستان لے جاتا۔ مگر میری بہن یقین کرنا میں مجبور ہوں۔ خواہش کے باوجود ایسا نہیں کر سکتا۔ لیکن اس بات کا تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر کبھی ایسا وقت آیا تو میں تمہارے پاس آؤں گا اور تمہارے ساتھ تمہارے بچے کو بھی پاکستان پہنچادوں گا۔ مجھے معاف کر دینا میری بہن!"

رضیہ بانو عرف کلدیپ کور کے چہرے پر ایک ایسا غم' ایسی اداسی چھاگئی تھی کہ جو صدیوں کا غم اور صدیوں کی اداسی لگتی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

"تم یہاں بیٹھو میں تمہارے لئے کچھ کھانے کو لاتی ہوں"

میں نے قوم کی اس بدنصیب بیٹی کے پاؤں کو ایک ہاتھ سے چھو کر وہ ہاتھ اپنی آنکھوں پر لگایا اور اٹھتے ہوئے کہا۔

"زندگی رہی تو ایک بار بہن تمہارے پاس ضرور آؤں گا۔"

یہ کہہ کر میں فصل میں سے نکل کر کھیت کی مینڈھ پر آیا اور ریلوے لائن کی طرف چل پڑا۔ میرا دل پاکستان کی اس مظلوم بہن کے غم میں ڈوبا ہوا تھا۔ کتنی دیر تک میں چلتا

گیا۔ مجھے کچھ پتہ نہ چل سکا کہ میں کہاں سے کہاں آگیا ہوں۔ جب اپنے ہوش وحواس میں آیا تو دیکھا کہ میں ایک ریلوے پھاٹک کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ ریل کا پھاٹک بند تھا۔ گاڑی آنے والی تھی۔ پھاٹک کی دونوں جانب کچی سڑک پر ایک دو ریڑھے کھڑے تھے۔ ایک سکھ بھینس کا رسا ہاتھوں میں تھامے بھینس کو ریلوے لائن پار کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دور سے ریل کے انجن نے سیٹیاں دینی شروع کر دیں۔ پھاٹک والے نے شور مچا دیا۔ سکھ اتنی دیر میں بھینس کو لائن پار کرا چکا تھا۔ اس بار گاڑی جالندھر دلی کی طرف سے آرہی تھی۔ میں پھاٹک سے کچھ دور ہی کھڑا ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ٹرین آگئی۔ اس کا انجن کوئلے سے چلنے والا انجن تھا۔ ابھی تک میں نے انڈیا میں ریل گاڑیوں کے آگے لگے ہوئے کوئلے سے چلنے والے انجن ہی دیکھے تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ چونکہ انڈیا میں کوئلہ کئی مقامات سے نکالا جاتا ہے اس لئے زیادہ تر ریل گاڑیاں کوئلے کے انجنوں سے ہی چلتی ہیں۔ ٹرین شور مچاتی لائن کے دونوں طرف گرد اڑاتی گزر گئی۔ سورج کافی اوپر آچکا تھا اور چلتے وقت دھوپ مجھے چبھنے لگی تھی۔ میں نے سوچا کہ اس طرح کب تک پیدل چلتا رہوں گا۔ میں امرتسر والی خطرے کی فضا سے کافی دور نکل آیا ہوں۔ بہتر ہے کہ میں جی ٹی روڈ پر واپس چلا جاؤں اور وہاں سے کسی ٹرک یا بس میں بیٹھ کسی اگلے شہر پہنچ جاؤں۔ وہاں سے پھر میں ٹرین پکڑ لوں گا۔ چنانچہ میں ریلوے پھاٹک سے کچی سڑک پر ہو گیا۔

یہ دیہاتی علاقہ تھا۔ کسی کو کیا پتہ کہ میں کون ہوں اور کہاں جا رہا ہوں۔ میرا لباس ہی ایسا تھا کہ لگتا تھا شہر سے کوئی لڑکا گاؤں اپنے عزیزوں سے ملنے آیا ہے یا مل کر واپس جا رہا ہے۔ کچی سڑک کھیتوں میں دو چار موڑ کاٹنے کے بعد جالندھر کی طرف جاتی جی ٹی روڈ پر نکل آئی۔ یہاں ایک جانب مجھے درخت کے نیچے بوڑھا سکھ نظر آیا جو چھابے میں ناگ پوری سنگترے رکھے بیچ رہا تھا۔ اس قسم کا ایک سنگترہ میں نے سید صاحب کے ہاں کھایا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ یہ ناگپور کا سنگترہ ہے مگر ساتھ ہی کہا تھا کہ پاکستان کے کنوؤں نے بھارت کے ناگ پوری سنگترے کو مات کر دیا ہے۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی اور پیاس

بھی محسوس ہو رہی تھی۔ پہلے سوچا کہ سکھ کے پاس نہیں جانا چاہیے۔ نہ جانے وہ کیا پوچھ بیٹھے اور کیا جواب منہ سے نکل جائے۔ پھر خیال آیا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ اسے کیا پتہ کہ میں کون ہوں۔ بھارتی کرنسی میرے پاس موجود تھی۔ میں سردار جی کے پاس چلا گیا اور پوچھا۔

"سردار جی سنگترے کیسے لگائے ہیں؟"

میں نے پنجابی میں بات کی تھی۔ سردار جی نے ایک سنگترہ اٹھا کر میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

"کھا کر دیکھو مہاراج"

میں نے کہا۔ "وہ تو میں دیکھ رہا ہوں کہ ناگپوری ہیں"

میں نے چار سنگترے اٹھا لئے اور پوچھا کہ کتنے پیسے دوں۔ سردار جی نے بے نیازی سے اپنی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ایک روپیہ دے دو"

میں نے اسے ایک روپے کا نوٹ دیا اور آگے چل دیا۔ میں اس جگہ سے کوئی سواری نہیں پکڑنی چاہتا تھا کیونکہ وہاں قصبے کا موڑ تھا اور ریڑھوں گڈوں وغیرہ کی آمد و رفت جاری تھی۔ میں چلتے چلتے جب کافی آگے نکل گیا تو ایک جگہ بیٹھ کر چاروں سنگترے کھا گیا۔ میری بھوک بھی کسی حد تک دور ہو گئی اور پیاس بھی مٹ گئی۔ میں سڑک کے کنارے ایک طرف کھڑا ہو کر کسی لاری وغیرہ کا انتظار کرنے لگا۔

ایک لاری آئی جو مسافروں سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے ہاتھ دیا مگر وہ نہ رکی۔ اس کے بعد ایک ٹرک آیا جس پر سامان لدا ہوا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ دیا مگر وہ بھی نہ رکا۔ دور سے ایک جیپ آتی نظر پڑی۔ میں سڑک سے ہٹ کر ذرا دور کھڑا ہو گیا۔ اس خیال سے کہ یہ کہیں پولیس وغیرہ کی جیپ نہ ہو۔ مگر یہ سویلین جیپ تھی۔ ایک سکھ سویلین کپڑوں میں اسے چلا رہا تھا۔

جیپ بھی گزر گئی۔ میں نے اسے ہاتھ نہ دیا۔ میں قدم قدم پیدل ہی چل پڑا۔

تھوڑی دور تک چلا ہوں گا کہ پیچھے ہارن کی آواز سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا ایک بس آرہی تھی۔ سڑک کے درمیان ایک گدھا آگیا تھا جس کے لئے ڈرائیور ہارن دے رہا تھا۔ دور سے میں بس کو پہچان نہ سکا۔ میں نے اسے ہاتھ دے دیا۔ بس خالی تھی۔ کھڑکیوں میں سلاخیں لگی تھیں۔ بس میرے قریب آکر رک گئی۔ یہ دیکھ کر میرا اوپر کا سانس اوپر ہی رہ گیا کہ بس کی پیشانی پر انگریزی میں پولیس لکھا تھا۔ یہ پولیس کی گاڑی تھی۔ سکھ ڈرائیور نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اندر بلاتے ہوئے کہا۔

"آجاؤ باؤ آجاؤ"

سکھ ڈرائیور سویلین کپڑوں میں تھا۔

ظاہر ہے کہ وہ پولیس کا آدمی ہی ہوگا۔ یہ بس تھانے سے حوالاتیوں کو عدالت میں لانے لے جانے کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ میں بھاگ جانا چاہتا تھا مگر بھاگنے کا مقام نہیں تھا۔ سکھ ڈرائیور نے دو تین بار ہارن دے کر اونچی آواز میں کہا۔

"آجاؤ باؤ آجاؤ اندر۔۔۔۔۔کہاں جانا ہے"

اس نے اپنے ساتھ والی کھڑکی کھول دی۔ میں اندر جاکر بیٹھ گیا۔ بس آگے چل پڑی۔ سکھ ڈرائیور ہنس مکھ قسم کا آدمی تھا۔ کہنے لگا۔

"باؤ تم پولیس کی گاڑی دیکھ کر شاید ڈر گئے تھے۔ فکر کرنے کوئی بات نہیں۔ یہ گاڑی ضرور پولیس کی ہے مگر میں پولیس کا آدمی نہیں ہوں۔"

اس نے بتایا کہ امرتسر میں اس کا موٹر ورکشاپ ہے۔ یہ گاڑی جالندھر سٹی پولیس کی ہے۔ اور رنگ کے لئے اس کے پاس امرتسر آئی ہوئی تھی اور اب وہ اسے واپس جالندھر لے جارہا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

کہاں جاؤ گے باؤ؟

تمہارا نام کیا ہے؟

کیا کام کرتے ہو؟

ایک ہی سانس میں اس نے مجھ سے تین سوال پوچھ لئے تھے۔ میں نے اس قسم کے

سوالوں کے جواب پہلے سے ہی سوچ کر اپنے ذہن میں کمپیوٹر کی طرح فیڈ کر رکھے تھے۔ میں نے اسے اپنا ایک فرضی ہندووانہ نام بتایا اور کہا کہ میں امرتسر کے کالج میں پڑھتا ہوں جالندھر اپنے ایک دوست کے پاس جا رہا ہوں۔

"فکر کی کوئی گل ہی نہیں ہے۔ سمجھو جالندھر پہنچے کہ پہنچے۔ میں جی ٹی روڈ پر سٹھ میل سے گھٹ کبھی گاڑی نہیں چلاتا۔"

سامنے ایک گائے آ گئی۔ سکھ ڈرائیور نے اسے گالی دی اور بریک لگا کر ہارن پر ہارن دینے لگا۔ وہ گائے کو گالیاں دیتا کچے پر سے گاڑی نکال کر آگے لے گیا۔ جالندھر وہاں سے زیادہ دور نہیں رہ گیا تھا۔ مجھے تب پتہ چلا کہ میں امرتسر سے پیدل چلتے ہوئی دس پندرہ میل کا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی جالندھر شہر کی آبادی شروع ہو گئی۔ ہر طرف سکھ ہی سکھ نظر آ رہے تھے۔ اس سے پہلے میں نے اتنے سکھ کبھی نہیں دیکھے تھے جالندھر شہر بھی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ بس پولیس سٹیشن جائے گی۔ میں نے سکھ ڈرائیور سے ایک جگہ رکنے کے لئے کہا۔ "بس سردار جی! میں یہیں اتروں گا"

میں نے سردار جی کا شکریہ ادا کیا اور بس سے اتر گیا۔ یہاں سے مجھے ریلوے سٹیشن جانا تھا۔ میں نے ایک سائیکل رکشا دیکھا جو خالی تھا۔ میں اس میں بیٹھ گیا اور اسے ریلوے سٹیشن چلنے کو کہا۔ سائیکل رکشے والا بوڑھا سکھ تھا۔ وہ آہستہ آہستہ رکشا چلاتا ایک طرف کو چل پڑا۔ کئی بازار آئے اور گزر گئے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تمہیں معلوم سردار جی دلی جانے والی گاڑی کس وقت چلتی ہے۔ رکشا والے سکھ نے ہانپتے ہوئے کہا

"پتہ نہیں جی۔ ٹیشن پر جا کر پتہ کریں"

جالندھر ریلوے سٹیشن کی ایک طرف رکشا رک گیا۔ یہاں کافی لوگ تھے۔ میں چھ امرتسر سے کافی دور نکل آیا تھا مگر میں ابھی تک پنجاب میں تھا اور اپنے آپ خطرے سے محفوظ نہیں سمجھ رہا تھا اس لئے بڑی احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ ٹکٹ جیب میں تھا۔ ایک قلی سے پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ دلی جانے والی ٹرین شام کو چھ بجے گی۔ اس وقت ابھی دن کا ایک بھی نہیں بجا تھا۔ اتنا وقت گزارنا میرے لئے ایک

مسئلہ تھا۔ سب سے پہلے تو میں نے سٹیشن کے سامنے ایک دکان میں بیٹھ کر دال روٹی کھائی۔ پھر سٹیشن کے سامنے والے بازار میں ہی ادھر ادھر پھرنے لگا۔ ایک جگہ سینما نظر پڑا۔ ایکٹر ایکٹرسوں کے بڑے بڑے بورڈ لگے تھے۔ معلوم ہوا کہ اس سینما ہاؤس میں صبح دس بجے سے لے کر رات کے بارہ ایک بجے تک مسلسل فلم چلتی ہے۔ اس وقت بھی کوئی فلم چل رہی تھی۔ میں نے ٹکٹ لیا اور سینما ہاؤس میں آ کر بیٹھ گیا۔ یہاں میں بڑے سکون سے وقت گزار سکتا تھا۔

کوئی انڈین فلم لگی تھی۔ نام مجھے یاد نہیں رہا۔ مجھے فلم میں کام کرنے والے ایکٹروں سے کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی۔ میں تو وقت گزارنے وہاں آیا تھا۔ آنکھیں سکرین پر فلم دیکھ رہی تھیں اور دماغ اپنے مشن کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے اس بات کا بھرپور احساس تھا کہ میں دشمن ملک انڈیا میں ہوں جو پاکستان کا دشمن نمبر ایک ہے اور جس نے پاکستان کے جائز وجود کو کبھی دل سے تسلیم نہیں کیا۔ میں یہی چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے ہردہ ضلع ہوشنگ آباد کے جنگلوں میں مجاہد کمانڈو کمال شاہ کے پاس پہنچوں۔ ان سے فوجی کمانڈو کی ٹریننگ حاصل کروں اور پھر کشمیر میں آکر حریت پرست کشمیریوں کے شانہ بشانہ بھارتی فوج کے خلاف لڑوں اور کافروں کو مارتا ہوا شہید ہو جاؤں اور اگر شہادت کا رتبہ حاصل نہ کر سکوں تو جب تک مقبوضہ کشمیر بھارتی ظلم و استبداد کے شکنجے سے آزاد نہیں ہو جاتا اس وقت تک کافروں سے جنگ کرتا رہوں اور جب مقبوضہ کشمیر آزاد ہو جائے تو واپس پاکستان جا کر اپنے باپ کی قبر پر فاتحہ پڑھوں اور پھر بلند آواز میں کہوں۔

میاں جی! کشمیر آزاد ہو گیا ہے۔ میں نے آپ سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا ہے۔"

مجھے پتہ ہی نہ چلا اور فلم ختم ہو گئی۔ میں یہی سمجھا کہ فلم ختم ہو گئی ہے مگر معلوم ہوا کہ انٹرول ہوا ہے۔ پہلے سوچا کہ اندر سینما ہال میں ہی بیٹھا رہوں۔ پھر خیال آیا کہ باہر نکل کر چائے پینی چاہیے۔ حالانکہ مجھے چائے کی طلب کبھی نہیں ہوئی تھی۔ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ تقدیر میں جو کچھ لکھا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے میں بھی کسی غیبی طاقت کے اشارے پر اٹھا اور سینما ہال کے باہر آ گیا۔ باہر دن کی روشنی تھی۔ ابھی کتنا دن باقی تھا۔ مجھے شام

کے ساڑھے پانچ بجانے تھے۔ کیونکہ جالندھر سے دلی جانے والی گاڑی شام کے چھ
چلتی تھی۔

سینما کے احاطے کے اندر ہی ایک طرف دیوار کے ساتھ چائے پان سگریٹ
دکانیں تھیں۔ میں ایک دکان کے پاس کھڑے ہو کر چائے پینے لگا۔ چائے پینے کے بعد
نے جیب سے پیسے نکال کر چائے والے کو دیئے اور پان سگریٹ کے کھوکھے والے
طرف بڑھا۔ میں سگریٹ کا عادی نہیں ہوں مگر کبھی کبھی چائے پینے کے بعد سگریٹ پینے
جی چاہتا ہے۔ میں نے پان سگریٹ کے کھوکھے کی طرف قدم اٹھایا ہی تھا کہ کسی نے
سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ میرے سامنے ایک
کانسٹیبل کھڑا تھا۔ اس کی ساتھ ایک سویلین کپڑوں والا آدمی بھی تھا جو سکھ نہیں
یقیناً ہندو ہوگا اور خفیہ پولیس کا آدمی ہی ہو سکتا تھا۔ ایک لمحے کے لئے میں کانپ
مگر فوراً میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بڑے اعتماد سے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

سکھ کانسٹیبل اور خفیہ پولیس والا دونوں میری طرف گھور کر دیکھ رہے تھے
کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی سکھ کانسٹیبل نے میری آنکھوں میں
ڈالے پوچھا۔

"کون ہو بھئی تم؟"

میں نے یونہی کہہ دیا۔ "بھگوان کا بنایا ہوا آدمی ہوں۔ تمہیں نظر نہیں آ رہا؟"
ہندو خفیہ پولیس والے نے میری گردن پر ہاتھ رکھ کر زور سے دباتے ہوئے پوچھا

"امرتسر کیا بسنے گئے تھے؟"

سکھ کانسٹیبل نے مجھے بازو سے پکڑ کر ایک طرف کھینچا اور گالی دے کر کہا۔

"ہمارے ساتھ تھانے چلو۔ سب پتہ چل جائے گا تم پاکستان سے یہاں کس لئے
آئے ہو۔ چلو"

اس نے مجھے آگے کو دھکا دیا۔ بس یہی سکھ کانسٹیبل کی غلطی تھی اور وہیں میں

جھپکتے ہی عقل سے کام لیا جیسے ہی دھکا کھا کر میں اس سے دو قدم آگے لڑکھڑایا وہیں
سیدھا ہو کر بجلی کی طرح اتنی زور سے اور اتنی تیزی سے بھاگا کہ مجھے خود پتہ نہ چل
کہ میں کب سینما ہال کے احاطے سے نکل کر بازار میں آیا اور بازار میں جاری ٹریفک
بچتا بچاتا اسی طرح دوڑتا دوڑتا کب دوسرے بازار میں پہنچ گیا۔ میرے پیچھے کانسٹیبل اور
کے ساتھی کے بھاگنے اور شور مچانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مگر یہ میری زندگی اور
کا سوال تھا۔ خدا جانے اسی وقت میری اندر اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی کہ میں
سے بھی زیادہ تیز رفتار کے ساتھ بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ جس کسی کے پاس سے گزرتا
اپنے آپ کو بچانے کے لئے پرے ہو جاتا اور مجھے راستہ دے دیتا اور میں اسے حیران
چھوڑ کر آگے نکل جاتا۔ مگر مجھے اپنے پیچھے لوگوں کے بھاگنے دوڑنے کی آوازیں
تک آ رہی تھیں۔ یہ آوازیں میرا پیچھا کر رہی تھیں جس کا مطلب یہ تھا کہ پولیس
تعاقب کر رہی تھی۔ میں دوڑتے دوڑتے ہانپنے لگا تھا۔ مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ
میں زیادہ دور تک نہیں دوڑ سکوں گا۔ اچانک میرے سامنے ریلوے پھاٹک آگیا۔
ریلوے پھاٹک بند تھا۔ ٹریفک رکی ہوئی تھی۔ میں نے بائیں جانب ایک نگاہ ڈالی تو ایک
گاڑی کو چھک چھک کرتے آتے دیکھا۔ میں اس قدر گھبرایا ہوا تھا کہ مجھے اتنا بھی
ہوش نہ رہا کہ میں ریل کے نیچے آ سکتا ہوں۔ میں نے دوڑ کر ریلوے لائن پار کر لی۔ عین
اسی لمحے ٹرین سیٹی پر سیٹی بجاتی شور مچاتی میرے پیچھے سے گزرنے لگی۔ اس ٹرین نے
اور پولیس کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی تھی۔ ٹرین بھی مال گاڑی تھی جو
لمبی تھی۔ میں نے دوڑنا بند کر دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا دوسرے پھاٹک کے پہلو میں
لوہے کی چرخی لگی تھی اس میں سے نکل گیا۔ کچھ لوگوں نے مجھے آواز بھی دی کہ پاگل
ہو تم؟ ریلوے پھاٹک کی دوسری طرف بھی کچھ گاڑیاں تانگے اور رکشے کھڑے
۔ مال گاڑی سست رفتار کے ساتھ کھڑکھڑ کرتی ابھی تک گزر رہی تھی۔
میں پیچھے دیکھے بغیر سامنے منہ کئے جا رہا تھا۔ کوئی ساٹھ ستر گز کے فاصلے پر سڑک کی
جانب درخت کے نیچے ایک لاری کھڑی تھی۔ لاری مسافروں سے بھری ہوئی تھی

ایک لڑکا لاری کے پچھلے دروازے کے پاس کھڑا آوازیں دے رہا تھا۔

"چلو اک سواری لدھیانہ"

مجھے معلوم تھا کہ لدھیانہ جالندھر کے بعد دوسرا بڑا شہر آتا ہے اور یہ دلی کو
جاتے ہوئے ہی آتا ہے۔ میں دوڑ کر بس میں سوار ہو گیا میرے بیٹھتے ہی بس چل
میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ایک بار پھر خطرہ ٹل گیا تھا۔ بس جی ٹی روڈ پر دوڑتی چلی
تھی۔ ہندو سکھ سواریاں لدی ہوئی تھیں۔ عورتیں بھی بچوں کو لئے بیٹھی تھیں۔
میں سڑک کے کنارے کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں آئے اور گزر گئے۔ ایک چھوٹا
آگیا۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں رہا۔ یاں بس کچھ دیر رکی اور پھر آگے روانہ ہو گئ
علاقے میرے لئے بالکل نئے تھے۔ دن کی روشنی کم ہونی لگی تھی۔ سورج مغر
طرف غروب ہونا شروع ہو گیا تھا۔ بس راستے میں جگہ جگہ رکنے لگی۔ کوئی سواری
پر ہاتھ دیتی تو بس کھڑی ہو جاتی۔ مجھے بڑی الجھن ہو رہی تھی۔ مجھے یہی خطرہ لگا
جالندھر پولیس نے آگے ریلوے سٹیشنوں اور چھوٹے شہروں اور قصبوں کے تھا
ضروری ٹیلی فون پر خبر کر دی ہوگی کہ ایک پاکستانی جاسوس پولیس کی حراست سے
ہو گیا ہے۔ پولیس نے ان لوگوں کو میرا حلیہ بھی بتا دیا ہوگا۔ پکڑے جانے کا ڈر
ہوا تھا۔

کسی جگہ بس رکتی تو میں غور سے باہر کا جائزہ لیتا۔ میں نے ایک سواری سے پ
لدھیانہ کتنی دور رہ گیا ہے۔ وہ کوئی ہندو تھا۔ اس نے میری طرف غور سے د
پوچھا۔

"ماراج تم پہلی دفعہ لدھیانے جا رہے ہو؟"

میں نے کہا۔

"نہیں نہیں پہلے بھی ایک دوبار گیا ہوں۔ مگر ریل گاڑی پر گیا تھا۔"

وہ ہندو تھوڑی دیر مجھے گھورنے کے بعد باہر دیکھنے لگا۔ شام کا دھندلکا کھیتوں
اور آسمان کو اپنی لپیٹ میں لینے لگا۔ ایک بڑی نہر آئی۔ بس اس کے پل پر سے گ

وڑی دور جا کر بس کی رفتار ہلکی ہو گئی۔ پھر وہ سڑک کے کنارے پر ہو کر رک گئی۔
واریاں باہر دیکھنے لگیں۔ کسی نے ڈرائیور سے پنجابی میں پوچھا کہ کیا ہو گیا ہے۔ ڈرائیور
نے کہا۔

"پتہ کراتے ہیں۔ ساری گاڑیاں کھڑی ہیں"

مجھے خطرے کی بو محسوس ہونے لگی۔ میں نے کھڑکی میں سے گردن باہر نکال کر
دور تک لاریوں اور بسوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ ڈرائیور نے کلینر سے کہا۔

"جا اوئے پتہ کر کیہ گل اے؟"

کلینر بھی سکھ تھا وہ دوڑتا ہوا آگے گیا۔ سواریاں آپس میں باتیں کرنے لگیں۔ کسی
ا۔ شاید آگے کوئی پل ٹوٹ گیا ہے۔ کسی نے کہا۔ کوئی ٹکر ہو گئی ہوگی۔ اتنے میں
بھے واپس آتا نظر آیا۔ اس نے اونچی آواز میں کہا۔

"سردار! آگے پولیس چیکنگ کر رہی ہے"

میرا دل زور سے دھڑکا۔ ڈرائیور نے گالی دے کر پوچھا کہ کس چیز کی چیکنگ کر رہی
پلیس۔ کلینر بولا۔

"کہتے ہیں کوئی پاکستانی جاسوس بھاگ گیا ہے"

آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میری اندر سے کیا حالت ہوئی ہوگی۔ بظاہر میں بڑے
ان سے اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا اور اپنے چہرے سے بالکل ظاہر نہ ہونے دیا کہ میرے
کیا طوفان مچا ہوا ہے۔ اب مجھے وہاں سے بھاگنا تھا۔ ایک دم اٹھ کر بھاگنے سے لوگوں
ھ پر شبہ ہو سکتا تھا او وہ مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر سکتے تھے۔ میں ایک آدھ
بظاہر بڑے سکون کے ساتھ بیٹھا رہا۔ پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر اسے یونہی ٹٹولا اور
ر والی سواری سے پوچھا۔

"بھاپا جی آپ کے پاس ماچس ہوگی؟"

سواری نے نفی میں سر ہلایا تو میں یہ کہہ کر نیچے اتر گیا۔ کہیں سے ماچس تلاش کرتا
ا سگریٹ پینے کو جی چاہتا ہے۔ میں بس سے اتر کر دو قدم چل کر آگے گیا۔ پھر رک کر

ایسے دیکھنے لگا جیسے مجھے کسی پان سگریٹ کے کھوکھے کی تلاش ہو۔ اس کے بعد دشمنوں کے ساتھ لڑائی لڑی جارہی تھی۔ مجھے ہینڈ گرینڈ کا ہی نہیں پتہ تھا کہ اس کا پن
ٹہلتا اگلی لاری کے پاس چلا گیا۔ وہاں سے ٹہلتا ہوا دوسروں اور پھر تیسری لاری کے کھینچ لینے کے بعد اسے کتنی دیر تک اپنے ہاتھ میں رکھ کر دشمن پر پھینکنا ہوگا۔ میرے
میں آگیا۔ کچھ سواریاں سڑک پر اتر آئی تھیں اور پولیس والوں کو برا بھلا کہہ رہی تھیلئے فوجی کمانڈو کی ٹریننگ بڑی ضروری تھی۔ میں فوجی کمانڈو بن کر کشمیر کے محاذ پر لڑنے
یونہی جہاں چاہتے ہیں گاڑی کھڑی کروا کر چیکنگ کرنے لگتے ہیں۔ میں سڑک پار اور دشمن کے ٹھکانوں پر شب خون مار کر اسے برباد کرنے کے لئے بے تاب تھا لیکن
دوسری جانب جو درخت تھے ان کے نیچے آگیا۔ سڑک کی دوسری طرف جھاڑیاں اگارتی پولیس میرے راستے میں شدید رکاوٹ بن گئی تھی۔ بلکہ اس بات کا واضح خطرہ
تھیں۔ ان کے پیچھے کھیت تھے جو شام کے تیزی سے پھیلتے دھندلکے میں گم ہو رہے موجود تھا کہ اگر میں پکڑا گیا تو میری جہاد میں شامل ہو کر کافروں سے جنگ کرنے کی آرزو
میں ٹہلتا ٹہلتا جھاڑیوں کے پیچھے آگیا۔ یہاں ایک جگہ چھپ کر میں نے لاریوں اور خاک میں مل سکتی تھی۔
کی قطار کی طرف دیکھا۔ کوئی میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ میں دوڑ کر کھیتوں میں گھ انہیں خیالات میں ڈوبا ہوا میں کھیتوں سے باہر نکل کر ایک چھوٹی سی ندی کے
اور جتنی تیز چل سکتا تھا چلنے لگا۔ دوڑنا میرے لئے خطرناک ہو سکتا تھا۔ کیونکہ کنارے کنارے تیز تیز چل رہا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کدھر جارہا ہوں۔ اور
کھیتوں کی کٹائی ہو چکی تھی اور وہاں مجھے کچھ کسان بھی نظر آرہے تھے جو کٹی ہوئی فصآگے کہاں اور کس شہر میں نکل آؤں گا۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ میں بھارتی پنجاب کی
ایک طرف رکھ رہے تھے۔ میں نے ان سے دور رہ کر آگے نکل گیا۔ میں جی ٹی روپولیس سے کافی دور نکل چکا تھا۔ رات کا اندھیرا کھیتوں میدانوں میں اتر آیا تھا۔ میں نے
سمت سیدھا جانے کی بجائے بائیں جانب مغرب کی طرف ہو گیا تھا۔ تاکہ پولیس لندی کے کنارے ایک جگہ بیٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ پانی پیا۔ تھوڑا سا آرام کیا۔ جب سانس
ٹھیک ہوگیا تو ندی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ندی آگے جا کر اسی طرف گھوم گئی تھی جدھر
سکوں۔
ہر لمحے گہرا ہوتا ہوا اندھیرا میری مدد کر رہا تھا۔ جب میں کچھ دور نکل گیا تو آگے میرے اندازے کے مطابق جی ٹی روڈ تھی۔ چنانچہ میں نے ایک چھوٹی سی پلیا پر سے
میں دوڑنے لگا۔ میں چیکنگ کرتی پولیس کی پہنچ سے جتنی دور نکل سکتا تھا نکل جاندی عبور کی اور دوسری رات ایک کھلی جگہ پر آکر چلنے لگا۔ یہاں فصل کٹی ہوئی تھی۔
تھا۔ مجھے غصہ بھی آرہا تھا کہ کم بخت ابھی سے پولیس نے مجھے پریشان کرنا شروع ایک طرف کچھ درخت تھے۔ میں آگے نکل گیا۔ سوچنے لگا کہ آخر کب تک چلتا جاؤں گا۔
ہے۔ اس سے تو بہتر تھا کہ میں سیز فائر لائن عبور کر کے سیدھا مقبوضہ کشمیر میں داخمعلوم کرنا چاہیے کہ میں کس طرف جارہا ہوں اور آگے کونسا علاقہ آجاتا ہے۔ مگر وہاں
جاتا اور مجاہدوں کے ساتھ مل جاتا۔ مگر میرے والد صاحب کو معلوم تھا کہ کشمیر میں ہکوئی آدمی نظر نہیں آرہا تھا جس سے میں یہ معلوم کر سکتا۔ چلتے چلتے کھیت ختم ہوگئے اور
کا سامنا بھارت کی تربیت یافتہ فوج سے ہے اس لئے مجھے تھوڑی بہت فوجی تربیتبنجر زمین شروع ہوگئی۔ یہاں بیل گاڑیوں اور مال مویشی کے گزرنے کے لئے راستہ سا بنا
حاصل کرنی چاہیے تھی۔ چنانچہ انہوں نے مجھے وصیت کی تھی کہ میں کمال شاہ نامیہوا تھا۔ ایک جگہ کچھ فاصلے پر بہت سے درختوں کے جھنڈ نظر آئے۔ ان کے درمیان کسی
یافتہ فوجی کمانڈو کے پاس جا کر کمانڈو کی باقاعدہ تربیت حاصل کروں اور اس کے بعدنے آگ روشن کر رکھی تھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ وہاں جا کر کسی سے پوچھوں کہ یہ
کشمیر میں شامل ہو کر انڈین فوج کے خلاف لڑوں۔ میری بھی اب یہی خواہش تھی۔راستہ کدھر جاتا ہے۔ پھر یہ سوچ کر رک گیا کہ اس طرح خواہ مخواہ شک پڑ سکتا ہے کہ
مجھے تو رائفل چلانی بھی نہیں آتی تھی اور کشمیر کے محاذ پر برین گنوں سٹین گنوں اورآخر میں کون ہوں جو اس طرح بغیر جانے بوجھے اس علاقے میں کیوں پھر رہا ہوں۔ میں

درختوں کے جھنڈ سے ہٹ کر آگے گزر گیا۔ آگے ایک گاؤں کی کچھ روشنیاں سی ن
آئیں۔ میں گاؤں کی طرف جانے کی بجائے اس کے پہلو سے ہو کر آگے نکل گیا۔
مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ خیال آیا کہ گاؤں میں جاتا ہوں ضرور کچھ نہ کچھ کھانے کو
جائے گا۔ لیکن میں نے اس خیال کو دماغ سے نکال دیا۔ کیونکہ یہ پاکستان کا گاؤں ن
تھا۔ ہمارے دشمن ملک انڈیا کا گاؤں تھا۔ ہندو سکھوں کا گاؤں تھا اور ان کی پولیس میر
پیچھے لگی ہوئی تھی۔

چند قدم چلا ہوں گا کہ اندھیرے میں کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ جلدی سے
تو بھینس کے ڈکرانے کی آواز آئی۔ یہ کوئی بھینس تھی جو درخت کے ساتھ بندھی ہ
تھی اور کالی ہونے کی وجہ سے مجھے اندھیرے میں نظر نہیں آئی تھی۔ بھینس بیٹھی ہ
تھی۔ مگر مجھ سے ٹھوکر لگنے کے بعد اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ میں وہیں رک گیا اور رات
اندھیرے میں بھینس کے جسم کا جائزہ لینے لگا۔ بھینس دو ایک بار بولنے کے بعد چپ ہو
تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور پیار سے چمکارا۔ بھینس نے اپن
ہلائی۔ میں اس کے جسم کو پیار کرتا رہا۔ پھر بڑے آرام سے اس کے جسم پر ہاتھ پھی
پھیرتے اس کے نیچے بیٹھ گیا اور اس کے تھنوں کو پیار سے سہلانے لگا۔

مجھے خطرہ تھا کہ کہیں بھینس مجھے دولتی نہ مارے کیونکہ ظاہر ہے وہ کسی اور
ہاتھوں پر لگی ہوئی تھی۔ لیکن یہ بڑی شریف بھینس تھی۔ اس نے مجھے کچھ نہ کہا اور
اس کا دودھ پینے لگا۔ پہلے تو اس کا دودھ نہ نکلا۔ پھر میرے حلق میں نیم گرم دودھ
دھاریں لگیں۔ بھینس خاموشی کھڑی رہی۔ میں نے خوب جی بھر کر اس کا دودھ پیا اور
زبان میں اس کا شکریہ ادا کر کے چل پڑا۔ میری بھوک اور پیاس مٹ گئی تھی۔ میں
میدان میں سے گزر رہا تھا۔ رات کا اندھیرا اب خوب گہرا ہو گیا تھا اور صرف اتنا ہی
آرہا تھا کہ میں زمین کو دیکھ کر چل سکتا تھا۔ آگے ایک اور چھوٹا سا گاؤں آیا۔ اس
قریب ہی ایک گردوارہ تھا۔ گردوارے دروازے پر بلب روشن تھا اندر سے شبد کیر
ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی۔

مجھے نہ اس گاؤں کا پتہ تھا کہ اس کا نام کیا ہے اور نہ یہ پتہ تھا کہ آگے کون سا گاؤں
آئے گا۔ میں اندھیرے کے سمندر میں چلا جا رہا تھا۔ دل نے کہا کہ یوں چلتے جانا ٹھیک
نہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ دوبارہ واپس جالندھر پہنچ جاؤ۔ بہتر یہی ہے کہ کسی جگہ چھپ کر
رات بسر کرو۔ صبح جالندھر پہنچ جاؤ۔ بہتر یہی ہے کہ کسی جگہ چھپ کر رات بسر کرو۔ صبح
جب سورج کی روشنی نکلے تو پھر پتہ کرو کہ لدھیانہ شہر کس طرف ہے اور اس طرف چلو۔
لیے بھی میں چلتے چلتے تھک گیا تھا۔ وہاں یا تو اندھیرے میں دھندلے دھندلے کھیت نظر
آتے تھے یا بنجر میدان آجاتا تھا۔ رات بسر کرنے کے لئے کوئی ایسا ٹھکانہ دکھائی نہیں دیتا
جہاں اگر میں صبح تک بھی سوتا رہوں تو مجھے کوئی دیکھ نہ سکے۔

چلتے چلتے میں ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں بے شمار درخت پاس پاس اگے ہوئے تھے۔ یہ
شاید آموں کا کوئی باغ تھا۔ ابھی درختوں پر آم نہیں لگے تھے۔ یہ آموں کا موسم بھی نہیں
ہوا۔ درختوں کے نیچے بڑا گہرا اندھیرا تھا۔ کسی کتے نے میری بو سونگھ لی تھی درختوں کی
طرف سے اس کے بھونکنے کی آواز آئی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا آموں کے باغ سے آگے
لا گیا۔ وہاں دو چار درخت ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ میں نے سوچا ان درختوں کے نیچے پڑ
کر رات گزار دوں گا۔ آخر مجھے ایسی ہی کسی جگہ پر رات بسر کرنی پڑے گی۔ کوئی بستر چار
ئی تو یہاں مجھے مل نہیں سکتا۔ میں ان درختوں کے پاس گیا تو مجھے وہاں ایسی بو آئی جیسے
ی نے لکڑیاں جلا کر بجھا دی ہوں۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا اور درختوں کے نیچے جگہ
اف کر کے بیٹھ گیا۔ اپریل کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ رات کو کھلی جگہوں پر اوس گرنے
سے ٹھنڈ ہو جاتی تھی۔ ان درختوں کے نیچے ٹھنڈ بالکل نہیں تھی۔

اوس بھی نہیں گر رہی تھی۔ میں نے ایک درخت سے ٹیک لگا دی۔ سوچا اسی طرح
ٹھے لیٹے جتنی رات باقی رہ گئی ہے گزار دوں گا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی
شش کرنے لگا۔

فضا میں جلی ہوئی لکڑیوں کی بو اسی طرح آرہی تھی۔ میں نے یہی خیال کیا کہ یہاں
ب ہی گاؤں میں کسی نے تندور جلا کر بجھا دیا ہوگا یا لکڑیوں کا الاؤ روشن کیا ہوگا۔ میں

سمٹ سمٹا کر درخت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کئے نیم دراز تھا اور سوائے نیند کے کسی چیز کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔ مجھ پر کچھ دیر بعد ہلکی ہلکی غنودگی طاری ہو گئی۔ میں نیند کی آغوش میں ہی تھا کہ کسی چیونٹی نے مجھے کاٹا اور میں ایک جھٹکے کے سا اٹھ بیٹھا اور پتلون کے اندر ہاتھ ڈال کر پنڈلی پر بیٹھی چیونٹی کو مسل دیا۔ میں نے دو آنکھیں بند کیں تو مجھے کسی کے آہستہ آہستہ بولنے کی آواز آئی۔ میں نے آنکھیں کھ دیں اور کان اس آواز پر لگا دیئے۔ ساتھ ہی رات کے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ آواز کسی عورت کی تھی۔ وہ رک رک کر کچھ بول رہی تھ پہلے تو مجھے ایسے لگا کہ وہ کسی سے باتیں کر رہی ہے۔ مگر جس سے وہ باتیں کر رہی اس کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ آواز رک گئی۔ پانچ دس سیکنڈ کے بعد عورت کی آواز آنے لگی۔ میرے سامنے دس بارہ قدموں کے فاصلے پر سرکنڈوں کی جھاڑیاں تھیں۔ آواز ان سرکنڈوں کے پیچھے سے آ رہی تھی۔ میں اس طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا اچانک سرکنڈوں کے پیچھے ہلکی ہلکی روشنی نظر آنے لگی۔ میں آہستہ سے اٹھا اور جھک چلتا ہوا سرکنڈوں کی طرف بڑھا۔ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ عورت کون ہے اور ر کس چیز کی ہے۔ میں سرکنڈوں کے پاس ہو کر بیٹھ گیا اور بڑی احتیاط سے دو چار سرکنڈے کو ہاتھوں سے ایک طرف ہٹا کر دوسری طرف دیکھا۔ دوسری طرف مجھے چھوٹا سا چبو نظر آیا جو زمین سے ایک دو فٹ اونچا تھا۔ اس چبوترے کے ایک جانب مٹی کا دیا جل تھا۔ اس دیئے کی روشنی میں میں نے ایک عورت کو دیکھا دونوں ہاتھ جوڑ کر منہ میں پڑھتے ہوئے چبوترے کا چکر لگا رہی تھی۔ مجھے لگا کہ یہ ضرور کوئی چڑیل یا بھوت ہے ہے۔ مگر عورت کا جسم اور آواز چڑیلوں ایسی نہیں تھی۔ میں یہ سوچ کر وہیں چھپ بیٹھا رہا کہ معلوم کرنا چاہیے یہ عورت یہاں کیا کرنے آئی ہے۔

عورت پر دیئے کی روشنی پڑ رہی تھی۔ جب وہ دیئے کی روشنی کے قریب گزری تو مجھے اس کی شکل بھی نظر آگئی۔ عورت جوان تھی اور اس نے شلوار قمیض رکھی تھی۔ صرف لمبے بال شانوں پر کھلے تھے۔ چبوترے پر مجھے دیئے کی ہلکی ہلکی

کچھ جلی بجھی لکڑیاں پڑی نظر آ رہی تھیں۔ عورت چبوترے کے گرد کچھ چکر لگانے بعد رک گئی۔ وہ مجھ سے بمشکل پانچ چھ قدموں کے فاصلے پر تھی۔ وہ جلتے ہوئی چراغ پاس بالکل سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس نے پڑھنا بند کر دیا تھا۔ تین بار ہاتھ باندھ کر ترے کی طرف جھکی۔ پھر اس نے پہلے اپنی قمیض اتاری۔ اس کے بعد شلوار بھی اتار ۔ اب وہ میرے سامنے بالکل عریاں حالت میں کھڑی تھی۔

مجھ پر پہلا اثر یہ ہوا کہ میں نے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ پھر خیال آیا کہ پتہ تو لگے یہ عورت آدھی رات کو اس ویران جگہ پر چراغ لے کر کیا کرنے آئی ہے۔ میں نے گھما کر عورت کی طرف دیکھا۔ اس وقت وہ ایک چھڑی سے چبوترے کی جلی بجھی یوں کو کرید رہی تھی۔

"یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہے۔ کہیں واقعی کوئی چڑیل نہ ہو"

میرے دل میں خیال آیا۔ مگر اب میں اس معمے کو حل کرنا چاہتا تھا وہاں سے ڈر کر نا نہیں چاہتا تھا۔ عورت نے چھڑی سے لکڑیوں کی راکھ کو کریدتے کریدتے اس میں کوئی گول سی چیز لکڑی سے اٹھا کر باہر نکالی اور اس کو چراغ کی لو کے قریب لا کر غور دیکھنے اور دھیمی آواز میں کچھ پڑھنے لگی۔ میں یہ دیکھ کر واقعی ڈر گیا کہ یہ ایک جلی انسانی کھوپڑی تھی۔ عورت نے کھوپڑی کو ہاتھ لگایا۔ کھوپڑی گرم تھی۔ اس نے کھوپڑی کو زمین پر رکھ دیا۔ وہ اپنے ساتھ پانی کا ڈبہ بھی بھر کر لائی تھی۔ اس نے کچھ منتر پڑھتے پڑھتے کھوپڑی پر ڈبے میں سے تین چار بار پانی ڈالا جب کھوپڑی ٹھنڈی ہو گئی تو گود میں لے کر بیٹھ گئی اور یوں آگے پیچھے ہلتے ہوئے کچھ پڑھنے لگی جیسے بچے کو یاں دے رہی ہو۔ میں اب ساری بات سمجھ گیا تھا۔

یہ مرگھٹ یا شمشان بھومی تھی۔ جہاں ہندو سکھ اپنے مردوں کو جلاتے تھے۔ یہ عورت وہاں رات کے وقت چلہ کاٹنے آئی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے وہ کسی قریبی گاؤں کی عورت تھی۔ میرے دماغ میں ایک سکیم آئی۔ میں سرکنڈوں میں سے نکل کر اچانک اس کے سامنے آگیا۔ مجھے دیکھ کر عورت کی

چیخ نکل گئی۔ اس نے جلدی سے کھوپڑی پھینکی اور زمین پر پڑی ہوئی قمیض اٹھا کر اپنے آگے کر لی۔ میں نے منہ دوسری طرف کرتے ہوئے کہا۔ "میں تجھے کچھ نہیں کہوں گا مگر جلدی سے کپڑے پہن لے"

عورت نے جلدی سے کپڑے پہن لئے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی۔

"بھگوان کے لئے کسی کو نہ بتانا کہ میں یہاں آئی تھی"

میں نے کہا۔

"تو یہاں یہ سب کچھ کیا کر رہی تھی اور یہ کھوپڑی کس کی ہے؟"

عورت نے بتایا کہ وہ ایک ہندو عورت ہے۔ پانچ سال ہوئے اس کی شادی ہوئی مگر اولاد نہیں ہوئی۔ کسی سادھو نے اسے بتایا کہ اگر وہ کسی کنواری لڑکی کے جلے مردے کی کھوپڑی آدھی رات کو اپنی گود میں لے کر ایک خاص منتر کا جاپ کرے تو اس کی گود ہری ہو جائے گی۔ چنانچہ یہ عورت جو ساتھ والے گاؤں کی تھی وہاں اولاد کی خاطر چلہ کرنے آئی تھی۔ اسے پتہ چلا تھا کہ شام کو اس گاؤں کی ایک کنواری لڑکی مر گئی تھی اور اسے جلا دیا گیا ہے۔

عورت میری منت سماجت کر رہی تھی کہ میں گاؤں میں جا کر کسی کے آگے اس کا ذکر نہ کروں نہیں تو اس کا چلہ بھرشٹ ہو جائے گا۔ میں نے اسے کہا۔

"فکر نہ کر میں کسی کو نہیں بتاتا۔ کیونکہ میں خود یہاں پردیسی ہوں۔ لیکن میری بھی ایک شرط ہے"

"کیا؟" عورت نے پوچھا۔

میں نے کہا۔

"مجھے یہ بتاؤ کہ یہ علاقہ کونسا ہے اور لدھیانے کو جانے کے لئے مجھے کس طرف جانا چاہیے"

پھر میں نے اسے بتایا کہ میری بس نکل گئی تھی اور میں یونہی کھیتوں میں چل پڑا اور راستہ بھول گیا ہوں۔ عورت نے کہا۔

"تم بڑی دور نکل آئے ہو۔ یہاں سے آگے ایک قصبہ چولیاں آئے گا۔ وہاں سے قصبہ بیاس کو جانے والے یکے مل جاتے ہیں۔ بیاس سے تم ریل گاڑی میں بیٹھ کر لدھیانہ پہنچ جانا۔"

وہ ایک بار پھر ہاتھ جوڑنے لگی۔

"میرا ذکر کسی غیر آدمی سے بھی نہ کرنا۔ نہیں تو میرا اولاد کی خاطر چلہ بھرشٹ ہو جائے گا"

میں نے کہا۔

"وعدہ کرتا ہوں۔ میں اپنے کسی دوست سے بھی اس کا ذکر نہیں کروں گا"

سکیم میری یہی تھی کہ اس عورت سے کسی ایسے گاؤں یا قصبے کے بارے میں پوچھا جائے جہاں سے میں لدھیانہ پہنچ سکوں۔ چونکہ اس قسم کے چلے گھر والوں اور گاؤں والوں سے چھپ کر راز داری کے ساتھ کئے جاتے ہیں اس لئے مجھے یقین تھا کہ یہ عورت میرے بارے میں بھی کسی کو کچھ نہیں بتائے گی۔ اگر کسی کو بتائے گی تو وہ سب سے پہلے یہ پوچھے گا کہ تم آدھی رات کو گاؤں کے باہر کیا کرنے گئی تھیں۔

میں نے عورت سے اتنا ضرور کہا کہ اس قسم کے توہمات سے کچھ نہیں ہوا کرتا۔ گھر جا کر اپنے بھگوان کے آگے پرارتھنا کرو اگر بھگوان کی مرضی ہوئی تو وہ تمھاری گود ضرور ہری کر دے گا عورت حیرانی سے میرا منہ تکنے لگی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"تم مجھے ہندو نہیں لگتے۔ کیونکہ کوئی ہندو اس قسم کی بات نہیں کر سکتا"

میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"میں ہندو ہی ہوں۔ بس ولائیت کا پڑھا ہوا ہوں اور اس قسم کے توہمات کو نہیں مانتا۔ اب تم واپس اپنے گھر جاؤ"

عورت نے چبوترے پر جلتا ہوا چراغ پھونک مار کر بجھا دیا اور میرے قریب ہو کر

"تم اتنی رات گئے کہاں جاؤ گے۔ میرے ساتھ کیوں نہیں چلتے۔؟"

میں نے کہا۔

"ہاں تمہارے ساتھ تمہارے گاؤں جاؤں اور تمہارا خاوند اور گاؤں والے
پکڑ کر مارنا شروع کر دیں"

عورت ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی سے مجھے محسوس ہوا کہ یہ عورت ٹھیک
عورت نہیں ہے۔ اس کا ثبوت بھی مجھے فوراً" مل گیا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا
سانس لے کر کہنے لگی۔

"میرے ساتھ آ جاؤ۔ گاؤں کے باہر ایک کوٹھڑی ہے۔ وہاں چارپائی بھی
وہاں تم رات گزار لینا"

میں نے آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور اس عورت سے کہا۔

"تم اپنے گاؤں جاؤ۔ میں کسی اگلے گاؤں میں جا کر رات بسر کر لوں گا۔"

یہ کہہ کر میں وہاں سے چل دیا۔ میں نے کچھ دور جا کر واپس مڑ کر دیکھا۔
اندھیرے میں مجھے وہ عورت نظر آئی۔ ضرور وہ بھی اپنے گاؤں کی طرف روا
ہو گی۔

اب مجھے چولیاں گاؤں کی تلاش تھی۔ رات کے اندھیرے میں تو مجھے یہ گا
مل سکتا تھا۔ میں ایک بار پھر کوئی ایسا ٹھکانہ تلاش کرنے لگا جہاں میں رات گزار
ایک جگہ کھیتوں میں مجھے رہٹ کا چاک دکھائی دیا۔ ستاروں کی روشنی میں مجھے ا
میں چیزوں کے ہیولے صاف نظر آ رہے تھے۔ یہ رہٹ تھا مگر خاموش تھا۔ کوئی
وہاں پر نہیں تھا۔ ایک طرف ٹوٹا پھوٹا لکڑی کا تخت پڑا تھا۔ یہ میرے لئے تخت
سے کم نہیں تھا۔ میں اس پر فوراً" لیٹ گیا اور اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ میرے
شمشان بھومی والی عورت کا خیال آنے لگا۔ میں نے اپنی قوت ارادی سے اس
ذہن سے جھٹک دیا۔ میرا مشن ایک مقدس جہاد کا مشن تھا۔ اور میں اپنے ذہن
کی نفسانی آلودگیوں سے پاک رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے خدا کو یاد کیا۔ آنکھیں بند
مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ آنکھ اس وقت

دو تین کتے زور زور سے بھونکتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے قریب سے
گزرے۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

ابھی سورج نہیں نکلا تھا مگر آسمان پر سپیدہ سحر پھوٹ رہا تھا۔ مشرق کی طرف ستاروں
کی چمک ماند پڑ رہی تھی اور نیلی روشنی کی جھلکیاں نمودار ہو رہی تھیں۔ میرے وہاں سے
نکل جانے کے لئے یہ بڑا اچھا وقت تھا۔ اگر میری آنکھ دن نکلے کھلتی تو اس بات کا امکان
تھا کہ رہٹ پر کوئی کسان بیل لے کر آ جاتا۔ میں اٹھا اور جس سمت شمشان بھومی والی
عورت نے اشارہ کر کے گاؤں چولیاں کا نام لیا تھا اس طرف چلنے لگا۔

سورج نکلنے تک میں ایک گاؤں کے قریب پہنچ گیا۔ کھیتوں میں سکھ ہل چلا رہے
تھے۔ ایک آدمی سر پر فصل یا چارے کا گٹھا رکھے گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ ایک سکھ
کھیت میں پانی لگا رہا تھا۔ میں اس کے قریب سے گزرا تو اس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور
پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ میں بھی بے نیازی سے آگے گزر گیا۔ سامنے سے ایک
بوڑھا لاٹھی ٹیکتا چلا آ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ چولیاں گاؤں یہی ہے؟

وہ رک گیا اور بولا۔

"یہی ہے۔ تم نے کس سے ملنا ہے؟"

میں نے کہا۔

"نمبردار صاحب سے ملنا ہے۔ مل لوں گا میرا خیال ہے وہ گھر پر ہی ہوں گے"

یہ کہہ کر میں نمستے کہہ کر آگے چل پڑا۔

میں ٹھیک گاؤں میں پہنچا تھا۔ گاؤں کی دوسری طرف کیکر کے درختوں کے نیچے کچھ
یکے کھڑے تھے۔ ایک یکے میں دو عورتیں' ایک ہندو لالہ اور ایک سکھ دیہاتی بیٹھا تھا۔
کوچوان بھی سکھ تھا۔ اس نے مجھے اپنی طرف آتے دیکھا تو دور ہی سے آواز دی۔

"باؤ جی بیاسا جانا ہے تو آ جاؤ"

بیاسا سے مراد بیاس گاؤں یا بیاس کا قصبہ یا شہر تھا۔ جو کچھ بھی تھا مجھے وہیں جانا تھا۔

میں یکے میں بیٹھ گیا۔ یکہ چل پڑا کوچوان نے مجھ سے تین روپے کرایہ لیا۔ کوئی
ڈیڑھ گھنٹے کے نہایت تکلیف دہ سفر کے بعد یکے نے مجھے بیاس نام کے قصبے میں پہنچا
اب تو یہ قصبہ ایک شہر بن گیا ہوگا اس وقت یہ ایک قصبہ ہی تھا۔ یکہ بیاس نام
ریلوے سٹیشن کے باہر اڈے پر جاکر رکا تھا۔ معمولی سے دیہاتی اسٹیشن کی عمارت
جیسی کہ ہر جگہ دیہاتی سٹیشنوں کی عمارت ہوا کرتی تھی معلوم ہوا کہ دلی جانے والی
پسنجر ٹرین ایک گھنٹے بعد آنے والی ہے۔ وہاں مسافروں کا کوئی رش نہیں تھا۔ ٹکٹ میر
پاس ہی تھا۔ میں نے ایک کے باہر بیٹھ کر بند مکھن کھایا اور چائے پی۔ کچھ دیر وہیں
رہا۔ پھر اٹھ کر سگرٹوں والے کھوکھے پر جاکر ایک سگریٹ خرید کر سلگایا اور سٹیشن
طرف آگیا۔ گیٹ پر کوئی ٹکٹ چیک کرنے والا نہیں تھا۔ میں پلیٹ فارم پر آگیا۔
اینٹوں کا پلیٹ فارم تقریباً پڑا تھا۔ میں ایک بنچ پر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ میری نگاہیں ماحول
جائزہ لینے لگیں۔ وہاں پولیس والا کوئی نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد کچھ ہندو سکھ مسافر
پلیٹ فارم پر اپنی گٹھڑیاں اور ٹرنک رکھ کر بیٹھ گئے۔ کہیں سے ایک ٹی ٹی بھی آگیا۔
نے ریلوے کی وردی پہنی ہوئی تھی۔ وہ پلیٹ فارم پر ادھر ادھر پھرنے لگا۔ اتنے میں
کی جانب سگنل ڈاؤن ہوگیا۔ گاڑی آرہی تھی۔ قلی بھی پہنچ گئے تھے۔

پسنجر ٹرین چھک چھک کرتی آگئی۔ سارے ڈبے تھرڈ کلاس کے تھے جو سواریوں
بھرے ہوئے تھے۔ میں ایک ڈبے میں گھس کر بیٹھ گیا۔ گاڑی بیاس کے اس سٹیشن
پندرہ بیس منٹ تک کھڑی رہی۔ میری نگاہیں پلیٹ فام پر ہی لگی رہیں۔ یہی دھڑکا لگا
کہ کہیں سے کوئی پولیس والا مجھے تلاش کرتا وہاں نہ آجائے۔ مگر کوئی سپاہی دکھائی نہ دیا
انجن نے سیٹی دی اور ٹرین چل پڑی۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین ایک بہت بڑے دریا پر
گزرنے لگی۔ معلوم ہوا کہ یہ دریائے بیاس ہے۔ اس کے بعد خدا خدا کر کے لدھیانہ
آیا۔ یہ کافی بڑا سٹیشن تھا۔ میں ڈبے میں ہی چھپ کر بیٹھا دل میں دعائیں مانگتا رہا کہ کوئی
پولیس والا ادھر نہ آجائے۔ پلیٹ فارم پر مجھے ایک دو وردی والے سپاہی نظر آئے تھے
مگر کسی نے میرے ڈبے کا رخ نہ کیا۔ ٹرین یہاں دیر تک رکی رہی۔ آخر وہ چلی تو میری

جان میں جان آئی۔

پسنجر ٹرین ہونے کی وجہ سے ایک تو وہ ہر سٹیشن پر رکتی تھی اور اس کی رفتار بھی
زیادہ نہیں تھی۔ چلتی رہی۔ چلتی چلی گئی۔ لدھیانے کے بعد کئی چوٹے چھوٹے سٹیشن
آئے۔ پھر بڑا شہر انبالہ آگیا۔ یہاں بھی گاڑی دیر تک کھڑی رہی۔ یہاں سے چلی تو کہیں
شام کے وقت کرنال کا بڑا شہر آیا۔ اس کے بعد پانی پت اور سونی پت کے شہر آئے اور وہ
بھی گزر گئے۔ معلوم ہوا کہ اب روہتک کا شہر آئے گا اور پھر گاڑی دلی پہنچ جائے گی۔ اس
گاڑی نے دلی پہنچتے پہنچتے رات کے نو بجا دیئے۔ دلی کے سٹیشن پر اترتے ہی میں نے موٹر
رکشا لیا اور سیدھا والد صاحب کے دوست ظہرالدین صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ وہ مجھے دیکھ
کر حیران بھی ہوئے اور مجھے ڈانٹنے بھی لگے کہ میں کہاں چلا گیا تھا۔ میں نے ایک فرضی
کہانی گھڑ کر انہیں سنا دی میرے پاسپورٹ پر دلی کا ویزا اگرچہ لگا ہوا تھا مگر جتنے دن مجھے
وہاں ٹھہرنے کی اجازت تھی اس کی مدت گزر چکی تھی۔ ظہرالدین صاحب کہنے لگے۔

"میاں! ویزے کی مدت کے بعد ٹھہرنا جرم ہے پولیس تمہیں پکڑ سکتی ہے اور
مجھے بھی پریشان کر سکتی ہے۔"

میں نے انہیں کہا۔

"انکل آپ پریشان نہ ہوں۔ میں کل واپس پاکستان چلا جاؤں گا"

وہ کہنے لگے۔

"میاں! جاتی دفعہ تمہیں پولیس سٹیشن رپورٹ کرنی ہوگی۔ پولیس تمہیں
ویزے کی مدت سے زیادہ قیام کرنے پر وہیں پکڑ لے گی"

اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ بہرحال میں نے جوں توں کر کے رات ظہر
الدین صاحب کے گھر پر گزاری۔ دوسرے دن اپنے کپڑے ڈرائی کلین کرائے۔ نہا دھو کر
شیو وغیرہ بنائی۔ جتنے انڈین کرنسی کے نوٹ میرے پاس باقی رہ گئے تھے ان میں سے کچھ
ایک پاؤں کی جراب میں چھپائے کچھ جیکٹ کی جیب میں پاسپورٹ کے ساتھ رکھ لئے۔
چھوٹا چاقو ابھی تک میرے پاس ہی تھا۔ خیال آیا کہ اس کو یہیں کہیں پھینک دیتا ہوں

کیونکہ اس کا ابھی تک مجھے کوئی مصرف نظر نہیں آیا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر اسے جیب
ہی رہنے دیا۔ ظہیرالدین صاحب اپنی دکان پر جا چکے تھے۔ میں بھی کچھ دیر بعد ان
مکان سے نکل آیا۔

اگر چہ میرے پاسپورٹ پر دلی کا ویزا لگا ہوا تھا مگر جو قانونی مدت وہاں قیام کی
حاصل تھی وہ پوری ہو چکی تھی اور اب میں غیر قانونی طور پر انڈیا میں رہ رہا تھا اور مجھ
پکڑ کر جیل میں بند کیا جاسکتا تھا مگر میں نے کوئی پروانہ کی اور سیدھا رکشا پکڑ کر ریلو
سٹیشن پہنچ گیا۔ یہ ایک موٹر رکشا تھا اور اس پر زرد اور نیلا رنگ کیا ہوا تھا۔ سٹیشن پر
میں نے اپنی گاڑی کے بارے میں معلوم کیا۔ انکوائری کلرک ہندو خاتون تھی جس
ماتھے پر تلک لگایا ہوا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ دوپہر کو ایک گاڑی بمبئی جائے گی۔ وہ
ٹرین ہے۔ ہر سٹیشن پر ٹھہرے گی۔ شام کے سوا چھ بجے بمبئی ایکسپریس کا ٹائم ہے۔
رن تھرو گاڑی ہے۔ میں پسنجر ٹرین سے تنگ آیا ہوا تھا۔ میں نے بمبئی ایکسپریس پکڑنے
فیصلہ کرلیا۔ اس عورت نے میرے دریافت کرنے پر مجھے بتایا کہ یہ ٹرین دوسرے
دوپہر کے بعد ہوشنگ آباد پہنچے گی۔

میں واپس ظہیرالدین صاحب کے مکان پر یا ان کی دکان پر آنے کی بجائے سید
بادشاہی مسجد پہنچ گیا۔ یہ میرے نزدیک سب سے محفوظ جگہ تھی۔ مجھے یقین ہو گیا ہوا
کہ دلی میں میرے پیچھے خفیہ پولیس کا کوئی آدمی نہیں لگا ہوا۔ یہ سارا مسلمانوں کا علاقہ
وہیں دوپہر کے وقت میں نے ایک ہوٹل میں کھانا کھایا۔ اس کے بعد واپس مسجد میں آ
دوپہر کے بعد جو نماز ہوتی ہے وہ میں نے بادشاہی مسجد یا جامع مسجد میں ہی باجماعت پڑھی
بمبئی ایکسپریس سوا چھ بجے چھوٹتی تھی۔ میں ایک گھنٹہ پہلے سٹیشن پر آگیا۔ امرتسر
ہردہ ضلع ہوشنگ آباد کا جو تھرڈ کلاس کا ٹکٹ سید صاحب نے مجھے لے کر دیا تھا وہ
نے گیٹ پر ٹکٹ چیکر کو بالکل نہ دکھایا۔ یہ سوچ کر کہ کہیں وہ یہ نہ پوچھ بیٹھے کہ
دن میں کہاں رہا۔ اگر چہ اسے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی اور ٹکٹ پندرہ بیس روز
کام آسکتا تھا۔ پھر بھی حفظ ماتقدم کے طور پر میں پلیٹ فارم کا ٹکٹ لے کر سٹیشن

اندر گیا۔ پلیٹ فارم پر کافی رش تھا۔ ٹرین ابھی نہیں آئی تھی۔ میں گیٹ سے کچھ دور جا کر
ایک بنچ کے کونے میں بیٹھ گیا۔ ہندو سکھ مسلمان مسافر اپنا اپنا سامان لے کر چلے آرہے
تھے۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ ریلوے پولیس کے دو کانسٹیبل باتیں کرتے
مسافروں کو دیکھتے ہوئے میرے قریب سے گزر گئے۔

اتنے میں بمبئی ایکسپریس آگئی۔ پلیٹ فارم پر مسافروں میں ہلچل سی مچ گئی۔ میں بھی
اٹھ کر مسافروں کے ہجوم میں گھس گیا۔ گاڑی پیچھے سے بھری ہوئی آئی تھی۔ تھرڈ کلاس
کے ایک ڈبے میں مجھے بھی جگہ مل گئی۔ ٹرین چلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ پہلے اس کا
انجن بدلا گیا۔ پھر خدا جانے اس کے ڈبوں میں کیسا کیسا سامان لادا جانے لگا۔ کوئی آدھے
پون گھنٹے بعد انجن نے وسل دیا گاڑی نے لالٹین کی سبز روشنی دکھائی اور ٹرین چل پڑی۔
اس وقت دن ڈوب گیا تھا اور شام کا اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ میں کونے والی سیٹ پر دبک
کر بیٹھا رہا۔ ٹرین آہستہ آہستہ رفتار پکڑ رہی تھی۔ دلی کی آبادی بڑی دور دور تک پھیلی
ہوئی تھی۔ شہر کے مکانوں کارخانوں وغیرہ کی روشنیاں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔
واقعی دلی بہت پھیلا ہوا شہر تھا۔ اس کے بعد ہندوستان کے کئی دوسرے بڑے بڑے شہر
آئے۔ میں جاگتا رہا۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ اس سے پہلے جب کبھی میں ریل گاڑی
میں سفر کیا کرتا تھا تو مجھے چلتی ریل گاڑی کی آواز سے نیند آنے لگتی تھی۔ مگر یہاں نیند
نہیں آرہی تھی۔ دلی کے بعد بڑا شہر گڑگانواں آیا۔ اس کے بعد متھرا۔ پھر بھرت پور۔ پھر
آگرہ کا شہر آیا۔ چاندنی رات نہیں تھی ورنہ لوگ کہہ رہے تھے کہ ریل گاڑی میں سے
دور تاج محل کا منظر نظر آیا کرتا ہے۔ یہاں تاج محل کی مشہور تاریخی عمارت تھی جو
مسلمان بادشاہ شاہجہان نے اپنی بیوی ممتاز محل کے لئے بنائی تھی۔ میں نے ہندوستان میں
اور بھی کئی شاندار تاریخی عمارتیں دیکھیں جو مسلمان بادشاہوں نے بنائی تھیں۔ ہندو ان
عمارتوں کو خراب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

آگرہ کے بعد دھول پور کا اسٹیشن آیا۔ پھر گوالیار کا شہر آگیا۔ اس وقت رات تقریباً
گزر چکی تھی اور پوپھٹنے والی تھی۔ گولیار شہر سے گاڑی چلی تو مجھے نیند آگئی۔ میرے

سوتے میں جھانسی اور للت پور کے شہر بھی گزر گئے۔ تب میں اٹھ بیٹھا۔ دن کافی چڑھ آیا تھا۔ گاڑی ایک سٹیشن پر رکی تو میں نے اتر کر چائے اور بند مکھن کھایا۔ یہی چیز ہر چھوٹے سٹیشن پر مل جاتی تھی دوپہر تک ٹرین جنگلوں میں سے گزرتی رہی۔ میں نے اس سے پہلے اتنے بڑے بڑے جنگل نہیں دیکھے تھے۔ ایک مسافر نے مجھے بتایا کہ یہ جنگل شیر ہاتھی اور دوسرے درندوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ بعد میں مجھے بھی اس کا تجربہ ہوگیا۔ یہ پہاڑی علاقہ بھی تھا اور کہیں کہیں ہرے بھرے میدان اور کھیت بھی آجاتے تھے۔

معلوم ہوا کہ آگے بھوپال کا سٹیشن آرہا ہے مجھے دلی سٹیشن پر ہی بتا دیا گیا تھا کہ بھوپال کے بعد ہوشنگ آباد کا سٹیشن آتا ہے۔ مجھے ہوشنگ آباد ہی اترنا تھا۔ چنانچہ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس دوران کسی سٹیشن پر کسی پولیس والے نے میری طرف توجہ نہیں دی تھی۔ کوئی انٹیلی جنس کا آدمی بھی میرے تعاقب میں نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو مجھے ضرور شبہ پڑ جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ میں انڈیا کے پنجاب کے علاقے سے بہت دور نکل آیا تھا۔ بھوپال پہنچتے پہنچتے شام کے چھ بج گئے۔ چونکہ شروع گرمیوں کا موسم تھا اس لئے ابھی دن کی روشنی کافی تھی۔ یہاں لاہور اور ہمارے پنجاب والا خوش بہار کا موسم بالکل نہیں تھا۔ یہاں گرمی شروع ہوگئی تھی۔ ٹرین کے ڈبے کے پنکھے دن رات چلتے تھے۔ رات کو بھی ہمارے پنجاب والی خنکی نہیں ہوتی تھی۔ بھوپال کے بارے میں میرے ساتھ بیٹھے ہوئے مسافر نے جو مسلمان تھا اور بمبئی جارہا تھا بتایا کہ بھوپال مسلمان ریاست ہوا کرتی تھی مگر اب اس پر بھی دوسری ریاستوں کی طرح انڈیا کی حکومت نے قبضہ کرلیا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ بھوپال کے مسلمان حکمران نے پاکستان کے قیام میں بڑی مدد دی تھی اور قائداعظم اکثر یہاں آکر ٹھہرا کرتے تھے اور وہ بھوپال کے حکمران پر جن کا میں نام بھول رہا ہوں بڑا اعتماد کرتے تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ شاعر مشرق علامہ اقبالؒ جنہوں نے سب سے پہلے پاکستان کا تصور پیش کیا تھا وہ بھی والی بھوپال کے دوست تھے اور اکثر بھوپال آکر قیام کیا کرتے تھے۔

ہوشنگ آباد کا سٹیشن آیا تو میں ریل گاڑی سے اتر گیا۔ اتنا لمبا سفر طے کیا تھا کہ بیٹھے

بیٹھے تھک گیا تھا۔ ہوشنگ آباد کا سٹیشن زیادہ بڑا نہیں تھا۔ درمیانہ سا ریلوے سٹیشن تھا۔ میرے پاس ہردہ تک کا ٹکٹ تھا مگر یہ گاڑی وہاں نہیں ٹھہرتی تھی۔ اس لئے یہاں اتر گیا تھا۔ یہاں سے مجھے لاری وغیرہ پر سوار ہو کر ہردہ جانا تھا۔ اس وقت شام کا دھندلکا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ سٹیشن سے باہر آکر میں نے ایک چھوٹی سی دوکان میں بیٹھ کر کھانا کھایا اور لاری اڈے کے بارے میں پوچھا۔ معلوم ہوا کہ ہردہ کے لئے آخری لاری کوئی آدھے گھنٹے تک روانہ ہونے والی ہے۔ لاری اڈے پر جلدی جلدی پہنچا۔ لاری تیار کھڑی تھی۔ مسافروں سے بھر رہی تھی۔ کچھ مسافر چھت پر بھی اپنے سامان کے پاس بیٹھے تھے۔ میں بھی لاری میں بیٹھ گیا۔ لاری اپنی منزل کی طرف چل پڑی۔ ہوشنگ آبا شہر سے نکلتے ہی لاری گھنے جنگل میں داخل ہوگئی۔ جنگل کے درمیان چھوٹی سی پکی سڑک بنی ہوئی تھی۔ اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ سڑک پر بجلی کا ایک بھی کھمبا نہیں تھا۔ باہر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جنگل کی وجہ سے ہوا ٹھنڈی ہوگئی تھی جو بڑی خوشگوار لگ رہی تھی۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد لاری نے ہردہ پہنچا دیا۔

یہ ایک معمولی سا نیم پہاڑی جنگلاتی شہر تھا۔ امرتسر میں سید صاحب نے بتایا تھا کہ یہاں اناج کی بہت بڑی منڈی ہے۔ یہیں مجھے اس آدمی سے ملنا تھا جس کا فرضی نام میں نے آپ کے آگے جمیل لیا تھا۔ سید صاحب نے بتایا تھا کہ جمیل کی شہرت اچھی نہیں ہے۔ وہ بدمعاش ٹائپ کا آدمی ہے مگر بڑا پکا مسلمان اور جہاد کشمیر میں حصہ بھی لے چکا ہے۔ جمیل کی وساطت سے مجھے مجاہد کمانڈو کمال شاہ کے پاس پہنچنا تھا۔ سید صاحب نے مجھے اس کا پورا ایڈریس زبانی یاد کرا دیا تھا۔

ہردہ شہر اگرچہ چھوٹا سا تھا اور چھوٹے چھوٹے بازار تھے مگر کافی بارونق تھا۔ دکانوں اور مکانوں اور بازاروں میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ اکثر دکانیں ابھی تک کھلی تھیں۔ کچھ ہوٹل بھی تھے جن میں فلمی گانوں کی ریکاڈنگ ہو رہی تھی۔ یہاں کوئی رکشا نہیں تھا۔ ایک تانگے والے کو جمیل کا ایڈریس بتا کر کہا کہ مجھے وہاں لے چلو۔ تانگہ مجھے مختلف بازاروں اور ایک چھوٹے سے میدان میں سے گزار کر اس خاص بازار میں لے آیا۔ جہاں

جمیل نام کا آدمی رہتا تھا۔ یہ بازار مجھے بڑا پر اسرار سا لگا۔ اک منزلہ کواٹر نما مکانوں کے آگے اندھیرا اندھیرا تھا۔ کہیں کہیں برآمدے میں کوئی عورت سیڑھیوں میں یا ستون کے پاس فرش پر بیٹھی بیڑی سگریٹ پیتی نظر آجاتی تھی۔ کچھ آدمی بھی ادھر منڈلا رہے تھے۔ ایک پان والے کی دکان سے میں نے جمیل کے بارے میں پوچھا۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا اور پان لگاتے ہوئے کہا۔

"بھائی صاحب پیچھے چلے جائیں۔ پیچھے کواٹر ہے جمیل دادا کا"

جمیل دادا مجھے اپنے کواٹر کے برآمدے میں ہی مل گیا۔ وہ چار پائی پر بیٹھا تھا۔ برآمدے میں بلب کی روشنی ہو رہی تھی۔ ایک آدمی اس کی پنڈلیوں پر تیل کی مالش کر رہا تھا۔ ایک آدمی اس کے بازو کو اوپر کر کے دبا رہا تھا۔ جوان آدمی تھا۔ بال گھنگھریالے سیاہ تھے۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ میں نے جا کر سلام کیا اور کہا۔

"جی مجھے جمیل صاحب سے ملنا ہے"

جمیل نے مجھے گھور کر دیکھا۔ پوچھا۔

"کون ہو تم۔ کہاں آئے ہو؟ میں ہی جمیل ہوں۔ کہو کیا کہنا ہے؟"

اس کی آواز بڑی رعب دار تھی۔ میں نے سید صاحب کا نام لے کر کہا کہ مجھے امرتسر سے انہوں نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ سید صاحب کا نام سن کر جمیل دادا نے دونوں آدمیوں سے کہا۔

"جاؤ بے جا کر ہوٹل سے چائے اور پیسٹری لاؤ۔"

میں نے اسے اپنا نام بتایا۔

اس نے کہا۔

"بیٹھو بھائی۔ یہاں آجاؤ۔ کھانا کھایا ہے کہ نہیں؟"

میں نے کہا۔

"جی شکریہ کھانا میں نے ہوشنگ آباد کے سٹیشن پر ہی کھا لیا تھا۔"

جب اس کے دونوں نوکر چلے گئے تو جمیل نے میری طرف تھوڑا سا جھک کر

رازداری سے پوچھا۔

"سید صاحب کا یہاں کسی اور کے آگے نام تو نہیں لیا؟"

میں نے کہا۔

"جی نہیں۔ مجھے خود سید صاحب نے بھی منع کر دیا تھا کہ میرا نام سوائے آپ کے اور کسی کے آگے نہ لوں"

جمیل نے میری باتوں اور زبان کے لہجے سے کچھ اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے تم پنجابی ہو۔ مگر انڈیا کے پنجاب میں تو کوئی مسلمان نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"جی میں پاکستان سے آیا ہوں"

یہ سن کر جمیل دادا ایک پل کے لئے مجھے تکتا رہا۔ پھر اٹھ کر اس نے مجھے اپنے گلے لگایا۔ مجھ سے گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور اپنے پاس چارپائی پر مزید قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔

"پاکستان پر میری جان قربان۔ اللہ پاکستان کو سلامت رکھے۔ اب بتاؤ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

یہاں میں اپنے قارئین اور اپنی اس سچی داستان کے پڑھنے والوں کو بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے صرف ہردہ شہر کے جمیل کا نام ہی فرضی نہیں رکھا بلکہ ہردہ شہر بھی میں نے اپنی طرف سے لکھ دیا ہے۔ مجاہد کمانڈو کمال شاہ کا نام بھی یہ نہیں اور وہ بھی ضلع ہوشنگ آباد کے جنگل میں نہیں رہتا۔ اگر میری یہ داستان پڑھ کر انڈیا کی حکومت وہاں چھاپہ بھی مارے تو اسے وہاں نہ کوئی جمیل ملے گا نہ کمال شاہ کمانڈو ہی ملے گا۔ یہ دونوں پاکستان کے پرستار اور اسلام کے مجاہد ابھی بفضل تعالیٰ زندہ ہیں۔ جمیل صاحب بھی بھارت کے ایک شہر میں رہ رہے ہیں اور مجاہد کمانڈو کمال شاہ بھی بھارت کے ایک دور افتادہ جنگل میں اس عمر میں بھی کشمیری مجاہدین کو کمانڈو ٹریننگ دے رہے ہیں مگر یہ جنگل ضلع ہوشنگ آباد کا جنگل نہیں ہے۔ اصل جنگل کا اب سوائے کشمیری مجاہدین کے کسی کو

بھی علم نہیں ہے۔ آگے چل کر بھی میں ضرورت کے مطابق جگہوں کے نام اور خاص لوگوں کے نام تبدیل کرتا جاؤں گا۔ میں یہ بھی نہیں لکھوں گا کہ ہم جب راتوں کمانڈو مشن پر روانہ ہوتے تھے تو کن کن راستوں سے گزر کر اپنے ٹارگٹ پر پہنچتے تھے۔ ٹارگیٹ آپ کو ضرور صحیح بتادوں گا مگر جو کشمیری مجاہد اس میں گائیڈ کرتے تھے نہ ان نام بتاؤں گا اور نہ ان راستوں کے بارے میں بتاؤں گا جہاں سے گزر کر ہم ٹارگٹ اٹیک کرتے تھے۔ کیونکہ کشمیر ابھی آزاد نہیں ہوا۔ ابھی مجاہدین آزادی کشمیر کی جنگ رہے ہیں اور مقبوضہ کشمیر کو بھارتی جبرو استبداد سے آزاد کرانے کے لئے اپنی جانیں قر کر رہے ہیں۔

اب میں واپس پاکستان کے پرستار جمیل دادا کے پاس آتا ہوں۔ جب اس نے سے پوچھا کہ بتاؤ میں تمھاری کیا خدمت کر سکتا ہوں تو میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا میں کس غرض کے لئے انڈیا آیا ہوں اور یہ کہ میں جہاد کشمیر میں حصہ لینا اور کمال صاحب سے کمانڈو کی ٹریننگ لے کر کشمیر کی جنگ میں بطور کمانڈو بھارتی جارحیت کا مقا کرنا چاہتا ہوں۔ جمیل دادا نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر چوما اور آنکھوں لگایا۔ کہنے لگا۔

"اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے نیک مقصد میں کامیاب کرے۔ تم مجھ سے بڑھ کر خوش قسمت ہو۔ میں کشمیر کی لڑائی زیادہ دیر نہیں لڑ سکا۔ بس ایک مجبوری راستے میں رکاوٹ بن گئی تھی۔"

اتنے میں چائے آگئی۔ وہ دیر تک مجھ سے پاکستان کے بارے ہی میں باتیں کرتا رہا مجھے حیرانی بھی ہوئی اور خوشی بھی ہوئی کہ یہ شخص پاکستان سے اتنی دور کافروں کے ملک میں بیٹھا ہے اور اس کے دل میں اسلام اور پاکستان کے لئے محبت کا بے پناہ جذبہ موج ہے۔ اصل میں یہ خدا اور اس کے رسول صلعم کے دین اسلام کا رشتہ تھا جس فاصلوں کو سمیٹ دیا تھا اور سینکڑوں میل دور بیٹھا ایک مسلمان مجاہد پاکستان کے مسلمان کے دل کی دھڑکن سن رہا تھا اور پاکستان کی خاطر، کشمیر کی خاطر ہر وقت اپنی جان قر

نے کے لئے تیار تھا۔

رات گہری ہونے لگی تو جمیل دادا نے برآمدے میں میرا بستر لگا کر پنکھا چلا دیا اور کہنے

"تم آرام کرو۔ صبح منہ اندھیرے تمہیں خود لے کر کمال شاہ کے پاس جاؤں گا۔"

اس نے برآمدے کی بتی بجھا دی۔ پنکھے کی ہوا نے مچھروں کو میرے پاس نہ آنے دیا اور مجھے بڑی جلدی نیند آگئی۔ منہ اندھیرے جمیل دادا نے مجھے جگا دیا۔

"جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہمیں ابھی چلنا ہے"

میں منہ ہاتھ دھو کر تیار ہوگیا۔ جمیل دادا نے دو نالی بندوق کاندھے پر ڈال رکھی

"یہ جنگل بڑے خطرناک ہیں۔ جنگلی درندوں سے اکثر آمنا سامنا ہو جاتا ہے۔ میں بندوق کے بغیر کبھی یہاں نہیں آتا"

شہر کی آبادی پر پچھلے پہر کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ آسمان کے مشرقی کناروں پر صبح کاذب کا ہلکا ہلکا نور جھلکنے لگا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ شہر کے مضافات سے نکلتے ہی جمیل دادا مشرق کی سمت کھیتوں میں چلنے لگا۔ میں اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ کافی دیر تک ہم کھیتوں میں چلتے گئے۔ پھر کھیت ختم ہوگئے اور چھوٹی چھوٹی، سوکھی گھاس کا میدان شروع ہوگیا۔ اس میدان کے پار دور سے جنگل کے درختوں کے ہیولے نظر آنے لگے تھے۔ یہ ہیولے ٹیلوں کی ڈھلوانوں پر اوپر تک چلے گئے تھے۔ جمیل دادا نے ان کی طرف اشارہ کیا

"یہ وسطی ہند کے بڑے گھنے جنگل ہیں۔ یہ اتنے گھنے ہیں کہ تجربہ کار شکاری بھی اکثر راستہ بھول جاتے ہیں۔ وہ بھی گائیڈ کے بغیر نہیں چلتے۔ مگر تم فکر نہ کرو۔ مجھے ایک ایک درخت ایک ایک موڑ ایک ایک پتھر کا علم ہے۔"

ہم جنگل میں داخل ہوگئے تھے۔ پہلے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کے پہلو سے ہو کر چلتے

گئے۔ پھر ایک ٹیلے کی چڑھائی چڑھ کر دوسری طرف آگئے۔ اتنی دیر تک صبح کی سُ
روشنی چاروں طرف پھیل گئی تھی مگر درختوں میں ہلکا ہلکا اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ راستے
میں ایک سور ملا۔ وہ سیدھا ہماری طرف آیا۔ جمیل دادا نے اپنے ساتھ مجھے بھی جلدی
سے ایک طرف کر دیا۔ سور بالکل ناک کی سیدھ آیا تھا اور اسی طرح آگے نکل گیا۔ پھر
پلٹا نہیں۔ ادھر ہی درختوں میں خوک خوک کی آواز نکالتا غائب ہوگیا۔

ٹیلوں کے درمیان ایک چھوٹا سا تالاب دیکھا جس کے کنارے ایک جانب ہرن اور
دوسری طرف ایک بھورا ریچھ پانی پی رہا تھا۔ جمیل دادا نے ریچھ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"یہ بھورا ریچھ اس جنگل کا سب سے خطرناک درندہ ہے۔ کسی کے پیچھے پڑ
جائے تو پھر اس کی جان نہیں چھوڑتا۔ آدمی درخت پر چڑھ جائے تو یہ درخت
کے نیچے بیٹھ جاتا ہے اور اپنے شکار کے اترنے کا انتظار کرتا رہتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"ان جنگلوں میں شیر بھی ہوتے ہوں گے آدم خور شیر"

جمیل دادا بولا۔

"ہر شیر آدم خور نہیں ہوتا۔ شیر بہت بوڑھا ہو جائے اور اپنے شکار کے پیچھے
زیادہ تیز نہ بھاگ سکے تو بھوک مٹانے کے لئے انسانوں پر حملے کرنے لگتا ہے
کیونکہ جانوروں کے مقابلے میں انسان زیادہ تیز نہیں بھاگ سکتا۔ ایک بار
اسے انسانی خون کی چاٹ لگ جائے تو پھر وہ آدم خور بن جاتا ہے۔ یا کسی
اناڑی شکاری کی گولی سے اگر اس کا کوئی دانت ٹوٹ جائے یا لنگڑا ہو جائے تب
بھی وہ انسانوں پر حملے شروع کر دیتا ہے اور آدم خور بن جاتا ہے۔ ویسے عام
شیر انسان پر حملے میں پہل نہیں۔ بلکہ اکثر انسان کو دیکھ کر ذرا سا غرا کر دوسری
طرف چلا جاتا ہے۔"

ہم شیر کی باتیں کر رہے تھے کہ جنگل میں ایک جانب سے شیر کی دھاڑ سنائی
میرا دل زور سے دھڑکنے لگا۔

جمیل دادا نے کہا۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے اس شیر نے کسی جانور کو شکار کر لیا ہے۔ اب
وہ اسے گردن سے دبوچ کر اپنے ٹھکانے پر لے جائے گا۔"

ٹیلوں کی چڑھائی چڑھتے اترتے میں تھک گیا تھا مگر چلتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے جمیل
دادا سے آخر پوچھ ہی لیا کہ کمال شاہ مجاہد کمانڈو کا ٹھکانہ ابھی کتنی دور ہے۔ جمیل دادا نے
مسکرا کر کہا۔

"تم ضرور تھک گئے ہوگے۔ مگر اس کا ذکر کمال شاہ کے آگے نہ کرنا۔ وہ ایسے
نوجوانوں کو اپنا شاگرد نہیں بناتے جو جنگل میں چلتے چلتے تھک جاتے ہیں۔ جب
وہ تمہاری کمانڈو ٹریننگ شروع کریں گے تو دو دن میں تمہیں سب سے پہلے
گھوڑے کی طرح طاقتور بنائیں گے۔ اس کے بعد۔۔۔۔۔"

اور جمیل دادا چپ ہوگیا۔

"اس کے بعد کیا دادا؟" میں نے پوچھا۔

جمیل دادا نے سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کمال شاہ مجاہد کمانڈو ہیں۔ وہ اسلام کے شیر ہیں۔ وہ تمہیں بھی اسلام کا شیر بنا
دیں گے۔ اس وقت ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں کو شیر بننے کی
ضرورت ہے۔۔۔۔۔"

دشوار گزار جنگل میں چلتے رہنے کی وجہ سے میرا جسم پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ گرمی اور
لو بھی جنگل میں بہت تھا۔ ایک جگہ راستے میں پہاڑی ندی آگئی۔ ندی کا پاٹ چوڑا تھا
اس میں چھوٹے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ پانی پنڈلیوں تک تھا مگر اس کی رفتار تیز
تھا۔ جمیل دادا نے میرے بازو میں اپنا بازو ڈال دیا تھا۔ اس طرح ہم نے ندی پار کر لی۔

ندی کی دوسری طرف پھر جنگل ہی جنگل تھا۔ بائیں جانب یہ جنگل ایک ٹیلے کی
چڑھائی تک چلا گیا تھا۔ یہاں بانس اور دیودار کے درخت ایک دوسرے کی ساتھ ساتھ
لگے ہوئے تھے۔ جنگل جھاڑیاں قدم قدم پر ہمارا راستہ روک رہی تھی۔ اس جنگل کے

عین درمیان میں ایک اور ندی آئی۔ یہ ندی چھوٹی سی تھی اور اس کا پانی درختوں
چھن کر آنیوالی دھوپ میں چمک رہا تھا۔ یہاں ہم نے منہ ہاتھ دھوکر تھوڑی دیر آرام
اس کے بعد پھر آگے چل پڑے۔ کچھ دور جاکر درختوں کا گھنا پن چھٹنے لگا۔ درخت
دور ہوگئے۔ ان کے درمیان چھوٹی بڑی چٹانیں آگئیں جو زمین میں سے باہر نکلی
تھیں۔ جمیل دادا اب سنبھل سنبھل کر چلنے لگا تھا۔ اس نے ایک جگہ رک کر چٹانوں
جائزہ لیا۔ پھر سر ہلا کر بولا۔

"ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔"

ہم چند قدم آگے گئے ہوں گے کہ اچانک ایک چٹان کے پیچھے سے ایک آدمی نکل
ہمارے سامنے آگیا۔ اس آدمی کے ہاتھ میں رائفل تھی اور اپنی چہرے پر اس طرح
سبز صافہ باندھ رکھا تھا کہ مجھے اس کی صرف چمکتی ہوئی آنکھیں ہی نظر آرہی تھیں۔ میں
گھبرا گیا کہ ہو سکتا ہے یہ کوئی ڈاکو ہو۔ مگر جمیل دادا بڑے اطمینان سے کھڑے رہے۔
آدمی نے پوچھا۔

"کون ہو؟"

جمیل دادا نے جواب میں کہا۔

"کمانڈر سے کہو محمود غزنوی کے مجاہد آئے ہیں"

اس آدمی نے دوسرا سوال کیا۔

"کافروں کے کتنے بت توڑ کر آئے ہو؟"

جمیل دادا نے فوراً کہا۔

"ایک سو ایک۔۔۔۔۔"

اس آدمی نے اپنی بندوق کی نالی نیچی کرلی اور آگے چلتے ہوئے کہا۔

"میرے پیچھے پیچھے آجاؤ"

جمیل دادا نے مجھ سے سرگوشی میں کہا۔

"یہ کمال شاہ کے باڈی گارڈ کمانڈو ہیں۔ اور میں نے ہمارے درمیان جو مکالے

ہوئے ہیں وہ ہمارے خفیہ اشارے تھے جو صرف شاہ صاحب کے اپنے آدمیوں
کو ہی معلوم ہیں"

وہ آدمی ہمیں دو تین چٹانوں کے درمیان سے لے کر ایک بڑی چٹان کے پاس لے
آیا جہاں چٹان کے اندر ایک قدرتی غار بنا ہوا تھا۔ غار کے دہانے کے آگے اس طرح کا
ایک باڈی گارڈ فوجی انداز میں اٹن شن کھڑا تھا جس طرح کا باڈی گارڈ ہمارے آگے آگے
چل کر ہمیں وہاں لایا تھا۔ اس باڈی گارڈ نے بھی منہ سر سبز رنگ کے صافے سے ڈھانپ
رکھا تھا۔ ہاتھ میں رائفل تھی اور کمر کے گرد گولیوں کی پیٹی بندھی تھی۔ ہمارے والے
باڈی گارڈ نے ہمیں وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور غار کے دہانے پر کھڑے باڈی گارڈ سے دو
تین باتیں کیں۔ پھر وہ اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد باہر نکلا۔ ہمارے پاس آیا اور بولا۔

"کمانڈر نے تمہیں بلایا ہے۔ جاؤ"

جمیل دادا مجھے لے کر غار میں داخل ہوگئے۔

غار کے اندر کافی چوڑا راستہ بنا ہوا تھا۔

جمیل دادا کے چلنے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کمانڈو کمال شاہ سے مل بھی وہاں آچکا ہے۔ اس نے میرے کان کے قریب منہ لاتے ہوئے کہا۔

"کمال شاہ کو یہاں سب کمانڈر کہتے ہیں تم بھی انہیں اسی لقب سے مخاطب کرنا"

غار آگے جاکر بائیں طرف مڑگیا۔ آگے ایک کھلی جگہ آگئی۔ یہاں چٹان کی بھی کافی اونچی تھی اور اوپر چٹانی چھت میں ایک جگہ کسی شگاف میں سے دن کی اندر آرہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ زمین پر ایک جگہ شیر کی کھال بچھی ہوئی ہے۔ کھال پر ایک پختہ عمر کا آدمی چٹان کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہے۔ اس کے پا ایک طرف مٹی کی صراحی رکھی ہے۔ دیوار پر اس کے سر کے پیچھے سبز جزدان ہوئی کوئی کتاب لٹکی ہوئے ہے جو یقیناً" قرآن شریف ہی ہو سکتا تھا۔ اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس آدمی کی شرعی داڑھی تھی جس میں کثرت سے سفید بال آ رنگ صاف تھا۔ آنکھوں میں چیتے کی آنکھوں ایسی چمک تھی۔ جسم نہ بھاری تھا اس نے بھی سر پر سبز رنگ کا صافہ باندھ رکھا تھا۔ قریب ہی اس کی رائفل میگزین کی پیٹی پڑی تھی۔ جمیل دادا نے جاتے ہی السلام و علیکم کہا۔ یہ کمال شاہ مجا یا کمانڈر تھا۔ اس نے وعلیکم السلام کہہ کر جمیل دادا سے مصافحہ کیا۔ اور میری طرف

مجھ سے بھی مصافحہ کیا اور جمیل دادا سے پوچھا۔

"یہ نوجوان کون ہے؟"

جمیل دادا نے کہا۔

"کمانڈر! یہ پاکستان سے جہاد کشمیر میں شامل ہونے کے لئے آیا ہے۔ امرتسر والے سید صاحب نے انہیں آپ کے پاس کمانڈو ٹریننگ کے لئے بھیجا ہے۔"

کمال شاہ اسی دوران مجھے مسلسل گھورتے رہے۔ پھر پوچھا۔

"امرتسر والے سید صاحب کے پاس تمہیں کس نے بھیجا تھا؟"

میں نے اپنے والد صاحب کا نام لیا اور کہا کہ وہ سید صاحب کے دوست تھے اور آپ سے بھی ملا کرتے تھے۔ میرے والد صاحب کا نام سن کر کمال شاہ کمانڈو کی آنکھوں کی چمک مزید تیز ہوگئی۔ ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا اور میرے والد صاحب کا نام لے کر کہا۔

تو تم ــــــ صاحب کے بیٹے ہو؟"

میں نے ادب سے کہا۔ "جی ہاں"

انہوں نے میرے والد صاحب کی خیریت دریافت کی۔ میں نے کہا کہ وہ پاکستان میں فوت ہو چکے ہیں۔ پس اس پر کمال شاہ کمانڈو نے کسی قسم کے افسوس کا اظہار کئے بغیر دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"دعائے مغفرت"

ہم نے بھی اپنے اپنے ہاتھ اٹھا دیئے۔ کمال شاہ کمانڈو نے بلند آواز میں سورہ فاتحہ پڑھی اور اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر مجھ سے براہ راست مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کشمیر کی لڑائی میں لڑنے کا شوق تھا تو سیدھا کشمیر چلے جاتے۔ یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

میں ذرا ٹھٹک سا گیا۔ کمال شاہ کمانڈو سے مجھے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ میں نے بھی صاف لفظوں میں جواب دیا۔

"کمانڈر! میں مقبوضہ کشمیر جاکر آسانی سے مجاہدین میں شامل ہو سکتا تھا۔ مگر میں کمانڈو بن کر کشمیر کے جہاد میں شامل ہونا چاہتا ہوں"

"وہ کیوں؟"

کمال شاہ کمانڈو نے بھنوئیں اوپر چڑھاتے ہوئے پوچھا۔ میں نے کہا۔

"وہ اس لئے کمانڈر! کہ میں ایک مجاہد جوان بن کر دشمن کے ساتھ جھڑپ میں ایک دو کافروں کو مار سکتا ہوں۔ لیکن کمانڈو بن کر میں دشمن کے مورچوں کے پیچھے جاکر ان کے ایمونیشن ڈپو اڑا سکتا ہوں۔ ان کی سپلائی لائن تباہ کر سکتا ہوں۔ وہ پل اڑا سکتا ہوں جن پر سے دشمن کی فوج کے کنوائے ایمونیشن اور اسلحہ لے کر گزرتے ہیں۔ اس طرح میں اکیلا کمانڈو ایک بریگیڈ جتنی تباہی مچا سکتا ہوں"

کمال شاہ کمانڈو کی عقابی آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ میری با بڑے غور سے سن رہے تھے۔ جب میں اپنی بات ختم کر چکا تو انہوں نے کہا۔

"تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ کمانڈو جب اپنے مشن پر جاتا ہے تو زندہ واپس آنے کے لئے نہیں جاتا"

میں نے کہا۔

"کمانڈر! میں اسلام کے نام پر مرنے کے لئے آیا ہوں۔ لیکن مرنے سے پ کشمیری مسلمانوں کے سینے گولیوں سے چھلنی کرنے والی' میری کشمیری بہنو اور بیٹیوں کو بے عزت کرنی والی انڈین فوج کی دو چار چھاؤنیاں ضرور تباہ ک چاہتا ہوں۔ تب میری روح بڑی خوشی کے ساتھ میرے جسم سے نکلے گی۔"

جمیل دادا کے چہرے پر بھی میری باتیں سن کر ایک چمک سی آگئی تھی۔ کمانڈو کے چہرے سے صاف لگ رہا تھا کہ اس پر میری باتوں کا کوئی زیادہ اثر نہ اس نے پاس پڑی ہوئی رائفل اٹھا کر اپنے گھٹنوں پر رکھی اور مجھ سے پوچھا۔

"کیا تم نے کبھی گھوڑا دیکھا ہے؟"

کمانڈر کے اس سوال پر میں ہنس پڑا۔ مجھے ہنستا دیکھ کر کمال شاہ کمانڈو ایک دم غصے میں آکر بولا۔

"اچھا۔ ہنستے ہو۔ تمہاری ساری ہنسی نکال دوں گا بولو' کبھی گھوڑا دیکھا ہے؟"

میں ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔

"جی ہاں۔ دیکھا ہے"

اس نے کرخت لہجے میں دوسرا سوال کیا۔

"کیا کبھی خرگوش دیکھا ہے؟"

"جی ہاں دیکھا ہے"

"کبھی کوئی چیتا دیکھا ہے؟"

"جی ہاں۔ دیکھا ہے"

اب میں سوال کے فوراً بعد جواب دے دیتا۔ کمانڈر نے پوچھا۔

"کیا کبھی سانپ دیکھا ہے؟"

"جی ہاں۔۔۔۔ دیکھا ہے"

کمال شاہ نے رائفل پر زور سے ہاتھ مارا اور کہا۔

"تم نے گھوڑا دیکھا ہے مگر میں تمہیں گھوڑا بناؤں گا تم نے خرگوش کو دیکھا ہے مگر میں تمہیں خرگوش بنا کر جنگل میں دوڑاؤں گا۔ تم نے سانپ کو دیکھا ہے مگر میں تمہیں سانپ بنا کر یہ سکھاؤں گا کہ جب سانپ دشمنوں میں گھر جاتا ہے تو زمین اسے چھپنے کے لئے کیسے جگہ دے دیتی ہے۔ کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟"

میں کمانڈر کی اصل نیت سمجھ گیا تھا۔ وہ مجھے کمانڈو ٹریننگ کی تمام سختیوں سے آگاہ کر رہا تھا۔ میں نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"کمانڈر! میں اسلام کے نام پر شہید ہونے آیا ہوں۔ مگر آپ سے یہ گر سیکھنا ہے۔ چاہتا ہوں کہ شہید ہونے سے پہلے میں دشمن کے کتنے مورچے تباہ کر

سکتا ہوں۔ اس کے کتنے کنوائے برباد کر سکتا ہوں اور زیادہ سے زیادہ کافر کیسے
ہلاک کر سکتا ہوں۔ میں جموں کشمیر رائفلز کا صرف ایک ہندو فوجی مار کر شہید
نہیں ہونا چاہتا۔۔۔۔۔“

کمال شاہ کمانڈو نے جمیل دادا کی طرف دیکھا اور کہا۔

”دادا اب تم جاسکتے ہو۔ میں اس نوجوان کو پکا مسلمان بنا کر کشمیر کے محاذ پر بھیج
دوں گا“

جمیل دادا نے کمال شاہ کمانڈو سے ہاتھ ملایا۔ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

”خدا حافظ“

جمیل دادا چلا گیا۔ وہاں چائے آگئی۔ تام چینی کے گول ٹرے میں چائے کی چینک
اور دو پیالیاں رکھی تھی۔ باڈی گارڈ چائے رکھ کر باہر نکل گیا۔ کمال شاہ نے پیالیوں
چائے ڈال کر ایک پیالی مجھے دی۔ چائے کالی سیاہ تھی۔ اس میں دودھ بالکل نہیں تھا۔
نے ایک گھونٹ پیا تو معلوم ہوا کہ چائے میں چینی بھی نہیں ہے۔ میں نے بالکل نہ
کہ چائے ایسی کیوں ہے۔ کمال شاہ کمانڈو چائے پینے لگا۔ چائے پینے کے بعد وہ
کھال سے اٹھا۔ رائفل ایک طرف رکھی اور مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

”نماز پڑھتے ہو کہ نہیں؟“

میں نے کہا۔

”جی کبھی کبھی پڑھ لیتا ہوں“

کمال شاہ کمانڈو نے غصیلی آواز میں کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم کبھی کبھی مسلمان ہوتے ہو“

غار کے باہر دہانے پر دونوں باڈی گارڈ اٹن شن کھڑے تھے۔ کمال شاہ کمانڈو کو
دیکھ کر انہوں نے زور سے اپنی اپنی رائفل پر ہاتھ مارا۔ کمال شاہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”اذان دو“

اس وقت ایک کمانڈو نے ہتھیار زمین پر رکھ کر اذان دینی شروع کر دی۔ وہ

آواز سے اذان نہیں دے رہا تھا۔ میرا خیال ہے اس کی آواز چند گز کے فاصلے تک ہی
جاتی ہوگی۔ خدا جانے کہاں سے چھ سات باڈی گارڈ کے حلیے کے آدمی درختوں جھاڑیوں
کے پیچھے سے نکل آئے۔ ان سب نے سروں پر سبز صافے یا رومال باندھ رکھے تھے۔ میں
ان کی صرف آنکھیں ہی دیکھ سکتا تھا۔ یہ سب کمانڈو ہی تھے۔ ان میں سے ایک نے
امامت کرائی۔ ہم سب نے اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔ مجھے معلوم نہیں وہ نماز
کا وقت تھا یا نہیں۔ میرا خیال ہے ضرور نماز کا وقت ہو گیا ہوگا۔ نماز کے بعد کمانڈو یا
کمانڈر کمال شاہ نے میر طرف دیکھ کر کہا۔

”چل کر کھانا کھالو“

میں اس کے ساتھ دوبارہ غا کے اندر آگیا۔ ایک کمانڈو کھانا لے آیا۔ چار روٹیاں
تھیں جن کے اوپر تھوڑا سا اچار رکھا تھا۔ کمانڈر نے (میں اب کمال شاہ کمانڈو کو کمانڈر ہی
لکھوں گا) دو روٹیاں اور تھوڑا سا اچار ڈال کر مجھے پکڑا دیں۔ خود تھوڑا سا اچار اور دو
روٹیاں لے لیں اور کھانے لگا۔ یہ دوپہر کا کھانا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ رائفل سنبھال
کر اٹھا اور باہر نکلتے ہوئے بولا۔

”میرے ساتھ چلو“

غار میں ایک جگہ دیوار کے ساتھ کچھ رائفلیں اور گولیوں کی ایک بیلٹ پڑی تھی۔
اس نے ایک رائفل اور گولیوں کی بیلٹ اٹھا کر مجھے دی اور غار سے نکال کر پہاڑی ٹیلے
کے پاس لے گیا۔

”کبھی رائفل چلائی ہے؟“

میں نے کہا۔

”جی ہاں مگر ایک دو بار ہی چلائی ہے“

اس نے ٹیلے کے ایک درخت کا نشانہ لے کر فائر کیا۔ پھر مجھے رائفل میں میگزین
ڈال کر دی اور کہا۔

”درخت کو ٹارگٹ بنا کر فائر کرو“

میں نے فائر کیا۔ مجھے دھکا لگا۔ گولی ٹارگٹ پر بالکل نہ لگی۔ کمانڈر نے مجھے دوسری بار رائفل بھر کر دی اور کہا۔

"دوبارہ فائر کرو۔ نظر ٹارگٹ پر رکھو"

میں نے دوسری بار فائر کیا۔ مجھے پھر دھکا لگا۔ میں ذرا پیچھے کو لڑکھڑا گیا اور گولی خدا جانے کہاں کی کہاں نکل گئی۔ کمانڈر نے تیسری بار رائفل بھر کر مجھے دی اور کہا۔

"ایک بار پھر فائر کرو"

تیسری بار بھی گولی نشانہ پر نہ لگی۔ لیکن اس دفعہ رائفل کا دھکا لگتے ہی میں اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ کمانڈو نے زور سے میرے کاندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"شاباش جوان! تم نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اچھا کیا۔ جب تمہیں اپنے آپ کو سنبھالنا اور رائفل کے دھکے کو اپنے بدن میں جذب کرنا آجائے گا تو تمہارا نشانہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ اب میرے ساتھ آگے چلو"

میں نے رائفل کاندھے پر ڈال لی۔ میگزین کی پیٹی کمر کے ساتھ باندھ لی اور کمانڈر کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ہم جنگل کے ایک تنگ سے راستے سے جھاڑیاں ہٹاتے گزر رہے تھے کمانڈر نے میری طرف دیکھے بغیر آگے کی طرف چلتے ہوئے کرخت آواز میں کہا۔

" جانگلی انسان جھاڑیوں میں چلتے ہوئی آواز پیدا نہ کرو۔ خرگوش کی طرح چلو"

میں شرمندہ سا ہو گیا مگر یہ ٹریننگ تھی۔ میں نے فورا" کہا۔

"یس سر!"

کمانڈر رک گیا۔ پلٹ کر میری طرف دیکھا اور مجھے کندھے سے پکڑ کر جنجھوڑتے ہوئی کہا۔

"ہم یس سر نہیں ہمیں صرف کمانڈر بولو تم مسلمان مائی باپ کی اولاد ہو انگریز کی اولاد نہیں"

میں نے فورا" کہا۔

"ٹھیک ہے کمانڈر"

کمانڈر نے کرخت لہجے میں کہا۔

"اب چلو۔ ایڈوانس کرو۔ ڈبل سے چلو"

اور وہ میرے آگے آگے ڈبل سے دوڑنے لگا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ڈبل مارچ کرتے ہوئے دوڑنے لگا۔ جھاڑیاں میرے جسم کے ساتھ الجھ رہی تھیں مگر میں ڈبل مارچ کرتا چلا جا رہا تھا۔ درختوں میں اس قدر حبس اور گرمی تھی کہ میرے بدن سے پسینے بہنے لگے۔ آگے ٹیلے کی چڑھائی تھی۔ کمانڈر نے ہاتھ کا اشارہ کر کے کہا۔

"اب تم ہمارے پیچھے پیچھے پہاڑ کے اوپر چڑھے گا۔"

ایک تو ٹیلے کی چڑھائی بڑی دشوار تھی دوسرے جگہ جگہ کانٹے دار جھاڑیاں تھیں۔ ٹیلے کے اوپر پہنچتے پہنچتے میرا برا حال ہو گیا۔ ہاتھوں میں خراشیں پڑ گئیں۔ چہرے پر بھی خراشیں آگئیں تھیں۔ سانس بری طرح پھول گیا تھا۔ جسم پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ میں نے اوپر پہنچتے ہی اپنی جیکٹ اتار دی کمانڈر نے سختی سے کہا۔

"جیکٹ نہیں اتارے گا۔"

میں نے جلدی سے جیکٹ دوبارا پہن لی۔ میری کمانڈو ٹریننگ شروع ہو گئی تھی۔ روکھی روٹیوں پر تھوڑا سا اچار ڈال کر جو اس کمانڈر نے مجھے کھلایا تھا۔ وہ پسینہ بن کر نکل چکا تھا۔ مجھے پیاس محسوس ہونے لگی۔ مگر میں ڈر کے مارے چپ رہا کہ خدا جانے کمانڈر مجھے کیا پینے کو کہہ دے۔ کمانڈر مجھ سے عمر میں بہت بڑا تھا۔ وہ بڑھاپے کی دہلیز میں قدم رکھ چکا تھا مگر اس کا سانس میرے مقابلے میں اتنا نہیں پھولا تھا۔ وہ لوہے کے اعصاب کا آدمی بن چکا تھا۔ بڑی مشکل سے ٹیلے پر میں نے پانچ منٹ آرام کیا ہو گا کہ کمانڈر ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"واپس اپنے ہائیڈ آؤٹ میں جائے گا۔ گو۔ گو۔"

اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر ٹیلے کی ڈھلان پر دھکا دے دیا۔ میں جھاڑیوں میں گر پڑا۔ مگر جلدی سے اٹھا اور تیز تیز ڈھلان اترنے لگا۔ وہ بھی خرگوش کی طرح چھلانگیں لگاتا میرے آگے آگے ڈھلان اتر رہا تھا۔ اس وقت مجھے اپنے اوپر خرگوش ہونے کا گمان

ہونے لگا تھا۔ جب وہ مجھے غار کے پاس واپس لایا تو میرا برا حال ہو رہا تھا۔ سارا بدن درد کرنے لگا تھا۔ پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ ایک طرف ہو کر درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ ایک باڈی گارڈ یا کمانڈو ہمارے لئے پانی کا جگ بھر کر لے آیا۔ کمانڈر نے جگ مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"اس کے صرف چار گھونٹ سے زیادہ مت پینا"

مجھے گھوڑے کی پیاس لگی ہوئی تھی۔ مگر کمانڈر کا حکم تھا۔ میں نے اپنے اوپر جبر کر کے صرف چار گھونٹ پیئے۔ کمانڈر نے جگ مجھ سے لے لیا اور خود بھی گن کر چار گھونٹ پیئے۔ پھر بولا۔

"اب تم ادھر لیٹ کر آرام کرے گا"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ میں وہیں لیٹ گیا۔ لیٹنے سے میرے بدن کو کافی آرام ملا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگا کیا میں یہ کمانڈو ٹریننگ برداشت کر سکوں گا؟ میرے اندر سے ایک آواز آئی۔ "یہاں سے اٹھ کر واپس بھاگ جاؤ" دوسری آواز آئی۔ "شرم کرو۔ گھر سے کافر دشمن سے جنگ کرنے نکلے ہو کیا منہ لے کر واپس جاؤ گے؟ باپ کی روح کو حشر کے دن کیا منہ دکھاؤ گے؟" میں نے فیصلہ کر لیا کہ چاہئے کچھ ہو جائے میں اب پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ پھر مجھے نیند آگئی۔ کسی نے میرا بازو زور سے ہلا کر مجھے جگا دیا۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ سارا بدن بری طرح اکڑا ہوا تھا۔ شام کے سائے جنگل کے درختوں میں اترنا شروع ہو گئے تھے۔ کمال شاہ کا ایک باڈی گارڈ مجھے جگا رہا تھا۔ اس نے اشارے سے کہا۔

"اندر چلو"

وہ مجھے غار میں کمانڈر کمال شاہ کے پاس لے آیا۔ کمانڈر اسی طرح شیر کی کھال پر اپنی کمانڈو کی وردی میں رائفل گھٹنوں پر رکھے بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے سنگترہ کھانے کو دیا اور پوچھا۔

"اب کیا خیال ہے تمہارا؟ اگر ارادہ بدل لیا ہے تو مجھے بتا دو۔ میرا آدمی تمہیں

جنگل سے پار لے جائے گا۔ پھر تم واپس اپنے ملک چلے جانا"

میں نے کہا۔

"کمانڈر جب تک میری ٹریننگ پوری نہیں ہو جاتی میں واپس نہیں جاؤں گا"

کمانڈر مسکرایا۔

"شاباش! تم بہادر نوجوان ہے۔ پاکستان کو تم ایسے بہادر جوانوں کی ضرورت ہے۔ میں پاکستان کے سارے جوانوں کو ٹریننگ دے کر کمانڈو بنا دینا چاہتا ہوں۔ تمہارا مقابلہ ایک ایسی مکار قوم سے ہے جس نے پاکستان کے وجود کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ ہندو تمہارا دشمن ہے۔ تمہارے پاکستان کا دشمن ہے۔ وہ تمہارے ملک پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اس لئے کہ پاکستان کے تمام جوانون کو کمانڈو بن کر شیروں کی طرح دشمن کے آگے ڈٹ جانا ہو گا"

میں نے محسوس کیا کہ کمال شاہ کمانڈو جب مجھے کمانڈو ٹریننگ دے رہا تھا تو اس کا لہجہ ں پنجاب رجمنٹ کے کسی تربیت یافتہ تجربہ کار کمانڈو کا تھا۔ اس وقت جب وہ میرے نے بیٹھا تھا تو بڑی شستہ اردو زبان میں بات کر رہا تھا۔ ٹریننگ کے دوران وہ مجھے ٹ کا کوئی فوجی لگتا تھا۔ اب وہ مجھے کسی اردو بولنے والے صوبے کا آدمی لگتا تھا۔

رات کو عشاء کی نماز بھی وہیں درختوں کے نیچے باجماعت پڑھی گئی۔ اس کے بعد ب کا الاؤ روشن ہو گیا۔ کمانڈر کے آدمی جنگل میں سے ایک ہرن اور دو چار جنگلی مرغ ر لے آئے۔ انہیں صاف کر کے سیخ پر چڑھا کر آگ کے اوپر لٹکا دیا گیا۔ سب نے مل بھنی ہوئے مرغ اور ہرن کا گوشت کھایا۔ رات ذرا گہری ہوئی تو کمانڈر نے ایک چھوٹی ھاس پھونس کی جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا اور خالص فوجی صوبیدار انسٹرکٹر کے لہجے مجھے حکم دیا۔

"اب تم اس جھونپڑی میں جا کر سو جائے گا"

میں اٹھا اور حکم کی تعمیل میں جھونپڑی میں چلا گیا۔ جھونپڑی میں بڑا حبس تھا۔ مچھر تھے۔ کمانڈر ابھی باہر الاؤ کے پاس ہی بیٹھا اپنے آدمیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ میں نے

باہر آ ر کہا۔

"کمانڈر! جھونپڑی کی بجائے میں باہر سو جاؤں تو کوئی اعتراض تو نہیں آپ کو؟"

کمانڈر نے سختی سے کہا۔

"تم جھونپڑی کے اندر ہی سوئے گا۔ ہمارا ڈسپلن خراب نہ کرو۔ نہیں تو ہم تمہیں باڈر پار بھیج دے گا"

میں خاموشی سے واپس جھونپڑی میں آگیا۔

کچھ پہاڑی ٹیلوں کی اترائی چڑھائی اور جنگل میں ڈبل مارچ کا سخت تھکا ہوا تھا۔ ہرن کے گوشت کی خماری چڑھی ہوئی تھی۔ جھونپڑی میں گھاس کا نرم بستر بچھا تھا۔ ہی غنودگی طاری ہونی شروع ہو گئی۔

اس کے بعد مچھر مجھے کاٹتے رہے مگر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ خدا جانے کتنی دیر سویا ہوں گا کہ کسی نے مجھے پاؤں سے ٹھوکر مار کر جگا دیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ جھونپ میں اندھیرا تھا۔ میرے پاس ایک اونچا لمبا انسانی سایہ کھڑا تھا۔ مجھے کمانڈر کی کرخت آ آئی۔

"چلو اوئے اٹھو"

میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر ابھی تک غنودگی کے عالم میں تھا۔ میں نے پوچھا

"کہیں جانا ہے کمانڈر؟"

کمانڈر نے مجھے جھونپڑی کے باہر دھکا دیتے ہوئے کہا۔

"ابھی بتاتا ہے کہاں جانا ہے۔"

جھونپڑی کے باہر آکر میں نے دیکھا کہ ابھی رات ہی تھی۔ خدا جانے ابھی کت رات باقی تھی۔ صبح نہیں ہوئی تھی۔ باہر ایک درخت کے ساتھ لالٹین جل رہی تھی۔ کمانڈر اپنی کمانڈو وردی میں تھا اور رائفل اس کے کندھے سے لٹک رہی تھی۔ باہر آ اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر کہا۔

"اب یہاں سے میرے ساتھ دوڑ لگائے گا۔"

سٹارٹ-----"

وہ دوڑ پڑا۔ میں بھی اس کے پیچھے دوڑنے لگا۔ ہم بالکل اس طرح دوڑ رہے تھے طرح آج کل لوگ جوگنگ کرتے ہیں۔ کمانڈر میرے آگے آگے تھا۔ جنگل میں رات اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مگر کمانڈر جنگل کے ایسے علاقے میں مجھے اپنے ساتھ دوڑا رہا تھا اں جھاڑیوں کو صاف کر کے پتلا سا راستہ بنا دیا گیا۔ اس نے میرے کندھے سے بھی ائفل لٹکا دی تھی۔ رات کے اندھیرے میں راستہ دھندلا دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ کچھ دور نے کے بعد دوڑتے دوڑتے کمانڈر نے اپنی رائفل کندھے سے اتار کر ہاتھ میں اس طرح ڑ لی جس طرح دشمن کی کسی پوسٹ پر چارج کرتے ہوئے فوجی پکڑ لیتے ہیں۔ اس نے د آواز میں مجھے حکم دیا۔

"رائفل اٹیک پوزیشن میں کر لو"

میں نے جلدی سے رائفل کاندھے سے اتار کر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لی اور خدا کا ر ادا کیا۔ کیونکہ کاندھے پر لٹکی ہوئی رائفل بار بار میری کمر سے ٹکرا کر مجھے سخت اذیت ے رہی تھی۔ ہم دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ درختوں کے بیچ میں جنگلی جھاڑیوں کے رمیان بنائی گئی پگ ڈنڈی ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ ادھر ادھر مڑ جاتی تھی۔ ختم نہیں ی تھی۔ دوڑتے دوڑتے میرا سانس پھول گیا۔ جسم پسینے میں شرابور ہو گیا۔ مگر میں رک یں سکتا تھا۔ میرا انسٹرکٹر اور مجاہد کمانڈو کمال شاہ عرف کمانڈر جوانوں کی طرح کو ٹیک ح کرتا دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ میرا خیال ہے کوئی چھ سات میل ہم ضرور دوڑے ہوں گے جگہ آگے تالاب آگیا۔ کمانڈر وہاں رک گیا۔ پلٹ کر بولا۔

"اب تم یہاں بیٹھ جائے گا۔ جب تک ہم واپس نہیں آئے گا تم ادھر ہی بیٹھا رہے گا۔"

یہ کہہ کر وہ تالاب کی طرف دوڑتا ہوا درختوں کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ یا یہ شخص اتنے بیابان جنگل میں آدھی رات کو مجھے کس لئے اکیلا چھوڑ گیا ہے۔ میں یہ تا ہوا وہیں بیٹھ گیا اور رائفل میں نے اپنے ہاتھوں میں پکڑ لی کہ اگر کسی طرف سے

کوئی جنگلی درندہ آگیا تو اس پر فائر کر سکوں گا۔ کچھ دیر بعد میرا سانس ٹھیک ہوا تو میں
اندھیرے میں گھور گھور کر ماحول کا جائزہ لیا۔ بڑے بڑے درخت سنسان جنگل کی
کے اندھیرے میں بھوتوں کی طرح کھڑے تھے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ یہ بڑا ڈر
سناٹا تھا۔ یوں لگتا کہ ابھی کس طرف سے کوئی شیر یا کوئی چڑیل نکل کر مجھ سے چمٹ
گی۔ کمانڈر مجھے اندھیرے جنگل میں اکیلا چھوڑ کر نہ جانے کدھر غائب ہوگیا تھا۔
دور سے شیر کی دھاڑ سنائی دی۔ میں خوفزدہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسری بار شیر کی
بالکل قریب سے سنائی دی۔ شیر کی دہشت نے مجھے پتھر کی طرح ساکت کردیا۔
رائفل میرے ہاتھ میں تھی مگر موت سامنے نظر آرہی تھی۔ شیر کہاں مجھے رائفل
کرنے کا موقع دے گا۔ شیر تیسری بار دھاڑا تو میں نے رائفل وہیں پھینکی اور درخت
طرف بھاگا درخت کی شاخوں کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا مگر مجھ پر ایسا خوف طاری تھا
شاخوں پر ہاتھ نہیں پڑ رہا تھا۔ آخر ایک بار میں اپنے جسم کی پوری طاقت لگا کر اچھلا
شاخ کو پکڑ لیا۔ پھر ٹانگوں کو جھلا کر ٹہنی سے لپٹ گیا۔ شیر اچھل کر مجھے پکڑ سکتا تھا۔
اندھیرے میں شاخوں کو ادھر ادھر ہٹاتا اوپر والے ایک دو شاخے پر جا کر بیٹھ گیا۔

مجھ پر واقعی شیر کا خوف طاری تھا۔ اس کے بعد شیر کی دھاڑ سنائی نہ دی۔
کسی دوسری طرف نکل گیا تھا۔ لیکن میں اس قدر ڈرا ہوا تھا کہ وہیں درخت کے
شاخے پر بیٹھا رہا۔ اگرچہ مجھے مچھر اور چیونٹیاں کاٹ رہی تھیں۔ بیٹھے بیٹھے جب مجھے
دیر ہوگئی اور مچھروں اور چیونٹیوں سے جنگ کرنے کی طاقت نہ رہی تو میں درخت
نیچے اتر آیا۔ نیچے اترتے ہی میں نے رائفل اٹھائی اور اس کو تان کر درخت کے
ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس ڈر سے کہ اگر اچانک شیر کسی طرف سے نکل آیا تو اس پر
کردوں گا۔ شیر کو گولی لگے یا نہ لگے مگر رائفل کے دھماکے کی آواز سے کم از کم وہ ڈر کر
ضرور بھاگ جائے گا۔ میں اسی پوزیشن میں رائفل تانے بیٹھا رہا۔ شیر بھی نہ آیا
کمانڈر بھی نہ آیا۔

پو پھٹنے لگی۔ جنگل میں پچھلے پہر کا ہلکا ہلکا نور سا پھیلنے لگا۔ درختوں کے

جھاڑیوں کے خاکے واضح ہونے لگے۔ میں تھوڑی تھوری دیر بعد آنکھیں پھاڑ کر چاروں
طرف کا جائزہ لے لیتا تھا۔ درختوں پر پرندوں کی چہکاریں شروع ہوگئیں۔ ایک لنگور نے
سامنے والے درخت سے میرے والے درخت پر چھلانگ لگائی اور پھر ایک شاخ پر جھولتا
ہوا تیسرے درخت کی طرف نکل گیا۔ تالاب جھاڑیوں کی اوٹ میں تھا۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا
کہ صبح صبح کوئی جنگلی درندہ پانی پینے نہ آجائے۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر ایسی صورت
حال پیدا ہوگئی تو میں دھڑا دھڑ فائرنگ کرنے لگوں گا۔ میرے پاس گولیوں کی کمی نہیں
تھی۔ میں حیران تھا کہ کمانڈر میرے پاس واپس کیوں نہیں آیا۔ میرے دل میں خیال آیا
کہ شاید وہ میری ہمت اور حوصلے کا امتحان لینا چاہتا ہے۔ مجھے یقین ہوگیا کہ وہ اب نہیں
آئے گا۔ دن کی سفید سفید روشنی جنگل میں اتر آئی تھی۔ واپسی کا راستہ مجھے معلوم تھا۔
چنانچہ میں اٹھا اور واپس اس چھوٹے سے تنگ راستے پر چل پڑا جو جھاڑیوں کو کاٹ کر بنایا
گیا تھا۔

دن کی روشنی میں مجھے اتنا ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ تاہم رائفل میں نے ہاتھوں میں اس
طرح پکڑ رکھی تھی کہ ذرا سے خطرے پر فوراً" فائر کر سکتا تھا۔ خدا خدا کر کے جنگل کا راستہ
ختم ہوا۔ جب میں کمانڈر کے ہائیڈ آؤٹ پر واپس آیا تو دن کافی نکل آیا تھا۔ سورج
درختوں کے اوپر کافی بلندی پر آگیا ہوا تھا۔ غار کے باہر کوئی بھی آدمی نظر نہ آیا۔ میں اپنے
گھاس پھونس کے جھونپڑے کے باہر زمین پر بیٹھ گیا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ کمانڈر
مجھے آدھی رات کو جھونپڑے سے اٹھا کر لے گیا تھا۔ اتنے میں کمانڈر غار میں سے نکلا۔
اس کے ساتھ دونون باڈی گارڈ تھے۔ غار کے باہر آکر اس نے میری طرف دونوں باڈی
گارڈ تھے۔ غار کے باہر آکر اس نے میری طرف دیکھا اور اکیلا میرے پاس آگیا۔
میں جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ کمانڈر نے مجھے یہ پوچھنے کی بھی ضرورت محسوس
کی کہ جنگل میں میری رات کیسی گزری۔ اس نے یہ بھی نہ بتایا کہ وہ مجھے چھوڑنے کے
واپس کیوں نہیں آیا تھا۔ بس میری طرف ایک نظر دیکھا اور فوجی انسٹرکٹروں والے
کرخت لہجے میں کہا۔

"اب تم اپنی جھونپڑی میں بیٹھ کر کھانا کھائے گا۔ اس کے بعد تمھاری ضابطے کے ساتھ ٹریننگ شروع ہوگا۔ گو۔"

میں جھونپڑی میں جاکر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک باڈی گارڈ میرے لئے کھانا آیا۔ دو روٹیاں اور اس کے اوپر رکھا ہوا رات والے ہرن کے گوشت کا ٹکڑا۔ میں باڈی گارڈ سے کہا۔

"مجھے اتنی بھوک نہیں ہے بھائی۔ یہ تو ناشتے کا وقت ہے۔"

باڈی گارڈ نے کوئی جواب نہ دیا اور چلا گیا۔ میں نے بمشکل ایک روٹی ہرن گوشت کے ساتھ کھائی۔ اس روز مجھے صبح کے وقت چائے بھی نہ ملی۔ باہر سے کمان آواز آئی۔

"نیا رنگروٹ باہر نکلو۔ ڈبل سے۔۔۔۔"

میں جلدی سے اٹھ کر باہر آگیا۔ کمانڈر کمانڈو کی فل وردی میں رائفل کاند لٹائے کھڑا تھا۔ سبز رومال سر پر باندھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھا اور یہ کہکر چل پڑا۔

"ایڈوانس۔۔۔۔۔۔"

میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہ مجھے جنگل کے ایک اور راستے پر چلاتا ہوا کھلی وادی میں لے آیا۔ یہ وادی چھوٹی سی تھی۔ چاروں طرف پہاڑیاں تھیں۔ درم میں اونچی نیچی زمین پر کہیں اونچی اونچی گھاس تھی اور کہیں درختوں کے جھنڈ الگ ا ہو کر کھڑے تھے۔ کمانڈر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ میں بیٹھنے لگا تو اس نے چلا کر کہا۔

"تم یہاں بیٹھ کر آرام کرنے نہیں آیا۔ یہ تمھاری خالہ کا ریسٹ ہاؤس نہیں ہے۔ چلو۔ اس وادی کے دو چکر لگاؤ۔ ڈبل مارچ کرتے ہوئے۔ گو۔۔۔۔"

اس نے اتنی زور سے فوجی انداز میں "گو" کہا کہ میں بے اختیار دوڑ پڑا۔ وادی گرداگرد ایک پگ ڈنڈی بنادی گئی تھی۔ یہاں نئے رنگروٹوں سے دوڑیں لگوائی تھیں۔ میں ڈبل مارچ کرتا جارہا تھا۔ ایک جگہ تھک کر ذرا رکا تو دور سے کمانڈر کی

واز آئی۔

"ابھی ریسٹ نہیں کرے گا تم۔ گو"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ کمانڈر ایک اونچی جگہ پر بیٹھا مجھے برابر نگاہ میں رکھے ہوئے تھا۔ زیادہ کیا بتاؤں۔ بس یوں سمجھ لیں کہ جب میں نے وادی کے دو چکر پورے کئے تو میں خچر کی طرح ہانپ رہا تھا اور پسینے میں شرابور تھا۔ کمانڈ خوش ہو کر بولا۔

"شاباش! اب تم پورا خچر بن گیا ہے ہم تمہیں پہلے خچر بنائے گا۔ پھر گھوڑا بنائے گا۔ اس کے بعد تمہارے کان کھینچ کھینچ کر خرگوش بنادے گا۔"

دوپہر تک کمانڈر مجھے دوڑاتا' ٹیلوں پر چڑھاتا اتارتا رہا۔ ایک جگہ برساتی جوہڑ تھا جس کا پانی سبزی مائل تھا۔ وہاں آکر کمانڈر نے حکم دینے کے لہجے میں کہا۔

"اب تم اس تالاب کے پانی سے اپنی پیاس بجھائے گا۔ پانی کو ہاتھ سے ادھر ادھر ہٹائے گا۔ پھر صرف ایک کپ پانی پیئے گا۔"

جوہڑ کا پانی اتنا گندا لگ رہا تھا کہ میں نے کہا۔

"کمانڈر مجھے پیاس نہیں ہے"

حالانکہ مجھے بڑی پیاس لگی تھی مگر میں جوہڑ کا گندا پانی نہیں پینا چاہتا تھا۔ کمانڈر نے اکر کہا۔

"تمہارا مائی باپ بھی یہ پانی پیئے گا۔ گو"

اس نے مجھ پر رائفل تان لی۔ میں خوف زدہ ہوگیا۔ مجھے اس شخص سے ڈر لگنے لگا تھا۔ اس کا کوئی پتہ نہیں تھا کہ سچ مچ مجھے گولی ہی مار دے۔ میں نے جھک کر جوہڑ کے پانی کو ہاتھ سے ادھر ادھر ہلایا اور آنکھیں بند کرکے دو چلو پانی پی گیا۔ کمانڈر کی آواز آئی۔

"شاباش! اب تم اس جوہڑ میں غوطہ لگا کر اس کے دوسرے کنارے پر جائے گا۔ اگر تم نے سر پانی سے باہر نکالا تو ہم فائر کردے گا"

میں کمانڈر کے اس عجیب و غریب حکم پر حیران پریشان ہی ہو رہا تھا کہ اس نے مجھے

جوہڑ میں دھکا دے دیا۔ میں نے ناک منہ آنکھیں بند کرلیں۔ جوہڑ کے پانی کی تہہ پر
درختوں کی جھاڑیاں تھیں ان میں میرا پاؤں پھنس گیا۔ مگر میں نے جلدی سے اسے کھینچ
نکالا اور جتنی تیزی سے پانی کے اندر رہ کر تیر سکتا تھا تیرتا ہوا دوسرے کنارے کی طرف
چل پڑا۔ خدا کا شکر ہے کہ جس وقت کمانڈر نے مجھے جوہڑ میں دھکا دیا اس وقت یہ
سانس اوپر کی طرف لے رہا تھا اور میرے جسم میں کافی آکسیجن تھی۔ جوہڑ زیادہ چوڑا نہیں
تھا۔ پھر بھی ایک سانس میں غوطہ لگا کر پانی کے اندر ہی اندر تیر کر دوسرے کنارے تک
جانا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ جبکہ پانی کے اندر جو جھاڑ جھنکاڑ تھا وہ بھی میرا راستہ روک
تھا۔ مگر میں اس طرح مرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں آزادی کشمیر کی لڑائی میں جاکر مرنا چاہتا تھا
میرے اندر زبردست طاقت آگئی۔ اور میں نے ایک ہی سانس میں جوہڑ کو پار کرلیا۔ جب
میرے ہاتھ پانی کے اندر دوسرے کنارے کی دیوار سے ٹکرائے تو میں نے سر باہر نکالا
لیا۔ کمانڈر کی گولی کا ڈر برابر لگا ہوا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے جوہڑ پار کرلیا تھا۔ کمانڈر
پہلے ہی سے دوسرے کنارے پر آکر کھڑا ہوگیا تھا۔ اس نے ہاتھ دے کر مجھے جوہڑ سے باہر
کھینچ لیا۔ میں لمبے لمبے سانس لینے لگا اپنے بازو دیکھے تو دہشت سے میری چیخ نکل گئی
میری کہنیوں تک بازوؤں کے ساتھ جونکیں چمٹی ہوئی تھیں۔ میں نے جلدی جلدی
ساری جونکیں کھینچ کھینچ کر اتاریں۔ اسی طرح پنڈلیوں پر بھی جونکیں چمٹ کر میرا خون
چوس رہی تھیں۔ دو جونکیں میری گردن سے بھی لگی ہوئی تھیں۔

کمانڈر پاس کھڑا تماشہ دیکھ رہا تھا۔

"شاباش! اب میرے پیچھے آجاؤ"

وہ آگے چل پڑا۔ جونکوں سے نجات حاصل کرنے کے بعد میں بھی اس کے
روانہ ہوگیا۔ وہ مجھے بڑی بڑی چٹانوں کے درمیان ایک ایسی جگہ پر لے آیا جہاں شفا
پانی کا چشمہ بہہ رہا تھا۔ کمانڈر نے حکم دیا۔

"اس میں تم نہائے گا۔ کپڑے دھوئے گا۔
گو۔۔۔۔۔گو"

وہ ایک طرف جھاڑیوں کے پاس رائفل لے کر بیٹھ گیا۔ میں چشمے میں اتر گیا۔
پانی شفاف تازہ پانی میں کپڑے اتار کر دھوئے۔ اچھی طرح غسل کیا اور جوہڑ کے پانی کی
ساری آلائشیں دھوڈالیں۔ پھر کپڑے نچوڑ کر گیلے ہی پہن لئے۔

اس دوران کمانڈر نے اپنا کمانڈو نائف یعنی خاص قسم کا چاقو نکالا ہوا تھا اور اسی سے
درخت کی ٹہنیاں کاٹ رہا تھا۔ پھر اس نے وہاں آگ جلائی اور مجھے کہا۔

"تم اس سامنے والی جھاڑی میں جائے گا وہاں تمہیں ایک بڑا مینڈک بیٹھا ہوا
ملے گا تم اسے پکڑ کر ہمارے پاس لائے گا۔۔۔۔۔گو"

میں مشین کی طرح جھاڑی کی طرف دوڑ پڑا۔ جھاڑی میں غور سے جھک کر دیکھا۔
ایک طرف سے مینڈک کی آواز آئی۔ خدا جانے یہ مینڈک وہاں کہاں سے آگیا تھا۔ مجھے
یقین ہے کہ یہ مینڈک کمانڈر نے خود وہاں رکھا تھا۔ میں نے مینڈک کو لپک کر پکڑ لیا اور
کمانڈر کے پاس لے آیا۔ کمانڈر نے میرے دیکھتے دیکھتے چاقو سے مینڈک کی گردن الگ کر
دی۔ اس کا پیٹ چاک کرکے انتڑیاں وغیرہ نکال کر پھینک دیں۔ پھر اسے آگ پر رکھ کر
بھوننے لگا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ مینڈک کس لئے بھون رہا ہے۔ اچانک میرا دل
اچھل کر میرے حلق کے قریب آگیا۔ کہیں یہ مینڈک مجھے کھلانے کے لئے تو نہیں بھون
رہا۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کمانڈر نے مینڈک کی ایک ٹانگ کاٹ کر میری طرف
پھینکی اور کہا۔

"اب تم اس کو کھا جائے گا۔۔۔۔۔گو"

دوسری ٹانگ کمانڈر خود چبانے لگا۔ میں نے زندگی میں کبھی مینڈک نہیں کھایا تھا۔
مینڈک کھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے کہا۔

"کمانڈر! میں نے کبھی مینڈک نہیں کھایا"

کمانڈر بولا۔

"تمہارے سامنے اگر ہم مینڈک کی ٹانگ کھاتا ہے تو تمہیں بھی کھانا پڑے گا۔
نہیں تو تمہیں گولی مار دے گا۔۔۔۔۔گو"

اور کمانڈر نے رائفل کی نالی کا رخ میری طرف کر دیا۔ اس عجیب وغریب سخت
ضدی شخص سے کسی چیز کی بھی توقع کی جاسکتی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور مینڈ
کی ٹانگ میں ڈال کر چبانے لگا۔ میں نے ناک کے ذریعے سانس لینا بھی بند کر دیا تھا
مجھے مینڈک کے جلے ہوئی گوشت کی بو نہ آئے۔ میرا خدا ہی جانتا ہے کہ میں نے
عذاب کے ساتھ مینڈک کی ٹانگ کھائی۔ جب کھا چکا تو کمانڈر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے
حکم دیا۔

"اپنے پاؤں کے جوتوں سے اس آگ کو اچھی طرح بجھادو۔ گو۔۔۔۔۔"

اب تم اس تالاب کے گرد پندرہ چکر پورے کرے گا۔ ہم یہاں کھڑے ہو کر
رہے گا۔ پورے پندرہ چکر لگائے گا۔ گو"

وہ کڑک کر بولا۔ میں روبوٹ مشین کا آدمی بن گیا تھا۔ اس نے گو کہا اور میں
پڑا۔ تالاب کا حلقہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ پھر بھی پندرہ چکر لگاتے لگاتے میں ہلکان ہو گیا
پندرہ چکر پورے ہوگئے تو میرا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔ کمانڈر نے خوش
مجھے دیکھا اور بولا۔

"شاباش جوان! اب تم گھوڑا بن گیا ہے۔ پورا گھوڑا بن گیا ہے۔ اب واپس
اپنے ہیڈ کوارٹر جائے گا۔"

جس وقت ہم واپس کمانڈر کمال شاہ کے غار والے خفیہ ٹھکانے پر آئے تو دن
شروع ہوگیا تھا۔ تھکان کے مارے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ کمانڈر میرے ساتھ
جھونپڑے میں آکر بیٹھ گیا۔ وہاں چائے آگئی۔ ساتھ بسکٹ بھی تھے۔ اب کمانڈر پھر
شاہ بن گیا تھا۔ شستہ اردو میں کہنے لگا۔

"میں نے تمہارے اس آہنی عزم کو دیکھ لیا ہے جو تمہارے خون میں گردش کر
رہا ہے۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔ میں پاکستان کے ہر جوان کے خون میں
اس عزم کو گردش کرتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ قائداعظم نے مسلمانوں کو یہی آہنی
عزم عطا کیا تھا۔ پاکستان کی نئی نسل کو اس آہنی عزم کے ساتھ اپنے ملک کی

ترقی کے لئے قربانیاں دینی ہیں۔ یاد رکھو۔ یہ تمہارے آرام کرنے کے نہیں
کام کرنے کے دن ہیں۔ انتھک محنت کرنے اور ہر وقت فوجی جوان کی طرح
چوکس رہنے کے دن ہیں۔ تمہارا دشمن، تمہارے وطن پاکستان کا دشمن
تمہارے سر پر کھڑا ہے۔ وہ موقع کی تلاش میں ہے اسے موقع ہرگز نہ دینا۔
اسے یقین دلا دو کہ تم اسلام کے سپاہی ہو۔ محمود غزنوی اور محمد بن قاسم اور
سلطان صلاح الدین ایوبی کی فوج کے سپاہی ہو۔ اپنی سرحد کو پہچانو۔ اپنے
دشمن کو پہچانو۔ اپنے فرض کو پہچانو۔ پھر دنیا کی کوئی مخالف طاقت پاکستان کو اپنی
جگہ سے نہیں ہلا سکتی۔ یاد رکھو مسلمانوں نے پاکستان کے لئے بے بہا قربانیاں
دی ہیں۔ یہ ملک قائم رہنے کے لئے بنا ہے۔ تم کمزوری دکھاؤ گے تو تم ختم ہو
جاؤ گے مگر پاکستان کبھی ختم نہیں ہوگا۔ قدرت کسی دوسری نسل کو تربیت دے
کر اسے مصیبتوں تکلیفوں اور اذیتوں کا عادی بنا کر تمہاری جگہ پر لے آئے
گی۔"

میں بڑی توجہ سے کمال شاہ کمانڈو کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی باتیں میرے عزم کو
مستحکم کر رہی تھیں۔ میرے اندر محمود غزنوی اور صلاح الدین ایوبی کا جذبہ حریت
کر رہی تھیں۔ میری ساری تھکان روز ہوگئی۔ کمانڈر اٹھا اور بولا۔

"اب تم آرام کرو۔ رات کو غار کے اندر رائفل شوٹنگ کی ٹریننگ کا مرحلہ
شروع ہوگا۔ اس کے بعد تمہیں اندھیرے میں چیتے کی طرح دشمن پر جھپٹ کر
ایک سیکنڈ کے اندر اندر چاقو سے اس کی بائیں جانب یا دائیں جانب والی شہ
رگ کاٹنے کی ٹریننگ دی جائے گی۔ پھر فوجی ایمونیشن ڈائنا مائیٹ، بوبی ٹریپ
اور سپر مائینز کی ٹریننگ دی جائے گی۔ ابھی تم ایک گھنٹہ کے لئے سو جاؤ۔ ایک
گھنٹے کے بعد ایک آدمی تمہیں جگا کر غار میں سے آئے گا"

میں واقعی مشین بن گیا تھا۔ وہیں جھونپڑی کے گھاس کے فرش پر لیٹ گیا اور یقین
کہ مجھے آگئی۔ ٹھیک ایک گھنٹہ بعد کمانڈر کا آدمی مجھے جگا کر غار میں لے آیا۔ یہاں

چٹان کی دیوار کے ساتھ فاصلے فاصلے پر چاند ماری کی طرح کے نشان بنے ہوئے تھے۔ یہ
رائفل ٹریننگ شروع ہوگئی۔ اس زمانے میں ابھی کلاشنکوفیں وغیرہ نہیں آئی تھیں۔ تھ
ناٹ تھری کی رائفلیں اور برین گنیں سٹین گنیں اور مشین گنیں ہی فوج میں استع
ہوتی تھیں۔ غار کے اندر رائفل کی ٹریننگ اس لئے دی جاتی تھی کہ فائر کی آواز جنگل
پیدا نہ ہو۔ کیونکہ یہ کمال شاہ کا خفیہ ٹھکانہ تھا اور یہاں کشمیری مجاہدین کی نئی نسل کو کما
ٹریننگ دی جاتی تھی۔ بیس روز تک میں غار کے اندر نشانے بازی کی تربیت حاصل
رہا۔ میں نے اس دوران ٹھیک نشانے پر گولی فائر کرنا سیکھ لیا۔ اس میں میرے شوق
کمانڈر کی اعلیٰ تربیت کا بھی اثر تھا۔ اس دوران رات کے اندھیرے میں جنگل میں د
پر جھپٹ کر پیچھے سے اس کی گردن دبوچنے اور چاقو سے اس کی شہ رگ کاٹنے کی ٹر
بھی ہوتی تھی۔ درخت کے پیچھے آدمی کی ڈمی بنا کر کھڑی کر دی جاتی ڈمی کی گردن
گھنگھرو باندھ دیئے جاتے۔ مجھے کمانڈو چاقو دے کر حکم دیا جاتا کہ ڈمی کی گردن پر
سے آکر اس طرح چاقو چلاؤں کہ ڈمی کی آدھی گردن بھی کٹ جائے اور گھنگھرو کی ذر
بھی آواز نہ پیدا ہو۔ یہ بڑی مشکل ٹریننگ تھی۔ شروع شروع میں میں ڈمی کی گرد
چاقو چلاتا تو گھنگھرو جھنجھنا اٹھتے۔ کمانڈر کی پیچھے سے کرخت آواز آئی۔

"تم جنگلی لوگ کو کب عقل آئے گا ٹرائی گین۔۔۔۔۔"

کمانڈو ٹریننگ کے دوران کمال شاہ مجھ سے ہر قسم کی سخت کلامی کرتا تھا۔ بر
دینے کی کسر باقی رہ گئی تھی۔ دو تین ہفتوں کے بعد جا کر میں اتنا ماہر ہوگیا کہ کمانڈر
ہاتھ میں لیکر سیکنڈ والی سوئی کا بٹن دبا کر گو کہتا اور میں درخت کے پیچھے کھڑی دشمن ک
پر چیتے کی طرح جھپٹ کر اس کی گردن دبوچ کر اتنی مہارت سے چاقو پھیرتا کہ ا
آدھی گردن کٹ جاتی اور کیا مجال ہے جو گھنگھرو کی آواز پیدا ہوتی۔ یہ سارا آ
صرف تین سیکنڈ میں مکمل ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد میری ٹارچر برداشت کرنے کی تر
مرحلہ آیا۔ کمال شاہ نے مجھے اپنے سامنے بٹھا لیا اور کہنے لگا۔

"کمانڈو گھیرے میں آکر اگر دشمن کے قابو آجائے تو دشمن اسے اتنی غیر انسانی

اذیتیں دیتا ہے کہ ایک بار تو بڑے بڑوں کا دل گردہ ہل جاتا ہے۔ دشمن ایک
عام سپاہی سے اتنی زیادہ پوچھ گچھ نہیں کرتا۔ لیکن اگر کمانڈو اس کے ہاتھ
آجائے تو اس کی کوشش ہوتی ہے کہ کمانڈر کو اتنی اذیتیں دے اس کے ساتھ
ایسی درندگی کا سلوک کرے کہ وہ گھبرا کر اپنے ساتھی کمانڈوز کے نام اور اپنے
خفیہ ٹھکانے کا محل وقوع بتا دے۔ یہ دشمن کی بہت بڑی فتح اور ایک کمانڈو کی
بہت بڑی شکست ہوتی ہے۔ اس طرح دشمن تمام کمانڈوز کو ختم کر کے اپنے
ایمونیشن ڈمپوں' سپلائی ڈپوؤں' فوجی کانوائیوں اور ہزاروں کی فوجی نفری کو تباہ
ہونے سے بچا لیتا ہے۔ ہم تمہیں اتنا ٹارچر نہیں کریں گے کہ تم مرجاؤ۔ مگر
اتنی اذیتیں ضرور دیں گے کہ تمہارا جسم انہیں برداشت کرنے کا عادی ہو
جائے۔ بس ہم اتنا ہی کر سکتے ہیں آگے سارا کام تمہارے ایمان کی قوت نے
کرنا ہوگا۔ لیکن جس وقت ہم تمہیں ٹارچر کریں تو اتنا ضرور یاد رکھنا کہ دشمن
تمہیں اس سے کئی گنا زیادہ ٹارچر کرے گا۔ ہم تمہیں زندہ رکھیں گے دشمن
تمہیں مارنے کے لئے ٹارچ کرے گا۔۔۔۔"

اپنے مجاہد کی کمانڈر اور مرد مومن کمال شاہ کی باتیں اب یاد آتی ہیں تو سوچتا ہوں کہ
ک قدر سچا انسان تھا۔ اس کی ایک ایک بات سچی تھی۔ اگر میں اس کی تربیت کی بھٹی
ے نہ نکلا ہوتا تو آج اپنی زندگی کی سچی داستان سنانے کے لئے شاید زندہ نہ ہوتا۔
ے کمانڈر نے' اس مرد مومن نے میرے جسم کو ملک و قوم اور اسلام کی سربلندی کی
ر بڑی سے بڑی اذیت کو سہہ جانے کے قابل ہی نہیں بنایا بلکہ مجھے یہ بھی سکھایا کہ
ن کا ٹارچر' اس کی غیر انسانی اذیتیں جب برداشت کی حد سے آگے نکل جائیں تو پھر
طرح اپنے جسم کو اپنے شعور اور احساسات کو اللہ کی مرضی کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔
م کے محاذ پر دو تین بار ایسا ہوا کہ دشمن نے مجھے ایسی ایسی درندہ صفت اذیتیں دیں
جھے محسوس ہوا کہ میں زندہ نہیں رہا۔ میں مرگیا ہوں۔ لیکن میں زندہ تھا۔ صرف
نے اپنے کمانڈر کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے غیر ارادی طور پر اپنے وجود کو اپنے

شعور کو اللہ کے حوالے کر دیا تھا۔

قصہ مختصر کمانڈر کمال شاہ کے خفیہ ٹھکانے پر میری کمانڈو ٹریننگ ایک خاص مدت کے بعد ختم ہوگئی۔ اس ٹریننگ نے مجھے گھوڑا، خچر، خرگوش، لومڑی، شیر، چیتا سبھی کچھ بنا دیا سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے ایک سچا پاکستانی اور اسلام کا شیدائی بنا دیا۔ اسلام کا شیدائی میں پہلے بھی تھا لیکن کمال شاہ کی تربیت نے مجھے شیدائی ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام سپاہی بھی بنا دیا۔ ایسا بے خوف سپاہی جو صرف اللہ سے ڈرتا تھا۔ جس کا اٹھنا بیٹھنا، پھرنا، جہاد کرنا، دنیاوی معاملات کرنا صرف اللہ اور اللہ کے لئے تھا۔ جس کے جسم میں اور روح صرف اس لئے مقید تھی کہ اسے ایک دن اللہ کی راہ میں قربان کر دیا جائے۔ اللہ کی امانت تھی۔ یہ اس مرد مومن کی تربیت کا اثر تھا کہ جب میں کشمیر کے محاذ پر کے دشمنوں سے لڑ رہا تھا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے خدا میرے ساتھ ہے۔ جیسے کے فرشتے میرے ساتھ مل کر کافروں کے خلاف جہاد کر رہے ہیں۔

کمال شاہ کے پاس میں نے چھ مہینے گزارے۔ یہ کمانڈو ٹریننگ کے لئے کوئی عرصہ نہیں تھا۔ مگر اتنی کم مدت میں ہی اس نے مجھے ایک مکمل کمانڈو اور ایک سرفر مجاہد بنا دیا۔ میں اگر لوہا تھا تو کمانڈر نے مجھے فولاد بنا دیا۔ میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ ٹریننگ کے دوران مجھے اذیت کے کن کن مراحل سے گزارا گیا۔ صرف اتنا ضرور کہو کہ اگر میرے اندر جذبہ ایمانی زندہ نہ ہوتا تو میں اس مرحلے پر ٹریننگ ادھوری چھو بھاگ گیا ہوتا۔ اس مرد مومن نے میرے جسم کو فولاد اور اسپات سے بھی زیادہ مضب دیا۔ مجھے ایسا لگتا کہ میں اگر نعرہ حیدری لگا کر کسی چٹان کو زور سے مکا ماروں گا تو ا از کم ایک بار اپنی جگہ سے ضرور ہلا دوں گا۔ میں اونٹ کی طرح ایک بار پانی پی کر ا پر دو دن تک زندہ رہ سکتا تھا۔ میں جنگل کے پتوں اور پودوں کی جڑوں سے خو حاصل کرنا جان گیا تھا۔ میں گھوڑے کی طرح کئی کئی میل تک دوڑ سکتا تھا۔ خچر کی کئی من بوجھ سر پر رکھ کر کئی کئی میل پیدل چل سکتا تھا۔ پہاڑی بکرے کی طرح اٹھی ہوئی چٹانوں پر چڑھ سکتا تھا۔ دشمن پر چیتے کی عیاری کے ساتھ اچانک حملہ کر

رگ کاٹ سکتا تھا۔ خرگوش کی طرح دشمن کو قریب آتا دیکھ کر اپنے آپ کو ں میں چھپا سکتا تھا۔ میں نے اپنا سانس کمانڈو ٹریننگ میں اتنا پکا لیا تھا کہ پانی میں گا کر پانی کے اندر کافی دیر تک بیٹھا رہ سکتا تھا۔ مجھ میں اتنی صلاحیت پیدا ہوگئی تھی ندر کی طرح درختوں درختوں پھلانگتا ہوا جنگل کے دوسرے کنارے تک پہنچ سکتا

میری جسمانی ٹریننگ کے ساتھ ساتھ کمانڈر کمال شاہ نے میری روحانیت کی تربیت ی۔ انہوں نے میری روح کو بھی طاقتور اور تابناک بنا دیا تھا۔ انہوں نے میری کو تمام آلائشوں سے پاک کر کے میری نگاہ کو پاک اور کردار کو بے باک بنا دیا تھا۔ وہ روحانی تربیت کے دوران اکثر یہ الفاظ دہرایا کرتے۔

"جوان! میں تجھے اللہ اور رسول ﷺ کی امانت کا صحیح رکھوالا بنانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسلام اور مسلمان کی عزتوں کے رکھوالے بن جاؤ۔ تم پاکستان کی سرحدوں کو پہچان جاؤ۔ تم اپنے فرض کو پہچان جاؤ۔ تم اپنے دشمن کو پہچان جاؤ۔ میں تجھے سلطان محمود غزنوی اور سلطان صلاح الدین ایوبی کی سپاہ کا مجاہد بنانا چاہتا ہوں۔۔۔۔"

اور جب میری ٹریننگ ختم ہوئی تو روحانی اور جسمانی طور پر میرے اندر محمود غزنوی سلطان صلاح الدین ایوبی کی فوج کے سپاہی کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ کمانڈر نے میرا نشانہ قدر پختہ کر دیا تھا کہ میں میری گولی پہاڑ کی چوٹی کے درخت پر بیٹھے ہوئے پرندے کو دیتی تھی۔ جب میری ٹریننگ مکمل ہوگئی تو کمال شاہ نے عصر کی نماز مجھے حسب ل اپنے ساتھ ہی پڑھائی۔ نماز کے بعد ان کے خاص آدمی غار سے چلے گئے تو انہوں اشارے سے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ جب غار میں میں اور کمال شاہ اکیلے ئے تو انہوں نے کہا۔

"جوان! تمہاری کمانڈو ٹریننگ ابھی پوری طرح مکمل نہیں ہوئی۔ اس کا آخری مرحلہ باقی ہے۔"

میں نے بڑے ادب سے عرض کی۔

"کمانڈر! آپ حکم کریں۔ میں حاضر ہوں"

اب میرے اندر بھی وہ پہلے دن والی بات نہیں تھی۔ پہلے میں ان کی ٹریننگ
گھبرا کر بھاگ جانے کی ترکیبیں سوچتا تھا۔ مگر میرے جذبہ جہاد نے مجھے روک رکھا
اب وہ بات نہیں تھی۔ اب میں چاہتا تھا کہ کمال شاہ سے اس مرد مومن سے جس
طاقت ایمانی اور تربیت کامل حاصل کرسکوں حاصل کرلوں۔ چنانچہ جب انہوں نے مجھے
کہ ابھی مجھے ٹریننگ کے ایک آخری مرحلے سے بھی گزرنا ہوگا تو مجھے یوں محسوس
جیسے کوئی شخص جس نے مجھے اپنا سارا خزانہ سونپ دیا ہو کہہ رہا ہو کہ ابھی تمہیں کچھ
زروجواہرات دینے باقی رہ گئے ہیں وہ بھی لے لو۔ کمال شاہ صاحب مجھے شیر کی کھال
اٹھا کر اپنے ساتھ غار کے پیچھے لے گئے۔ یہاں دیوار کے اندر ایک چھوٹی سی تنگ
کوٹھڑی سی بنی ہوئی تھی۔ کمال شاہ نے اندر جا کر لالٹین روشن کر دی۔ میں بھی کوٹھڑی
میں آگیا۔ دیوار کے ساتھ لکڑی کا ایک چھوٹا سا صندوق پڑا تھا جس کو تالا لگا ہوا تھا۔
شاہ نے اپنی جیکٹ کی جیب سے چابی نکال کر صندوق کو کھولا۔ پھر اس میں سے چمڑے
ایک چھوٹی سی تھیلی نکالی۔ تھیلی کا منہ تسمے سے بند کیا ہوا تھا۔

وہ مجھے واپس غار میں اپنی نشست گاہ میں لے آئے۔ مجھے سامنے بٹھالیا اور کہا۔

"ابھی باہر شام کا وقت ہے۔ تمہاری ٹریننگ کا آخری مرحلہ یہ ہے کہ تم اس وقت جنگل میں جاؤ گے۔ تم اس جنگل سے اچھی طرح واقف ہو گئے ہو۔ جہاں بانس کے جھنڈوں والا ٹیلا ہے اس ٹیلے کے پار کروندے کی چھوٹی پہاڑیوں والا جنگل ہے۔ اسے ہم کروندا بن کہتے ہیں۔ یہ جنگل ہم نے تمہیں جان بوجھ کر نہیں دکھایا تھا۔ تاکہ آج اپنی تربیت کے آخری مرحلے میں تم وہاں جاؤ تو وہ جنگل تمہارے لئے بالکل اجنبی ہو۔ اس جنگل میں چھوٹے چھوٹے بے شمار ٹیلے ہیں جو سینکڑوں میل تک شمالاً جنوباً پھیلے ہوئے ہیں۔ ان ہی ٹیلوں کے درمیان ایک جگہ مغلوں کے زمانے سے پہلے کی ایک باؤلی ہے۔ باؤلی سمجھتے ہو

ناں؟ بادشاہوں کے زمانے میں جب امراء وزراء اور بادشاہ شکار پر جاتے تھے تو کبھی کبھی ان کی بیگمات اور خاندان کی شاہی خواتین بھی ان کے ہمراہ ہوتی تھیں۔ جنگل میں ان کے غسل وغیرہ کے لئے ان کے پرانے کپڑے دھونے کے لئے کسی زمین دوز قدرتی چشمے کے گرداگرد پتھروں کی دیوار کھڑی کر کے اندر چشمے تک سیڑھیاں بنا دی جاتی تھیں۔ اوپر چھت ڈال دی جاتی تھی تاکہ شاہی خواتین وہاں آزادی اور حیاداری سے نہا سکیں اور ان کی لونڈیاں اور نوکرانیاں ان کے اتارے ہوئے کپڑے وغیرہ دھو سکیں بادشاہوں کا زمانہ گزر گیا۔ تو یہ باؤلیاں ویران ہو گئیں۔ ایسی ہی ایک ویران باؤلی کروندا بن کی پہاڑیوں میں بھی ہے۔ تمہیں رات کے اندھیرے میں اس ویران باؤلی کو تلاش کرنا ہے۔ اس باؤلی کے اندر نیچے پانی تک سیڑھیاں اترتی ہیں۔ اس باؤلی کے اندر سے ایک خفیہ سرنگ جنگل کے دوسرے حصے کی طرف جاتی ہے۔ اس سرنگ میں ایک جگہ چٹانی دیوار میں ایک شگاف نما کوٹھڑی بنی ہوئی ہے۔ اس کوٹھڑی میں دیوار کے ساتھ ہندوؤں کی ایک دیوی ہولا دیوی کا چھوٹا سا بت لگا ہوا ہے۔ اس بت کے بارے میں ہندوؤں نے مشہور کر رکھا تھا کہ جو کوئی مسلمان اس بت کے پاس جائے گا ہولا دیوی اسے جلا کر راکھ کر دے گی۔ مگر میں ایک رات وہاں گیا اور ہولا دیوی کے بت کو توڑ کر اس کا سر الگ کر کے اپنے ساتھ رسی سے باندھ کر زمین پر گھسیٹتا ہوا یہاں لے آیا۔ اب میں اس بت کے سر کو کمانڈو ٹریننگ کے آخری مرحلے کے لئے استعمال کرتا ہوں۔ ہولا دیوی کے بت کا دھڑ جو چھ سات انچ بڑا ہے۔ میں نے وہیں رہنے دیا تھا۔ اسے میں نے وہیں پتھروں کے نیچے چھپا کر رکھ دیا ہے۔"

پھر کمال شاہ نے تھیلی کھول کر اس میں سے ہولا دیوی کے بت کا سر نکال کر مجھے دکھایا۔ یہ عورت کا کرکٹ کے گیند جتنا بڑا پتھر کا سر تھا۔ اس کا رنگ سیندھوری تھا۔ آنکھیں ناک اور موٹے موٹے ہونٹ بنے ہوئے تھے۔ کانوں میں صرف سوراخ تھے۔

ان میں کوئی بندے وغیرہ نہیں بنائے گئے تھے۔ پتھر کو تراش کر بال بنائے گئے تھے۔ درمیان میں سے مانگ نکلی ہوئی تھی اور پیچھے پتھر ہی کا چھوٹا سا جوڑا بنا ہوا تھا۔ شکل صورت سے یہ دیوی کوئی ڈائن وغیرہ نہیں لگ رہی تھی۔ وہ گردن سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ کمال شاہ نے کہا۔

"میں نے نعرہ حیدری مار کر اس کے منہ پر زور سے مکا مارا تھا اور اس کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔ میں اسے اپنی بت شکنی کی یادگار کے طور پر اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ پھر جب میں نے یہاں کشمیری مجاہدین کو کمانڈو ٹریننگ دینے کا سلسلہ شروع کیا تو میں نے اس بت کو بھی کمانڈو ٹریننگ کے کورس میں شامل کرلیا۔ تب میں ایک روز باؤلی میں واپس گیا اور سرنگ میں جاکر ہولا دیوی کے بت کا دھڑ بھی دیوار میں سے اکھاڑ کر اسے وہیں ایک جگہ پتھروں میں چھپا دیا۔ اب تمہیں راتوں رات اس باؤلی میں جانا ہے۔ باؤلی کی سرنگ تلاش کر کے سرنگ کے اندر ہولا دیوی کی کوٹھڑی ڈھونڈتی ہے اور وہاں سے اس بت کا دھڑ لاکر مجھے دینا ہے یہ جب تم اس بت کا دھڑ لاکر مجھے دے دو گے تو تمہاری ٹریننگ کا آخری مرحلہ بھی مکمل ہو جائے گا۔ پھر تم پورے کمانڈو بن جاؤ گے اور میں تمہیں جہاد کشمیر میں شامل ہونے کی باقاعدہ اجازت دے دوں گا۔ اس بت کے سر کو غور سے دیکھ لو۔ اس کے دھڑ پر بھی اس قسم کا سیندھوری رنگ پھرا ہوا ہے۔ تمہیں صرف اپنے ساتھ کمانڈو چاقو لے جانے کی اجازت ہوگی۔ اب تم نکل جاؤ۔۔۔۔۔"

میں کچھ کہنے لگا تو کمال شاہ ایک دم فوجی انسٹرکٹر بن گئے اور کرخت آواز میں ... دیا۔

"تم ابھی جائے گا اور راتوں رات واپس اس بت کا دھڑ لاکر مجھے دے گا۔ گو۔۔۔۔۔"

آگے سے بولنے کا کوئی مقام ہی نہیں تھا۔ میں لیس کمانڈر کہہ کر تیز تیز قدم اٹھاتے

نکل کر اپنے جھونپڑے میں آیا۔ وہاں سے میں نے اپنا کمانڈو چاقو لیا اور جنگل کی طرف چل پڑا۔ ابھی پوری طرح سے رات کا اندھیرا نہیں پھیلا تھا۔ آسمان پر ڈوبتے سورج کی تھوڑی لالی موجود تھی جو بڑی تیزی سے رات کی سیاہی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ سارا جنگل اور جنگل کے راستے میرے جانے پہچانے تھے۔ میں چھ مہینوں کی کمانڈو ٹریننگ کے دوران اس جنگل کے ایک ایک درخت ایک ایک جھاڑی سے واقف ہو گیا تھا۔ صرف کروندے کا جنگل میرے لئے بالکل نیا جنگل تھا۔ اسے کمال شاہ نے جان بوجھ کر صرف آج کے دن کے لئے میری نگاہوں سے اوجھل رکھا تھا۔ میں نے بڑی آسانی سے جنگل کا پہلا علاقہ طے کرلیا۔ آگے وہ جنگلی راستہ آگیا جو کمانڈو ٹریننگ کے لئے جھاڑیاں کاٹ کر بنایا گیا تھا اور جو اس تالاب کی طرف جاتا تھا جس میں میرے کمانڈر نے مجھے دھکا دیا تھا۔

کمانڈر نے بتایا تھا کہ یہاں سے جنوب کی جانب ایک ٹیلے کی چڑھائی ہے جس کی دوسری جانب وہ وادی ہے جہاں مجھے چھ ماہ تک خچر کی طرح دوڑایا گیا تھا۔ میں تالاب کو چھوڑ کر جنوب والے ٹیلے کی چڑھائی چڑھ کر وادی میں آیا تو رات کا اندھیرا پوری طرح چھا گیا تھا۔ مگر اب رات چاہے کتنی گہری ہو' اس کا اندھیرا میرے راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکتا تھا۔ کمال شاہ کمانڈر کی تربیت نے مجھے اندھیرے میں چیزوں کو دیکھنے کا عادی بنا دیا تھا۔ وادی کی ایک پگ ڈنڈی پر جنوبی ٹیلے کی طرف چلنے لگا۔ کمانڈو چاقو کھول کر میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ جب میں پہلی بار یہاں آیا تھا تو جنگل سے مجھے بڑا ڈر لگتا تھا مگر اب یہ ڈر خوف اتر چکا تھا۔ میرے اندر ایسا اعتماد پیدا ہو گیا تھا کہ اگر شیر بھی مجھ پر حملہ کردے تو مرنے سے پہلے میں اسے بھی زندہ نہ چھوڑتا۔

ٹیلے کی چڑھائی آگئی۔ اندھیرے میں ڈھلان پر اگی ہوئی جنگلی جھاڑیوں کے چھوٹے چھوٹے جھنڈ مجھے صاف نظر آرہے تھے۔ اس ٹیلے کے پار وہ جنگل تھا جس سے میں ابھی ناآشنا تھا۔ اور جہاں مجھے ہولا دیوی کی باؤلی کو تلاش کرنا تھا۔ یہ شروع رات تھی۔ سناٹوں میں کسی کسی پرندے کی آواز آجاتی تھی۔ میری بائیں جانب نیچے وادی میں

دو تین گیدڑ چلاتے ہوئے گزر گئے۔ میں ٹیلے کی دوسری جانب آگیا۔ یہاں ایک طرف کھڑے ہو کر میں نے اندھیرے میں آنکھیں سکیڑ کر جائزہ لیا یہ جنگل ذرا مختلف تھا۔ اس میں کہیں بھی درختوں کے گھنے جھنڈ نہیں تھے۔ دور دور اکا دکا درخت نظر آرہا تھا۔ گھاس جگہ جگہ اگی ہوئی تھی۔ کہیں کالی سیاہ چٹانوں کے ہیولے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ چلنے کے لئے کوئی پگ ڈنڈی وغیرہ بھی نہیں تھی۔ میں اللہ کا نام لے کر جنوب کی سمت چل پڑا۔

جھاڑیاں اور گھاس میرا راستہ روکتا تو میں چاقو سے انہیں صاف کر کے گزر جاتا۔ کافی دور تک چلنے کے بعد زمین پر اونچی اونچی گھاس ختم ہوگئی۔ تاریکی میں جگہ جگہ زمین سے ابھرے ہوئے نوکیلے پتھر ہی پتھر تھے۔ میں ایک پتھر پر ذرا دم لینے کے لئے بیٹھ گیا۔ میں نے اپنی ساری توجہ اپنے سانس پر مرکوز کرتے ہوئے اپنی ایک خاص صلاحیت کو بیدار کیا۔ صلاحیت کئی ماہ کی مشقت کے بعد کمال شاہ نے میرے اندر پیدا کی تھی۔ اس کی مدد میں جانوروں کی طرح فضا میں پانی کی بو سونگھ لیتا تھا۔ میں نے ایک بار اپنا سارا سانس با نکال کر آہستہ آہستہ سانس کو اوپر کھینچنے لگا۔ میں رک رک کر سانس کھینچ رہا تھا۔ پانی کی ایک سیکنڈ سے بھی کم مدت کے لئے مجھے محسوس ہوئی اور غائب ہوگئی۔ میں نے اس عم کو چھ سات مرتبہ دہرایا۔ ہر بار بہت ہی قلیل وقفے کے لئے پانی کی عجیب سی بو محسو ہوتی اور پھر غائب ہو جاتی میں نے بڑی جدوجہد کے بعد اس بو کی سمت کا تعین کیا اور ا طرف چل پڑا۔ کچھ دور چلنے کے بعد میں رک جاتا اور پانی کی بو محسوس کرنے کی کوش کرتا اور جس سمت سے وہ بو آرہی تھی اس طرف اندازے سے روانہ ہو جاتا۔

اس دوران پتھریلا میدان ختم ہوگیا تھا اور چھوٹے سے ٹیلے کے دامن میں پہنچ تھا۔ اندھیرے میں میری آنکھیں چیتے کی آنکھوں کی طرح کبھی سکڑ کر اور کبھی پوری کر چیزوں کو دیکھنے کی برابر کوشش کر رہی تھیں۔ مجھے اپنی ضرورت کے مطابق سب نظر آرہا تھا۔ دور کچھ درخت کھڑے تھے۔ ان کے درمیان مجھے ایک دیوار سائے کی نظر آئی۔ میں اس طرف چلتے چلتے قریب آیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک چار دیواری ہے۔

ں کی پچھلی جانب گیا تو وہاں سیڑھیاں نیچے اندھیرے میں اترتی تھیں۔ یہاں پانی کی رطوب بو صاف محسوس ہو رہی تھی۔ یقیناً" میں کروندے بن کی ہولا دیوی والی باؤلی پر نچ گیا تھا۔ میں نے جھانک کر نیچے دیکھا۔ سیڑھیاں نیچے اندھیرے میں جا کر گم ہو گئی ہیں۔ نیچے اس قدر گہرا اندھیرا تھا کہ میں بھی اندھیرے میں کچھ نہ دیکھ سکا۔ میں نے اللہ سولؐ کا مبارک نام لیا۔ کلمہ شریف پڑھا اور سیڑھیاں اترنی شروع کر دیں۔ سیڑھیاں تم ہوئیں تو مجھے سیاہ اندھیرے میں پانی کے ایک حوض کی جھلک سی دکھائی دی۔ یہ باؤلی ی۔ کمانڈر نے کہا تھا کہ اس باؤلی میں ایک خفیہ سرنگ کو راستہ جاتا ہے۔ میں دیوار کے اتھ ہاتھ لگائے آہستہ آہستہ حوض کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ ایک عجیب ہیبت ناک ول تھا۔ اگر میں تربیت یافتہ کمانڈو نہ ہوتا تو خوف سے بے ہوش ہوگیا ہوتا۔ لیکن میں ڑے اعتماد کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ ایک جگہ دیوار ختم ہوگئی۔ میں نے ٹٹول کر دیکھا۔ ہاں دیوار میں دائرے کی شکل کا ایک شگاف تھا۔ یہ سرنگ ہی ہو سکتی تھی۔ میں نے گاف میں جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی مگر مجھے دوسری طرف کچھ نظر نہ آیا۔ میں شگاف یں داخل ہوگیا۔ میرے پاؤں چھوٹے چھوٹے پتھروں پر پڑے جو سرنگ کے اندر بکھرے ہوئے تھے۔

میں ایک ہاتھ سرنگ کی دیوار پر رکھ کر قدم قدم آگے بڑھنے لگا۔ مجھے سرنگ میں اس کوٹھڑی تک پہنچنا تھا جس کی دیوار میں ہولا دیوی کا بت لگا ہوا تھا اور جس کا سر کاٹ کر کمانڈو کمال شاہ اپنے ساتھ لے گیا تھا اور بت کا دھڑ اس نے وہیں پتھروں میں چھپا دیا تھا۔ مجھے اس دھڑ کو لے کر واپس کمال شاہ کے پاس جانا تھا۔ کمانڈر کمال شاہ نے کہا تھا کہ دیوی کی مورتی والی کوٹھڑی دیوار میں ایک گہرے شگاف کی طرح ہے۔ وہ کوئی باقاعدہ کوٹھڑی نہیں ہے۔ بہرحال میں سرنگ میں آگیا تھا۔ ہولا دیوی کی مورتی والا شگاف بھی کہیں دیوار میں ہوگا۔ میں دیوار کو اب دونوں ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھ رہا تھا۔ گھپ اندھیرے میں بھی مجھے اب تھوڑا تھوڑا نظر آنے لگا تھا۔ آخر مجھے دیوار کا شگاف مل گیا۔ میں نے شگاف کی اندرونی دیوار پر ہاتھ پھیرا تو محسوس ہوا کہ وہاں کوئی

مورتی لگی ہوئی تھی جسے کھرچ کر اکھاڑا گیا ہے۔

میں اپنے ٹارگٹ پر پہنچ گیا تھا۔

یہی ہولا دیوی کی مورتی والا شگاف تھا۔ میں پتھر کی ڈھیری کو تلاش کرنے لگا جس میں کمال شاہ نے مورتی کے دھڑ کو چھپا دیا تھا۔ ذرا سی کوشش کے بعد میرا پاؤں پتھر کی ایک ڈھیری سے ٹکرایا میں وہیں بیٹھ گیا اور پتھروں کو ادھر ادھر ہٹانے لگا۔ نیچے سے ہولا دیوی کے بت کا چھوٹا سا دھڑ نکل آیا۔ میں نے ہاتھ پھیر کر دیکھا اس کا سر غائب تھا۔ مجھے اپنی کامیابی پر بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے اپنی کمانڈو ٹریننگ کے آخری مرحلے کو بھی کامیابی سے مکمل کرلیا تھا۔ میں نے مورتی کا دھڑ بغل میں دبایا اور سرنگ میں واپس مڑا۔ مجھے محسوس ہوا کہ مورتی کا دھڑ تھوڑا تھوڑا گرم ہے۔ میں نے خیال کیا کہ ہو سکتا ہے پتھروں کے نیچے دبے رہنے کی وجہ سے اس میں ہلکی ہلکی گرمائش پیدا ہوگئی ہو۔ میں سرنگ سے نکل کر باؤلی کے حوض پر آگیا۔ میں نے اپنا رخ سیڑھیوں کی طرف کرلیا۔ اور دیوار کے ساتھ لگ کر چلنے لگا۔ میرے اندازے کے مطابق کوئی پندرہ بیس قدم چلنے کے بعد سیڑھیاں آنی تھیں۔ میں دیوار کے ساتھ پچاس ساٹھ قدم تک چلتا گیا مگر سیڑھیاں نہ آئیں۔ میں نے دیوار کو ٹٹول کر دیکھا۔ دیوار وہی تھی جس کے ساتھ لگ کر میں سرنگ تک گیا تھا۔ میں آگے چل پڑا۔ مزید پچاس قدم تک چلتا گیا مگر سیڑھیاں نہ آئیں۔ دیوار ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ کچھ قدم دیوار کے ساتھ اور چلا تو سرنگ آگئی۔ یہ وہی سرنگ تھی جس سے میں مورتی کا دھڑ لے کر ابھی نکلا تھا۔

یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہے؟ میں سوچنے لگا۔ سیڑھیاں جو اوپر جاتی ہیں کہاں غائب ہوگئی ہیں؟

میں نے باؤلی کی دیوار کے ساتھ چلتے ہوئے چار پانچ چکر لگائے۔

ہر بار سرنگ آجاتی۔ سیڑھیاں نہیں آرہی تھیں۔ مجھے کیسے یقین آتا کہ دیوار میں اوپر جانے والی سیڑھیاں غائب ہوگئی ہیں۔ میں وہ سیڑھیاں اتر کر ہی نیچے باؤلی کے حوض پر آیا تھا۔ تو کیا میرے ساتھ کوئی جادو طلسم کا کھیل ہو رہا ہے؟ جادو اپنی جگہ پر برحق مگر میں تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا کہ جادو کا اثر مجھ پر بھی ہو سکتا ہے اور جادو کے زور ے کسی مکان کی سیڑھیاں بھی غائب ہو سکتی ہیں۔ لیکن یہ بات ایک حقیقت کی طرح رے سامنے تھی کہ دیوار میں سیڑھیاں غائب ہو چکی تھیں۔ میں نے بار بار بڑی اچھی طرح سے چار دیواری کو ٹٹول ٹٹول کر اور گھور گھور کر دیکھا۔ مجھے کہیں اوپر جاتی سیڑھیاں ملیں۔ ہر بار سرنگ کا دہانہ آجاتا تھا۔ ہولا دیوی کی مورتی پتھر کا بغیر سر کے دھڑ میری ل میں تھا۔ میں تنگ آکر سرنگ کے دہانے میں بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ وہاں اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ مجھے حوض کے پانی کی سطح کی دھندلی سی جھلک ہی کسی ت دکھائی دیتی تھی۔ غور سے دیکھنے پر بھی کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ فضا میں حبس تھا اور س سے ایک جگہ پر بند پانی کی بو رچی ہوئی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ سرنگ میں چل کر نا چاہیے۔ شاید اس میں آگے جا کر کوئی راستہ اوپر نکلتا ہو۔

میں اٹھا اور سرنگ کے اندھیرے میں احتیاط سے قدم اٹھاتا چل پڑا۔ میرا ایک ہاتھ ر کے ساتھ لگا تھا۔ میں اس شگاف تک آگیا جس کی دیوار میں ہولا دیوی کی مورتی ہوا

کرتی تھی۔ میں شگاف سے بھی آگے نکل گیا۔ سرنگ بھی آگے بڑھ رہی تھی۔ کئی جگہوں
پر مکڑیوں کے جالے میرے منہ کو لگے۔ میں نے ہاتھوں سے انہیں صاف کیا اور قدم قدم
چلتا چلا گیا۔ کچھ دور جا کر سرنگ ایک طرف مڑ گئی۔ میں بھی سرنگ کے ساتھ ہی اس
طرف مڑ گیا۔ میں اندھیرے میں بہت دیکھ بھال کر چل رہا تھا۔ میرا ہاتھ دیوار سے ٹکرایا۔
سرنگ یہاں آکر بند ہو گئی تھی۔ میرے آگے سرنگ کی چٹانی دیوار تھی۔ کچھ دیر وہیں کھڑ
سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں زمین کے نیچے باؤلی کی چار دیواری میں قید ہو چ
تھا۔ یہاں سے باہر نکلنے کا بظاہر کوئی راستہ نہیں تھا۔ لیکن میرا دل اسے ماننے کو تیار نہیں
تھا کہ یہ کسی آسیب یا بھوت پریت کی شرارت ہے۔ میں نے اس قسم کے توہمات کو کبھ
کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ اگر آسیب اور بھوت پریت کا کوئی وجود تھا بھی تو میرے اند
ایمان کی اتنی زبردست طاقت تھی کہ وہ میرے قریب پھٹک بھی نہیں سکتا تھا۔

میں وہیں خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔ اور خدا سے دعا مانگی کہ اے رب العالمیں
میں تیرا حقیر بندہ ہوں۔ اسلام کے نام پر جہاد کرنے نکلا ہوں۔ کافروں کے ملک میں ہوں
اگر یہاں کافروں نے کوئی جادو ٹونا کیا ہوا ہے تو مجھے اس سے محفوظ رکھنا اور مجھے سید
راستہ دکھانا۔۔۔۔ اللہ کے حضور دعا مانگنے کے بعد مجھے اپنی روح میں ایک حیرت انگ
توانائی محسوس ہوئی۔ میری روح اور جسم دونوں پہلے سے زیادہ توانا ہو گئے۔ میں سرن
میں واپس مڑا تو اچانک ایک ہلکی سی خوشبو محسوس ہوئی۔ جیسے خوشبو کی ایک لہر میر
قریب سے ہو کر نکل گئی ہو۔ میں ایک لمحے کے لئے وہیں رک گیا۔ یہ خوشبو چنبیلی
خوشبو تھی۔ میری چھوٹی شہید بہن کلثوم سر میں چنبیلی کا تیل لگاتی تھی تو یہی خوشبو
کرتی تھی۔ کیا میری بہن کی روح میرے پاس آئی ہے۔ اپنی شہید بہن کو یاد کر کے م
آنکھوں میں آنسو آگئے۔ دوبارا خوشبو نہ آئی۔ میں سرنگ میں سے نکل کر باؤلی کے حو
کے پاس آگیا۔ حوض کے پانی کی سطح اندھیرے میں دھندلی دھندلی نظر آرہی تھی۔
دیوار کو ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھا تو ایک جگہ دیوار غائب تھی۔ میں نے بیٹھ کر زمین پر
لگایا تو حیران رہ گیا۔ یہ سیڑھیاں تھیں جو اوپر جا رہی تھیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا

ھیاں چڑھ کر باؤلی کی چار دیواری سے نکل آیا۔

ھولا دیوی کی مورتی کا آدھا دھڑ میری پتلون کی جیب میں تھا۔ میں نے اسے باہر نکال
ہاتھ میں پکڑ لیا۔ جنگل میں ابھی رات ڈھلنا شروع نہیں ہوئی تھی۔ میرے حساب سے
ھی رات کا وقت ہو گا۔ میں جس راستے سے آیا اسی راستے پر واپس روانہ ہو گیا۔ کھلی
ا میں آکر مجھے نئی تازگی کا احساس ہوا تھا۔ میں کروندے بن کی چٹانوں اور اونچی اونچی
اس میں سے گزر کر جنوبی ٹیلے تک آگیا۔ پھر ٹیلے کی چڑھائی چڑھ کر دوسری طرف والی
ی میں اتر گیا۔ یہ جگہ میری دیکھی بھالی تھی۔ جنگل کے اندھیرے اور سناٹے سے مجھے
ابھی ڈر خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ صرف کسی جنگلی درندے کا خطرہ تھا۔ اپنی
ظت کے لئے میں نے کمانڈو چاقو کھول کر اپنے سیدھے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ اپنے
ے تک پہنچنے کے لئے ابھی جنگل میں کافی سفر باقی تھا۔ جس وقت میں اڈے پر پہنچا تو
ت ڈھلنا شروع ہو گئی تھی۔ کمال شاہ کمانڈر کے غار کے باہر لالٹین روشن تھی۔ باڈی
رڈ رائفلیں لئے پہرے پر کھڑے تھے۔ میری آہٹ پر انہوں نے رائفلیں تان لیں۔
نے دور ہی سے کوڈ ورڈ بولا۔ وہ وہیں رک گئے۔ میں ان کے قریب پہنچا تو ایک باڈی
رڈ نے میرا نام لے کر کہا۔

"کمانڈر جاگ رہا ہے"

میں غار کے اندر چلا گیا۔ کمال شاہ شیر کی کھال پر بیٹھا قرآن شریف کی تلاوت کر رہا
۔ دیوار کے ساتھ لالٹین روشن تھی۔ میں ادب سے ایک طرف ہو کر دوزانو بیٹھ گیا۔
ھ دیر بعد کمال شاہ نے قرآن شریف کو بند کر کے چوما۔ آنکھوں سے لگایا اور جزدان میں
یٹ کر دیوار پر لٹکا دیا اور میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

"بت کا دھڑ لے آئے ہو؟"

میں نے جیب سے مورتی کا ٹوٹے ہوئے سر والا دھڑ کمال شاہ کے قدموں میں رکھ
۔ اس نے مورتی کے دھڑ کو اٹھا کر غور سے دیکھا۔ پھر اسے کونے میں ایک طرف
ینک دیا اور حکم دینے کے لہجے میں کہا۔

"اب تم جاکر سو جائے گا۔ صبح تم سے بات ہوگئی"

میں سلام کرکے اٹھا اور غار میں سے نکل کر اپنی گھاس پھوس والی جھونپڑی میں آکر لیٹ گیا۔ سخت تھکا ہوا تھا۔ آنکھیں بند کرکے سونے کی کوشش کی تو چھوٹی بہن کلثوم یاد آنے لگی۔ ضرور اس کی روح اللہ کے حکم سے میری راہ نمائی کرنے سرنگ میں آئی تھی۔ ورنہ مجھے چنبیلی کی خوشبو کبھی نہ آتی۔ اس کی شہادت کا منظر میری آنکھوں کے سامنے آگیا جب گھوڑا سوار سکھ تلوار لہراتا کھیت میں آیا تھا اور اس نے میری بہن کی گردن پر وار کیا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ میں نے دل ہی دل میں اپنی بہن کی روح کو مخاطب کرکے کہا۔

"میری بہن مجھے کافروں سے تمہارے علاوہ ان ہزاروں مسلمان بہنوں کا انتقام لینا ہے۔ جن کو سکھوں ہندوؤں نے سن سنتالی میں بے عزت کیا تھا۔ تمہارا بھائی ابھی زندہ ہے اور اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک میں کافروں سے ایک ایک مسلمان بہن کی بے عزتی اور اس پر کیئے گئے ظلم کا بدلہ نہیں لے لیتا....."

اس کے بعد میں سو گیا۔

پچھلے پہر رات کے تین بجے مجھے جگا کر کمال شاہ کمانڈو کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس وقت وہ اپنی فل کمانڈو وردی میں سر پر سبز رومال باندھے کاندھے پر رائفل لٹکائے غار کے باہر کھڑا تھا۔ دو باڈی گارڈ اس کے دائیں بائیں موجود تھے۔ ایک باڈی گارڈ کے ہاتھ میں چھوٹی سی گٹھڑی تھی۔ میں نے جاتے ہی کمال شاہ کو فوجی انداز میں ایڑیاں جوڑ کر سلیوٹ کیا۔ اس نے ہاتھ اوپر لے جاکر میرے سلیوٹ کا جواب دیا۔ پیچھے غار کے دہانے پر لالٹین جل رہی تھی۔

کمال شاہ نے ایک نظر مجھے گھور کر دیکھا۔ پھر کہا۔

"جوان! جس دن کے لئے ہم نے تمہیں تیاری کرایا تھا وہ دن آج آگیا ہے۔ تم اللہ اور اس کے نبی پاک صلعم کے نام کا پورا پورا رکھوالا بن گیا ہے۔ ہم نے

تم کو بہت تنگ کیا۔ تم کو اونٹ گھوڑے خچر کی طرح بھگایا اور مارا پیٹا۔ صرف تمہیں گالی نہیں بکا باقی تمہارے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ تم کو دھوپ میں چار چار گھنٹے دوڑایا۔ تمہیں دو دو دن بھوکا رکھا پیاسا رکھا۔ تم کو اتنا ٹارچر کیا کہ تمہاری جگہ کوئی اور جوان ہوتا تو بھاگ جاتا۔ مگر غور کرو کہ یہ سلوک ہم نے تمہارے ساتھ کیوں کیا؟ اس لئے کیا کہ تم اللہ اور اس کے نبی پاکؐ کے اسلام کا سچا باڈی گارڈ بن سکو۔ اب تمہارا مقابلہ کافر ہندو سکھ گورکھا اور ڈوگرہ فوجی سے ہے جو اتنا آسان ٹارگٹ نہیں ہے۔ اس نے بھی تمہاری موافق پورا پورا ٹریننگ لیا ہے۔ وہ بھی تمہاری طرح لڑنا جانتا ہے۔ تم میں اور اس میں فرق صرف اتنا ہے کہ تم خدا اور اس کے رسولؐ کے نام پر سر کٹانا جانتے ہو۔ م اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام پر شہید ہوجانے کو زندگی اور آخرت کا سب سے بڑا اعزاز سمجھتے ہو۔ ہم نے تمہیں فل کمانڈو کی تربیت پورا کردیا ہے اب فل کمانڈو بن گیا ہے۔ صرف اس لئے کہ تم کشمیری حریت پرستوں کے شانہ نانہ لڑسکو۔ ہندوستان کی کافر حکومت نے کشمیریوں کے حقوق کو غصب کررکھا ہے وہ نہیں چاہتی کہ کشمیری کشمیر میں اسلام کی شمع روشن کرکے اس کی روشنی ں آزادی سے زندگی بسر کریں۔ کشمیری کی بقاء اپنے اسلام کی بقا کی جنگ لڑ ہے ہیں۔ جاؤ اور ان کے ساتھ مل کر کافروں کے خلاف جہاد کرو۔۔۔۔ ارا آدمی تمہیں ہردہ کے سٹیشن تک چھوڑنے جائے گا۔ اس کے بعد تمہیں ہاں سے پانچ بجے ٹرین ملے گا۔ تم اس میں بیٹھ جائے گا۔ تمہارا دلی تک کا کٹ ہماری جیب میں ہے۔ دلی تم ایک آدمی سے جاکر ملے گا۔ اس کا نام پتہ م نے ایک کاغذ پر لکھ دیا ہے۔ وہ کاغذ ٹکٹ کے ساتھ ہم تمہیں دے گا۔ ں آدمی کا نام پتہ تم اچھی طرح یاد کرکے کاغذ کو پھاڑ کر پھینک دے گا۔ آگے ہیں کیا کرنا ہے؟ یہ وہ دلی والا آدمی تمہیں بتائے گا۔"

ر کمانڈر نے اپنے اس باڈی گارڈ کی طرف اشارہ کیا جس نے چھوٹی سی گٹھڑی اٹھائی

ہوئی تھی۔ کمانڈر نے گٹھڑی لے کر مجھے پکڑائی اور کہا۔

"اس میں تمہارے کپڑے ہیں۔ تم جھونپڑی میں جاکر یہ کپڑے پہن لے گا۔
اس کے بعد ہم تمہارے پاس آئے گا۔ گو"

میں نے گٹھڑی لے کر سلیوٹ کیا اور سیدھا جھونپڑی میں گھس گیا۔ میں نے گٹھڑی
کھولی تو اس میں ایک بادامی رنگ کا کھدر کا کرتہ اور اسی رنگ کا تنگ موہری والا پاجامہ
تھا۔ شمالی ہندوستان کے ہندو لوگ گرمیوں میں عام طور پر یہی لباس پہنتے ہیں۔ ساتھ ایک
پونا کی چپل تھی۔ جب میں نے یہ کپڑے پہن لئے تو کمانڈر جھونپڑی میں داخل ہو
جھونپڑی میں لالٹین روشن تھی۔ کمانڈر نے مجھے ہردہ سے دلی تک کا تھرڈ کلاس کا ٹک
اور ایک تہہ کیا ہوا کاغذ دیا۔

"یہ تمہارا ریل گاڑی کا ٹکٹ ہے۔ اس کاغذ پر اس آدمی کا نام پتہ اور حلیہ لکھا
ہوا ہے جس کو دلی میں جاکر رپورٹ کرو گے۔ اس کو ابھی سے یاد کرنا شروع
کردو۔ جب اچھی طرح یاد ہو جائے تو کاغذ کو پرزے پرزے کرکے جنگل میں
پھینک دینا۔"

پھر اس نے اپنی دوسری جیب سے مجھے کمانڈو چاقو نکال کر دیا اور بولا۔

"یہ چاقو ہم تمہیں نہیں دے گا۔ راستے میں اگر تم پکڑے گئے تو یہ چاقو تمہیں
پاکستانی کمانڈو ثابت کرنے کے لئے کافی ہوگا۔ تمہارا پاسپورٹ ہم نے تمہارے
کرتے کی جیب میں رکھ دیا ہے۔ اس کی اب کوئی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن
اگر تم چاہو تو اپنے پاس رکھ سکتے ہو"

میں نے کرتے کی چور جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہاں میرا پاکستانی پاسپورٹ موجود تھا۔
نے وہ کمانڈر کو دیتے ہوئے کہا۔

"مجھے اب اس کی ضرورت نہیں۔ لیکن میں اسے ضائع کرنے کی جرات نہیں
کرسکتا۔ یہ میرے پیارے وطن پاکستان کا پاسپورٹ ہے۔"

کمانڈر نے کہا۔

"یہ پاسپورٹ میرے لئے بھی ایک مقدس امانت ہے۔ یہ تمہاری امانت میرے
پاس محفوظ رہے گی"

اور کمانڈر نے پاسپورٹ مجھ سے لے کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پھر اس نے مجھے
ن کرنسی میں پانچ پانچ روپے کے بیس نوٹ دے کر کہا۔

"دلی تک تمہارے لئے یہ رقم کافی ہوگی۔ آگے وہ آدمی تمہارا ذمہ دار ہوگا
جس کو تم جاکر رپورٹ کرو گے۔ اب اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ وقت
بہت کم رہ گیا ہے"

میں کمانڈر کے ساتھ جھونپڑی سے باہر آگیا۔ باہر ایک باڈی گارڈ گھوڑے پر بیٹھا تھا۔
ا خالی گھوڑا پاس ہی کھڑا تھا۔ کمانڈر نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"جوان! تمہیں زیادہ ہدایتیں دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے ہندوؤں والا
لباس پہنا ہے۔ اپنا کوئی بھی ہندوؤں والا نام رکھ لینا۔ تم ہندو بن کر دلی تک
جائے گا۔ کوئی پوچھے کہاں سے آرہے ہو تو کہہ دینا تم بمبئی میں اپنے بڑے
بھائی سے ملنے گئے تھے جو دادر میں کپڑے کی دکان کرتا ہے۔ اپنے آپ کو
پنجابی ہندو ظاہر کرنا۔ کیونکہ تمہاری اردو دلی لکھنؤ والوں کی اردو نہیں ہے۔
اب جاؤ-----"

اس نے مجھے گلے لگایا اور کہا۔

"اللہ تمہیں شہادت کا مرتبہ عطا کرے"

میں کچھ جذباتی ہوگیا۔ میں نے کمانڈر کا ہاتھ تھام لیا اور کہا۔

"میرے پاس آپ کا شکریہ ادا کرنے کے واسطے الفاظ نہیں ہیں کمانڈر"

اس نے کرخت لہجے میں کہا۔

"بکو مت-----گو"

ایک دم پلٹ کر اپنے غار کی طرف چل دیا۔ میں خالی گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ باڈی گارڈ
نے گھوڑے کو لیکر آگے آگے اور میرا گھوڑا اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ کمال شاہ کا باڈی

گارڈ مجھے ایک ایسے راستے سے لے گیا جو جنگل کے باہر باہر سے گزرتا تھا اور جہاں
درخت کم اور گھاس زیادہ تھی۔ یہاں ہم گھوڑوں کو دوڑاتے چلے گئے۔ اس طرح سے
راستہ جلدی طے ہوگیا۔ مگر ہمیں راستے میں ہی صبح ہوگئی تھی اور آسمان پر سپیدہ سحر پھیلنے
لگا تھا۔ جس وقت ہم ہردہ کے چھوٹے سے شہر میں پہنچے تو باڈی گارڈ نے اپنی گھڑی دیکھ کر
کہا۔

"گاڑی آنے میں ابھی پچیس منٹ باقی ہیں۔ ہم ٹھیک وقت پر آگئے ہیں۔"

شہر میں ابھی چہل پہل شروع نہیں ہوئی تھی۔ اکثر دکانیں بند تھیں۔ کسی مندر میں
گھنٹیاں بجنے کی آواز آرہی تھی۔ باڈی گارڈ مجھے خالی سڑک پر گزار کر ریلوے سٹیشن ہردہ
کی پچھلی طرف لے آیا۔ اس نے کہا۔

"سامنے سٹیشن ہے۔"

میں گھوڑے سے اتر پڑا۔ باڈی گارڈ نے گھوڑے کی باگ تھامی اور مجھ سے کوئی بات
کئے بغیر دونوں گھوڑے دوڑاتا واپس چلا گیا۔ میں دوسری طرف سے ہوکر سٹیشن کے
چھوٹی سی ڈیوڑھی والے گیٹ پر آگیا۔ یہاں دو تین یکے کھڑے تھے جن میں سے سواریاں
اتر رہی تھیں اور اپنا سامان قلیوں کے سروں پر رکھوا رہی تھیں۔ ٹکٹ میرے پاس ہی
تھا۔ گیٹ پر ایک ٹکٹ چیکر پرانی سی وردی پہنے موجود تھا۔ اس نے میرا ٹکٹ لے کر اسے
مین اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چھوٹے سے اوزار سے ایک طرف سوراخ کیا اور ٹکٹ
مجھے واپس دے دیا۔ میں پلیٹ فارم پر آکر ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے ٹکٹ جیب میں
رکھنے کے لئے ہاتھ ڈالا تو مجھے محسوس ہوا کہ کمال شاہ نے مجھے دلی میں جس آدمی کو رپورٹ
کرنے کے لئے اس کا نام پتہ اور حلیہ لکھ کر دیا تھا وہ کاغذ میری جیب میں ہی پڑا ہے اور
راستے میں میں نے اسے نکال کر یاد ہی نہیں کیا تھا۔

میں جلدی سے اٹھا اور پلیٹ فارم پر ٹہلتا ٹہلتا اپنے اپنے سامان کے پاس بیٹھے
ہوئے مسافروں کے قریب سے گزرتا دور نکل گیا۔ میں ٹہلتا ٹہلتا پلیٹ فارم کے آخری
سرے تک پہنچ گیا جہاں سٹیشن کے نام کا اردو انگریزی اور ہندی زبانوں میں تختہ لگا تھا

یں جانب پلیٹ فارم کی آہنی چھت کے نیچے کھمبے کے ساتھ لکڑی کا ایک بکس رکھا ہوا
۔ میں اس بکس پر بیٹھ گیا۔ ادھر ادھر دیکھ کر بظاہر بڑی بے نیازی سے جیب میں سے
ذ نکال کر کھولا۔ اس پر دلی والے آدمی کا نام اس کا حلیہ اور اس کا ایڈریس لکھا تھا۔
آپ کو اس کا نام پتہ اور حلیہ نہیں بتاؤں گا۔ کیونکہ وہ آدمی آج بھی دلی میں ہے اور
کشمیر میں ایک اور ہی انداز سے شریک ہے۔ میں نے بار بار کاغذ پر لکھی تحریر کو پڑھا۔
مجھے اس آدمی کا نام پتہ اور حلیہ زبانی پکا پانی یاد ہوگیا تو میں کاغذ کو آہستہ آہستہ
ڑنے لگا۔ جب کاغذ پرزے پرزے ہوگیا تو میں نے ان پرزوں کو مٹھی میں بند کیا۔ اٹھ
دوسری طرف والی ریلوے لائن پر آیا اور اسے پلیٹ فارم پر اندر کی جانب ریلوے
ن پر بکھیر دیا۔

اس کام سے مطمئن ہوکر میں واپس پلیٹ فارم کے بینچ پر آکر بیٹھ گیا۔ ریل گاڑی کو
ں سے آنا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ کوئی ایکسپریس ٹرین ہے مگر ہردہ سٹیشن پر تھوڑی دیر کے
رکتی ہے۔ پلیٹ فارم پر کافی مسافر بیٹھے تھے۔ کینٹین بھی کھلی تھی۔ کچھ لوگ کاؤنٹر پر
ڑے ناشتہ وغیرہ کر رہے تھے۔ چائے پی رہے تھے۔ میں نے ناشتہ نہیں کیا تھا۔ مگر اب
ک پاس میرے لئے اتنی اہم چیزیں نہیں رہی تھی۔ کمانڈو کی ٹریننگ نے مجھے لوہے کا
ی بنا دیا تھا۔ یہ میری مرضی تھی میں جب چاہے ناشتہ کروں۔ نہ بھی کروں تو کوئی فرق
پڑتا تھا۔ اتنے میں دور سے ریل کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ بھارت میں چونکہ کوئلہ
پایا جاتا ہے اس لئے وہاں بھاپ والے انجن کی گاڑیاں عام چلتی ہیں۔ ڈیزل اور بجلی کی
یوں کا ابھی اتنا رواج نہیں ہوا تھا۔ پھر ٹرین آکر پلیٹ فارم پر رک گئی۔ دو مریل جسم
لے کالے سے ریلوے پولیس کے سپاہی پلیٹ فارم پر ڈنڈے ہاتھوں میں لئے نظر
ے۔ لیکن وہ کینٹین کے کاؤنٹر پر کھڑے مزے سے چائے پی رہے تھے۔ میں بھی
ے مسافروں کے ساتھ تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں گھس گیا۔ ٹرین سٹیشن پر بمشکل
نٹ رکی اور چھک چھک کرتی آگے روانہ ہوگئی۔

مجھے معلوم تھا کہ دلی تک کا سفر کافی لمبا ہے۔ میں نے ڈبے کے کونے میں لیٹرین کے

اپنے لئے جگہ بنالی۔ کھڑکی میری سیٹ کے ساتھ ہی تھی۔ ٹرین ایکسپریس تھی
چھوٹے چھوٹے سٹیشن چھوڑتی چلی جارہی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوشنگ آباد کا سٹیشن آیا
ٹرین یہاں سے چلی تو اس کی رفتار کافی تیز ہوگئی۔ آگے بھوپال کا نیم پہاڑی جنگلاتی علاقہ
شروع ہوگیا۔ مجھے نیند آنے لگی تھی۔ میں نے گہری نگاہ سے ڈبے میں بیٹھے مسافروں کا
جائزہ لیا۔ مجھے کوئی بھی مشکوک چہرہ نظر نہ آیا۔ میں نے کھڑکی کے ساتھ سر لگا کر آنکھیں
بند کرلیں۔ نیند نے ہلکے ہلکے ہلکورے دیتے ہوئے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ جب
میری آنکھ کھلی تو گاڑی للت پور کے پلیٹ فارم میں داخل ہو رہی تھی۔ میں کافی دیر تک
سویا رہا تھا۔ للت پور سے ٹرین چلی تو جھانسی کے سٹیشن پر جاکر رکی۔ اس وقت دوپہر ہو
چکی تھی۔ جھانسی کافی بڑا جنکشن تھا۔ یہاں ٹرین کو کافی دیر رکنا تھا۔ میں پلیٹ فام پر
آیا۔ ایک کینٹین پر جاکر میں نے دال چاول کھائے چائے پی۔ وہیں سے سگریٹ کا
پیکٹ اور ماچس خریدی۔ سگریٹ سلگایا اور کینٹین کی اوٹ میں ایک بنچ کے کونے پر
کر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ سگریٹ پینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن میں چاہتا تھا
دیکھنے والوں کو میں بھی عام ہندو نوجوان ایسا نارمل نوجوان لگوں۔ سگریٹ بھارت
نوجوان عام پیتے تھے۔

ٹرین کے ایک ڈبے میں ریلوے کے ملازم بڑے بڑے ٹوکرے اور لکڑی کے بکس
رہے تھے۔ انجن گاڑی سے الگ ہو چکا تھا۔ میری عقابی نگاہیں برابر پلیٹ فارم پر
پھرنے والوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ریلوے پولیس کے دو تین سپاہی ادھر ادھر
رہے تھے مگر میری طرف کسی کی توجہ نہیں تھی۔ آخر انجن آکر ٹرین کے ساتھ لگ
اس پانچ منٹ بعد انجن نے وسل دیا۔ گارڈ نے سیٹی بجائی۔ میں دوڑ کر اپنے ڈبے
آگیا۔ جھانسی سے روانہ ہوکر گاڑی ایک بار پھر جنگلوں میں سفر کرنے لگی۔ راستے میں
ندی نالے دریا آئے۔ دتیہ کا شہر آیا۔ وہاں بھی گاڑی کچھ دیر کے لئے رکی۔ اس کے
ویلور نام کا بڑا شہر آیا۔ جب گاڑی گوالیار پہنچی تو رات ہو چکی تھی۔ یہاں میں نے
فارم پر اتر کر وہی اپنی پسندیدہ ڈش بند مکھن کھالیا۔ مجھے رات کو کھانے کی ضرورت

چائے پی اور ڈبے میں اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ جس طرح کہ لمبے سفر میں ہوا کرتا
میری ساتھ والی سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر کا ہندو بیٹھا تھا۔ اس سے کبھی کبھی تھوڑی
بات چیت ہو جاتی تھی۔ وہ بھی دلی جارہا تھا۔ وہاں کپڑے کا چھوٹا موٹا بزنس کرتا تھا۔
نے اسے اپنا ایک ہندووانہ نام بتا دیا اور کہا کہ بمبئی اپنے بڑے بھائی سے ملنے گیا تھا
واپس امرتسر اپنے شہر جارہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ تھی جیسا کہ کمال شاہ نے مجھے
ت کی تھی۔ میرا اردو کا لہجہ پنجابی آمیز تھا۔ اس لئے میرے واسطے یہی بہتر تھا کہ میں
وامرتسر کا ہندو ظاہر کروں۔

ساری رات گاڑی چلتی رہی۔ آدھی رات کو کہیں آگرہ کا شہر آیا اور گزر گیا۔ میں
سیٹ پر ہی کچھ سویا کچھ جاگتا بیٹھا رہا۔ پھر میں بھی دوسرے مسافروں کی طرح وہیں
بیٹھا سوگیا۔ اب مجھ میں وہ بات نہیں رہی تھی کہ سفر کی تھکان محسوس ہو اور نیند
ں نہ ہونے سے سردرد کرنے لگے۔ کمال شاہ کی ٹریننگ نے میرے اعصاب لوہے کے
یے تھے۔ میرے لئے دس منٹ کی نیند بھی بہت تھی۔ دن نکل آیا تھا جب ٹرین متھرا
سٹیشن پر رکی۔ یہاں کچھ سادھو قسم کے لوگ ہاتھوں میں ترشول اور کرمنڈل پکڑے
یں پہنے ڈبے میں آگئے۔ ضعیف الاعتقاد ہندو مسافروں نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔
ں اپنی سیٹیں دے دیں اور ان کی تواضع پوڑیوں کچوریوں کی کرنے لگے۔ میں خاموشی
اپنی کونے والی سیٹ پر بیٹھا یہ تماشہ دیکھتا رہا۔ یہاں سے گاڑی چلی تو گڑگانواں کا
ن بھی آکر گزر گیا۔ دوپہر کا ایک بج رہا تھا کہ دلی شہر کے مضافات شروع ہوگئے۔ چھ
پہلے جب میں دلی سے ٹرین میں بیٹھ کر کمال شاہ مجاہد کمانڈو سے ملنے چلا تھا تو میں ایک
ں نوجوان تھا۔ میں سہا ہوا تھا۔ قدم قدم پر مجھے یہی ڈر لگ رہا تھا کہ بھارتی پولیس
پیچھا کر رہی ہے۔ اور مجھے کسی وقت کسی بھی جگہ پکڑ کر اذیت ناک ٹارچر کے جہنم
دھکیل سکتی ہے۔ میرے اندر ایک خوف بیٹھ گیا تھا۔ یہ اس مرد مومن کمال شاہ کا
تھا کہ اس نے میرے دل سے' میری رگوں میں گردش کرنے والے خون سے کافر کا
ں نکال کر خدا کا خوف داخل کر دیا تھا۔ اب میں محتاط پہلے سے زیادہ تھا مگر خوف زدہ

بالکل نہیں تھا۔ میری آنکھیں پہلے سے زیادہ مہارت اور گہرائی کے ساتھ ڈبے میں بیٹھے ہوئے مسافروں کا جائزہ لے رہی تھیں۔

دلی سٹیشن کے پلیٹ فارم پر گاڑی رکی تو میں بڑے آرام سے ڈبے سے نکلا۔ کرتے کی جیب سے ٹکٹ نکال کر ہاتھ میں پکڑا۔ ایک طرف کھڑے ہو کر سگریٹ سلگایا اور دوسرے مسافروں کے ساتھ ساتھ چلتا گیٹ پر آگیا۔ ٹکٹ چیکر ٹکٹ لے لے کر ہاتھ میں ہی جمع کرتا جا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے بھی ٹکٹ لے لیا۔ اس کے پاس ایک کانسٹیبل سٹول پر بیٹھا مسافروں کو ایک نظر دیکھ لیتا تھا۔ سٹیشن کے احاطے سے باہر آکر میں نے ایک موٹر رکشا لیا اور اسے ایک جگہ کا نام بتا کر کہا کہ مجھے وہاں پہنچا دو۔ دلی میں جس شخص سے ملنے کے لئے مجھے کہا تھا۔ میں اس کا نام اور جگہ پوشیدہ رکھوں گا۔ اس کا ایک فرضی نام گل خان رکھ لیتے ہیں۔ موٹر رکشا دلی کی بھاری ٹریفک والی سڑکوں سے گزرتا شہر سے باہر چھوٹی چھوٹی نئی بستیوں میں آگیا۔ یہ ماڈرن اور نئی بستیاں تھیں۔ چھوٹے چھوٹے کوارٹر نما اور کوٹھی نما مکانات ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ آگے چھوٹے چھوٹے صحن تھے جن میں درخت اور پودے لگے تھے۔ رکشا اس آبادی سے بھی نکل گیا۔ جب بائیں جانب ایک غیر آباد جگہ پر پرانی بارہ دری کا کھنڈر میں نے دیکھا تو میں نے رکشا رکوایا۔ اسے کرایہ ادا کیا اور کھنڈر کی طرف چلنے لگا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی جس میں کافی حدت تھی۔ لیکن میں نے کرتا پاجامہ پہن رکھا تھا جس کی وجہ سے مجھے زیادہ گرمی نہیں لگ رہی تھی۔ ویسے بھی میرا جسم موسموں کے شدید اثرات سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ کمانڈر کمال شاہ نے مجھے زبانی بتایا تھا کہ کھنڈر کے پیچھے ایک سوکھا ہوا برساتی نالہ آئے گا۔ اس نالے کی دوسری جانب تمہیں کچھ پرانے کوارٹر نظر آئیں گے۔ ان کوارٹروں میں ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے۔ اس مسجد میں جا کر کسی بھی نمازی سے اس خاص آدمی کا نام پوچھ لینا جس کو تم نے جا کر رپورٹ کرنی ہے۔ کمال شاہ نے مجھے کچھ کوڈ ورڈ بھی بتا دیئے تھے جو مجھے اس آدمی کے آگے بولنے تھے۔ یہ خاص خفیہ الفاظ یا وہ شخص جانتا تھا یا کمال شاہ اور یا پھر اب مجھے معلوم تھے۔

میں نالے کے بوسیدہ سے پل پر سے ہوتا ہوا کوارٹروں کی چھوٹی سی بستی میں آگیا۔ ایک چھوٹی سی کوارٹر نما مسجد بھی تھی۔ مسجد میں ایک مولوی صاحب وضو کرنے والی ٹونٹی کے آگے بیٹھے مسواک کر رہے تھے۔ میں جوتے اتار کر مسجد کے صحن میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا اور مولوی صاحب کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ کیونکہ اس آدمی کے بارے میں مولوی صاحب مجھے ضرور بتا سکتے تھے۔ مولوی صاحب نے دو بار کلی کی اور پھر صافے سے منہ اور داڑھی پونچھتے اٹھ کر باہر جانے لگے تو مجھے دیکھ کر رک گئے۔

اتنی دیر میں میں بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ انہوں نے خالص دلی والوں کی نفیس اور بامحاورہ زبان میں مجھ سے پوچھا کہ میاں اجنبی لگتے ہو کہاں سے آئے ہو۔ میں نے اپنی پنجابی اردو میں کہا۔

"مجھے ایک آدمی کی تلاش ہے۔ مالیر کوٹلہ سے آیا ہوں"

مالیر کوٹلہ بھارتی پنجاب کا ایک ریاستی شہر ہے جہاں سن سنتالیس کے فسادات میں مسلمان محفوظ رہے تھے اور انہیں سکھوں نے کچھ نہیں کہا تھا بلکہ ان کی حفاظت کی تھی۔ اس کے پیچھے سکھوں کی مذہبی تاریخ کا ایک واقعہ ہے جسے یہاں بیان کرنا میں ضروری نہیں سمجھتا۔ اتنا بتا دینا ہی کافی ہے مالیر کوٹلہ میں پنجابی مسلمان اب بھی آباد تھے۔

مولوی صاحب نے پوچھا۔

"یہاں کس سے ملنا ہے میاں؟"

میں نے وہ نام بتایا جو مجھے کمال شاہ نے بتایا تھا۔ مولوی صاحب بولے

"میاں وہ تو من موجی آدمی ہے۔ کبھی نماز پڑھنے مسجد میں آجاتا ہے۔ کبھی نہیں آتا۔"

میں نے اس شخص کا جو فرضی نام گل خان رکھا ہے اب میں اسے اسی نام سے لکھوں گا۔ گل خان کے بارے میں مولوی صاحب نے مزید بتایا کہ سامنے والی قطار کے آخری کوارٹر میں رہتا ہے جا کر پتہ کرلو۔ ہو سکتا ہے وہ اس وقت گھر پر ہی ہو۔

"ویسے وہ شہر کے کسی بینک میں ملازمت کرتا ہے۔"

میں نے مولوی صاحب کا شکریہ ادا کیا اور مسجد سے نکل کر سامنے والی کواٹروں کی
قطار کے آخری کواٹر کے پاس آکر رک گیا۔ یہ غریبانہ سے کواٹر تھے۔ شہتوت کے ایک
درخت کے نیچے دو تین بکریاں بیٹھی تھیں کچھ بچے ادھرادھر کھیل رہے تھے۔ گل خان
کے کواٹر کا دروازہ بند تھا۔ اندر صحن میں نیم کا بہت بڑا پیڑ اگا ہوا تھا جس نے کواٹر
ٹھنڈی چھاؤں کر رکھی تھی۔ دروازے کے باہر مجھے گھنٹی کا بٹن نظر نہ آیا تو میں۔
دروازے پر دستک دے دی۔ تین چار بار دستک دینے کے بعد صحن میں کسی کے قدمو
کی چاپ سنائی دی ساتھ ہی بھاری رعب دار آواز بھی آئی۔

"آرہا ہوں بھائی آرہا ہوں۔ دروازہ نہ توڑو"

دروازہ کھلا اور میرے سامنے درمیانے قد کا ایک سرخ و سپید آدمی کھڑا تھا۔
پچاس برس کے قریب ہوگی مگر صحت بڑی اچھی تھی۔ سر کے بال خشخشی تھے جن میں
بال کثرت سے اگے ہوئے تھے۔ ململ کے کرتے کے نیچے چوخانہ تہمد باندھا ہوا تھا۔
گول تھا۔ آنکھیں عقاب کی طرح چمکیلی اور تیز تھیں۔ حاجیوں والا زرد رومال کاندھو
تھا۔ میری طرف غور سے دیکھ کر اس شخص نے جس کا فرضی نام میں نے گل خان
ہے پوچھا۔

"کیوں میاں کس سے ملنا ہے؟ کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"مجھے کمال شاہ صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے"

اس مرد مومن کا نام سن کر گل خان دروازے میں سے تھوڑا سا آگے ہو کر دائی
بائیں دیکھا اور کہا۔

"اندر آجاؤ"

اندر چھوٹا سا صحن تھا جس پر نیم کے درخت نے سایہ کر رکھا تھا۔ درخت کے
ایک چارپائی بچھی تھی۔ چارپائی کے پاس ہی لوہے کی کرسی پڑی تھی۔ کونے میں کھڑا

نلکے نیچے بالٹی میں تھوڑا تھوڑا پانی گر رہا تھا۔ ساتھ ہی چھوٹا سا باتھ روم تھا۔ سامنے
ر کا کمرہ تھا جس کا آدھا دروازہ کھلا تھا۔ اندر چھت کے ساتھ چلتے ہوئے پنکھے کی مجھے
جھلک نظر آرہی تھی۔ گل خان مجھے اسی کمرے میں لے گیا۔ اس نے دروازہ بند کر
چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں ایک طرف دیوار کے ساتھ پلنگ بچھا تھا۔ ایک ٹرنک پڑا تھا۔
ٹی کے ساتھ کچھ کپڑے لٹک رہے تھے پلنگ کے اوپر دیوار پر خانہ کعبہ کی رنگین
ر والا کیلنڈر لگا تھا۔ ایک سٹول اور دو پرانی کرسیاں بھی تھیں۔ گل خان نے مجھے
ی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ خود میرے سامنے سٹول پر بیٹھ گیا۔ کمرے کی عقبی دیوار میں
سلاخ دار کھڑکی کھلی تھی۔ اس کا میلا سا پھول دار پردہ چنا ہوا تھا۔ کمرے میں اس
ڑکی میں سے دن کی روشنی آرہی تھی۔

گل خان نے مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا اور کوڈ ورڈز میں ایک جملہ بولا۔ مجھے کمال شاہ
سب کچھ زبانی بتا دیا ہوا تھا۔ میں نے بھی اس کے جواب میں ایک جملہ بول دیا۔ یہ
ی طرف سے گل خان کے کوڈ ورڈ کے جواب میں کوڈ ورڈ تھا۔ اس کے بعد گل خان
کوڈ ورڈز میں پوچھا۔

"جب تم ٹیلے پر سے دریا میں گرے تھے تو اس سے اگلا سٹیشن کس شہر کا آیا
تھا؟"

مجھے اس بے ہنگم مگر اہم کوڈ کا جواب معلوم تھا۔ میں نے فوراً جواب دیا۔

"اگلا سٹیشن شاہ مراد کا تھا"

گل خان نے مجھ سے مصافحہ کیا اور بولا۔

"کتنے ماہ کمانڈو ٹریننگ لی ہے تم نے؟"

میں نے کہا۔

"چھ ماہ"

گل خان نے اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا
"شاہ صاحب نے تمہیں اے کلاس کمانڈو کی تربیت دی ہے اس کا مطلب ہے

تمہیں کچھ روز میرے پاس رہ کر بھی ٹریننگ حاصل کرنی ہوگی۔"

میں نے پوچھا۔

"اب کس بات کی ٹریننگ ہوگی؟"

گل خان نے بے نیازی سے کہا۔

"تمہیں جلد معلوم ہو جائے گا"

مجھے اکتاہٹ ضرور محسوس ہوئی۔ کیونکہ میں جلد سے جلد کشمیر کی لڑائی میں حصہ لینا چاہتا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ گل خان نے مجھے جو کچھ سکھایا اس علم کے بغیر میں اے کلاس کمانڈو ہوتے ہوئے بھی ادھورا کمانڈو تھا۔ گل خان نے ایکسپلو سویز کا ماہر تھا۔ خدا جانے اس نے یہ ٹیکنیکل علم کہاں سے حاصل کیا تھا۔ اس نے سب سے پہلے مجھے یہ بتایا کہ بارود سے دھماکہ کیوں ہوتا ہے۔ مجھے بتایا کہ ہوا کا دباؤ کیا ہوتا ہے اور اگر کسی بم میں لوہے کے ٹکڑے، کیل اور شیشے کی کرچیاں نہ بھی ہوں تو وہ جہاں پھٹتا ہے وہاں ہوا کا خلا کیوں پیدا ہوتا ہے اور دھماکے کے پریشر سے چیزیں اپنی جگہ سے کیوں اڑ جاتی ہیں۔ پھر اس نے مجھے ڈائنامائیٹ کے چھوٹے چھوٹے مگر انتہائی طاقتور میگنیٹک بم بنانے سکھائے۔ وہ مجھے صبح صبح اٹھا کر اپنے ساتھ دریائے جمنا کے پار کسی تاریخی کھنڈر میں لے جاتا۔ وہاں اس نے ایک خفیہ سرنگ میں اے کلاس کمانڈوز کی تربیت کے لئے ایکسپلو کا سارا سامان رکھا تھا۔ اس نے مجھے ٹائم بم کی تربیت بھی دی اور یہ بھی سکھایا کہ قلم کاغذ ماچس لائیٹر انگوٹھی سگریٹ سگار رسٹ واچ اور ٹوتھ برش کو انتہائی دھماکے خیز بم میں کیسے تبدیل کیا جاتا ہے۔ بموں کے چھوٹے چھوٹے ماڈل وہ سرنگ کے اندر خفیہ جگہ پر میرے سامنے بناتا اور پھر ان میں تیزاب اور بارود کے ملانے سے چھوٹے چھوٹے دھماکے کر کے دکھاتا۔ سب سے آخر میں اس نے مجھے ایسا بم دکھایا جو انسانی جسم کے اندر جا کر پھٹتا تھا۔ یہ درد کی گولی جتنا تھا۔ گل خان نے کہا۔

"یہ بم آدمی اگر درد یا کسی بھی درد کی گولی سمجھ کر کھالے تو انسان کے جسم میں جا کر یہ اپنا عمل شروع کر دیتا ہے۔ آدمی کے معدے میں جو تیزابی مادہ ہوتا ہے

وہ آہستہ آہستہ اس بم کی گولی کو گلا کر جب اس کی تہہ میں چھپائے گئے مادے تک پہنچتا ہے تو آدمی کے معدے میں ایک دھماکہ ہوتا ہے اور اس کا پیٹ پھٹ جاتا ہے اور جسم دو ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ چھ منٹ لگتے ہیں"

گل خان نے اس قسم کے ٹیبلٹ بم پلاسٹک کے لفافوں میں ایک لڑی کی شکل میں ڈال کر رکھے ہوئے تھے۔ ان کے اوپر درد دور کرنے کی ایک مشہور دوا کا نام بھی چھپا ہوا تھا۔ ان بموں کی تعداد پندرہ تھی۔ گل خان نے ان پندرہ ٹیبلٹ بموں کا پیکٹ میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

ان ٹیبلٹ بموں کو تم نے کمانڈو ایکشن کے دوران خاص خاص موقعوں پر استعمال کرنا ہوگا۔ یہ انڈین فوج کے پندرہ بڑے بڑے اور خاص خاص افسروں کو ہلاک کرنے کے لئے ہیں۔ لیکن میں تمہیں ان کے بنانے کی ترکیب اور فارمولا بھی بتائے دیتا ہوں تاکہ اگر ان کے بعد بھی ضرورت پڑے تو تم خود انہیں تیار کر سکو"

گل خان نے مجھے ٹیبلٹ بم بنانے کا پورا فارمولا سمجھا دیا اور اسے لکھ کر بھی دے دیا۔ یہ فارمولا اس طرح لکھا گیا تھا کہ سوائے میرے اور گل خان کے اور کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔ یہ کوڈ ورڈز میں لکھا گیا تھا اور اس میں گرم مصالحوں، دار چینی جائفل، الائچی اور کالی مرچوں کے نام بار بار آتے تھے۔ اگر اسے کوئی دیکھ بھی لے تو یہی لگتا تھا کہ یہ گوشت کا مزیدار سالن ہے یا بریانی تیار کرنے کا نسخہ ہے۔

گل خان کہنے لگا۔

"اگر کسی ایسے آدمی کو تم یہ ٹیبلٹ بم پانی یا چائے کافی کے ساتھ کھلا دوگے جس کے معدے میں تیزابیت زیادہ ہوگی تو یہ بم دو منٹ میں بھی پھٹ سکتا ہے۔"

مجھے یہ بم دشمن کے سرکردہ آدمیوں کو جہنم میں پہنچانے کے لئے بڑا کارآمد لگا۔ یہ

ایک ڈرامائی بم تھا۔ اس کا کسی کو کوئی ثبوت بھی نہیں مل سکتا تھا۔

میں گل خان کے پاس پورے ایک ہفتے رہا اور وہاں سے جب نکلا تو میں
ایکسپلوسوز کا ماہر بن چکا تھا اور پندرہ ٹیبلٹ بم جو اسپرو کی گولیوں کی شکل میں پلاسٹک
میں لپٹے ایک چھوٹی سی پلاسٹک کی ڈبیا میں بند تھے میرے پاس تھے۔ میں نے ان
ٹیبلٹ بم بنانے کا نسخہ بھی ساتھ ہی رکھ دیا تھا۔ یہ چھوٹی سی گول ڈبیا میں نے پلاسٹک کے
لفافے میں ڈال کر اپنے پیٹ کے ساتھ باندھ لی تھی تاکہ محفوظ رہے۔

اب گل خان نے مجھے ایک ایسے کشمیری مجاہد کا اصلی نام اور پتہ زبانی یاد کرایا
جموں شہر میں رہتا تھا۔ گل خان نے اس مجاہد کا نام لے کر کہا۔

"تم اسے جا کر رپورٹ کرو گے۔ وہ تم سے کوڈ ورڈ میں ایک سوال کرے گا۔ تم
کوڈ ورڈ میں اس کا جواب دو گے"

گل خان نے مجھے یہ کوڈ ورڈ والا جواب بھی اچھی طرح سے ذہن نشین کرا دیا
اس مجاہد کا حلیہ بھی بتا دیا۔ دلی میں گل خان کے پاس یہ میری آخری رات تھی۔ صبح
مجھے ریلوے سٹیشن سے ٹرین میں بیٹھ کر جالندھر روانہ ہونا تھا جہاں سے مجھے جموں
لئے دوسری گاڑی پکڑنی تھی۔ گل خان کہنے لگا۔

"جالندھر میں حالات آج کل حکومت کے سخت خلاف ہیں۔ خالصتان کی تحریک
زوروں پر ہے اگر وہاں صورت حال بدلتی نظر آئی تو ٹرین کا انتظار نہ کرنا۔ کسی
لاری میں بیٹھ کر جموں پہنچ جانا۔ اگر پکڑے جاؤ تو سب سے پہلے معدے میں
جا کر پھٹنے والے ان ٹیبلٹ بموں کو ضائع کر دینا۔ کیونکہ اگر یہ دشمن کے ہاتھ
آ گئے تو اس بات کا امکان ہے کہ اس انتہائی قیمتی اور کشمیر کی کمانڈو جنگ میں
کام آنے والے بم کا راز فاش ہو جائے۔ یہ بات کشمیری مجاہدین کی تحریک
آزادی کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اس سے زیادہ میں تجھے کچھ نہیں بتانا چاہتا کہ
یہ ٹیبلٹ بم کمانڈو لڑائی میں کہاں کہاں استعمال ہو رہے ہیں۔"

گل خان نے صبح صبح مجھے اٹھا دیا۔ مجھے ناشتہ کرایا اور کہا۔

"میرا آدمی بارہ دری کے کھنڈر کی دوسری طرف ٹرک لے کر تمہارا انتظار کر
رہا ہے۔ وہ تمہیں سٹیشن پر پہنچا دے گا۔ جو جو سبق میں نے تمہیں سکھائے
ہیں انہیں یاد رکھنا۔ اب آگے تمہیں اپنی عقل سے کام لینا ہوگا۔ اگر پکڑے
گئے تو اپنی عقل سے کام لے کر بتانا ہوگا کہ تم کون ہو اور جموں کیا کرنے
جا رہے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ کمانڈر کمال شاہ نے تمہیں بڑے سے بڑا ٹارچر
برداشت کرنے کی زبردست تربیت دی ہے۔ لیکن انڈین پنجاب کی سکھ پولیس
نے اذیت دینے کے نئے نئے طریقے ایجاد کر رکھے ہیں۔ اگر اذیت برداشت
سے باہر ہو جائے تو مر جانا مگر دشمن کے آگے میرا اور کمال شاہ کا نام ہرگز نہ
لینا۔ تمہارے اکیلے کے مر جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن اگر تم نے
میرا یا کمانڈر کمال شاہ کا نام بتا دیا تو تحریک آزادی کشمیر کو ناقابل تلافی نقصان
پہنچے گا۔"

میں نے گل خان سے کہا۔

"محترم! میں تو آیا ہی تحریک آزادی کشمیر پر جان قربان کرنے کے لئے ہوں۔ یہ
کیسے ہو سکتا ہے کہ مجھے اس کا موقع ملے اور میں اپنی جان قربان نہ کروں"

گل خان نے مجھے گلے سے لگا کر میری پیٹھ پر تھاپڑا دیا اور بولا۔

"اب تم نکل چلو۔۔۔۔۔ اللہ حافظ!"

اس وقت پو پھٹ رہی تھی۔ کوارٹروں پر پچھلے پہر کا اندھیرا اور خاموشی چھائی ہوئی
تھی۔ میں تیز تیز قدموں سے کوارٹروں کی آبادی سے نکل کر بارہ دری کے کھنڈر کی طرف
ہو گیا۔ راستہ میرا جانا پہچانا تھا۔ بارہ دری کے دوسری طرف آیا تو وہاں اندھیرے میں کچی
سڑک کے کنارے ایک ٹرک کھڑا تھا۔ مجھے قریب آتا دیکھ کر گل خان کے آدمی نے ٹرک
سٹارٹ کر دیا۔ میں اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا اور ٹرک دلی شہر کی طرف چل
پڑا۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ یہ اکتوبر کے شروع کا موسم تھا اور رات کو خنکی ہو جاتی تھی۔
گل خان نے مجھے نائیلون کی نسواری رنگ کی ایک جیکٹ پہنا دی تھی۔ اس نے کہا تھا۔

"جموں میں سری ہوگی۔ یہ وہاں تمہارے کام آئے گی"

ٹرک نے مجھے دلی کے ریلوے سٹیشن کے باہر اتار دیا۔ جس ٹرین میں مجھے جالندھر تک جانا تھا وہ کلکتہ کی طرف آ رہی تھی۔ یہ بات مجھے گل خان نے بتا دی تھی اور تاکید کی تھی کہ چونکہ پنجاب میں سیکورٹی بڑی سخت ہے اور انٹیلی جینس کے آدمی ریلوے سٹیشنوں پر اکثر منڈ لاتے پھرتے ہیں اس لئے وقت سے پہلے پلیٹ فارم پر مت جانا اور کلکا ایکسپریس کی آخری بوگی کے کسی ڈبے میں بیٹھنے کی کوشش کرنا۔ ہو سکتا ہے گل خان کو اس بات کا تجربہ ہو کہ انٹیلی جینس والے آخری ڈبوں کی طرف کم توجہ دیتے ہیں۔ کلکا ایکسپریس کے آنے میں ابھی بیس منٹ رہتے تھے۔ میں اتنی دیر سٹیشن کے باہر ہی ایک جگہ گھاس کے پلاٹ میں بیٹھا رہا۔ جب ٹرین کے آنے میں چھ سات منٹ رہ گئے تو میں سٹیشن میں آگیا۔ ٹکٹ میں نے آتے ہی لے لیا تھا۔ میری خوش قسمتی کہ ٹرین لیٹ نہیں تھی۔ ٹھیک وقت پر آئی۔ میں گل خان کی ہدایت کے مطابق پچھلی بوگی کی طرف گیا۔ ٹرین کلکتہ سے امرتسر تک چلتی تھی۔ اس میں کافی رش تھا۔ میں نے گرے کلر کا ہندوانہ کرتہ اور تنگ موہری کا پاجامہ اور گل خان کی دی ہوئی نائیلون کی نسواری جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ پاؤں میں بنگلوری چپل تھی۔ میری کمر کے ساتھ وہ رومال بندھا جس میں پلاسٹک کے لفافے میں بند وہ چھوٹی سی ڈبیا تھی جس کے اندر اسپرو کی گولیوں کی شکل کے پندرہ ٹیبلٹ بم تھے۔ مجھے سب سے زیادہ ان کی فکر تھی کیونکہ یہ ایک کمانڈو کا بڑا قیمتی سرمایہ تھا۔ یہ پندرہ ٹیبلٹ بم دشمن کے پندرہ کمانڈروں یا جرنیلوں کو برباد کر سکتے تھے۔ پلیٹ فارم میں آتے وقت بھی میں نے کمانڈو کی عقابی نگاہوں سے لوگوں کا جائزہ لیا تھا اور ڈبے میں بیٹھنے کے بعد بھی میں نے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہروں کو خاص نگاہوں سے دیکھا۔ مجھے ان میں کوئی مشتبہ شخص دکھائی نہ دیا۔

یہ میری بھول تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ آدمی چاہے جتنا مکمل ہو جائے کہیں نہ کہیں اس سے غلطی ضرور ہو جاتی ہے۔ مجھ سے بھی غلطی ہوگئی تھی۔ غلطی یہ ہوئی تھی کہ میں نے اپنی کمانڈو ٹریننگ اور فنی مہارت اور چہرہ شناسی کی اپنی صلاحیت پر ضرورت سے زیادہ

بھروسہ کر لیا تھا۔ اصل میں ایک آدمی اس وقت سے ہی میرے پیچھے لگ گیا تھا جب میں دلی سٹیشن کے سامنے والے پلاٹ میں میں گھاس پر بیٹھا تھا۔ یہ دلی پولیس کے انٹیلی جینس بیورو کا آدمی تھا۔ میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ مگر میں اس کی نگاہوں میں تھا اور میری بد قسمتی کہ وہ میرے ڈبے میں آکر میری سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ جب تک گاڑی کھڑی رہی اس شخص نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ جب گاڑی دلی شہر سے کافی آگے نکل گئی تو اس نے مجھ سے باتیں شروع کر دیں۔ اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکال کر مجھے سگریٹ پیش کیا۔

"آپ سگریٹ پئیں گے؟"

مجھ سے یہ حماقت ہوگئی کہ میرے منہ سے نکل گیا کہ میں سگریٹ نہیں پیتا۔ اصل میں مجھے سگریٹ کی واقعی عادت نہیں تھی اور اس کا نشہ بھی نہیں تھا۔ لیکن ایک تربیت یافتہ کمانڈو کی حیثیت سے مجھے یاد رکھنا چاہیے تھا کہ میں سٹیشن کے باہر پلاٹ میں بیٹھا ہوا تو سگریٹ پی رہا تھا۔ اس آدمی نے مسکراتے ہوئے یہی بات کہی۔

"مگر آپ باہر پلاٹ میں تو سگریٹ پی رہے تھے"

میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ ایک سیکنڈ میں میں سمجھ گیا کہ یہ انٹیلی جینس کا آدمی ہے اور اس وقت سے میری نگرانی کر رہا ہے میں سٹیشن کے باہر پلاٹ میں بیٹھا تھا۔

میں نے ہنس کر کہا۔

"بات یہ ہے مہاراج کہ اس وقت میرا سگریٹ پینے کو جی نہیں چاہتا۔ میں کبھی کبھی ہی سگریٹ پیتا ہوں"

اس شخص کا حلیہ یہ تھا کہ عمر جوانی کی حدود پار کر رہی تھی۔ بالوں پر تھوڑا تھوڑا خضاب لگا ہوا تھا۔ سر درمیان سے کچھ گنجا تھا۔ بدن بھاری تھا۔ میلی سی خاکی رنگ کی قمیض کے اوپر میل خورے کلر کا ٹھنڈا کوٹ پہنا ہوا تھا۔ نیچے گبرڈین کی پتلون تھی۔ وہ سگریٹ انگلیوں میں لے کر ہاتھ کی مٹھی بنا کر اس کے کش لگا رہا تھا۔ دو ایک بار وہ کھانستا تو

ساتھ والے مسافر نے اس کی طرف ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اس آدمی نے ہنس کر کہا۔

"یہ لو مہاراج سگریٹ پھینک دیتے ہیں"

اور اس نے سگریٹ سیٹ پر سے ذرا سا اٹھ کر میری کھڑکی کے باہر پھینک دیا۔ پھر
وہ بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ مجھ سے باتیں کرنے لگا۔

"بھاپاجی آپ امرتسر جا رہے ہیں کیا؟"

میں جان بوجھ کر کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس دوران میں نے ساری حکمت عملی
ذہن میں تیار کرلی تھی کہ مجھے اس کے سوالوں کے کیا جواب دینے ہیں۔ پہلے تو میں نے
ظاہر کیا کہ میں نے اس کی بات نہیں سنی۔ جب اس نے میرے گھٹنے کو انگلیوں سے ذرا
ہلاتے ہوئے اپنے سوال کو دہرایا تو میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"ہاں جی امرتسر جانا ہے مجھے"

جالندھر کا ویسے بھی مجھے نام نہیں لینا تھا۔ امرتسر کا نام میں نے اس لئے بول دیا
کہ اگر اس نے امرتسر کے بارے میں پوچھا کہ وہاں کہاں رہتے ہو تو میں امرتسر شہر کے
بازاروں اور محلوں سے کافی واقف تھا۔ اس کے سوال کا جواب دے سکتا تھا۔ اس نے
جب پوچھا کہ امرتسر کہاں رہتے ہو بھاپاجی تو میں نے بے نیازی سے کہا۔

"سنگھ پورے میں رہتا ہوں"

وہ آدمی بڑا چالاک تھا۔ کہنے لگا۔

"سنگھ پورے میں پاکستان سے آئے ہوئے شرنارتھی رہتے ہیں کیا تم بھی پاکستان
سے آئے تھے؟"

میں نے کہہ دیا۔

"ہاں جی۔ میرے ماتا پتا کا گھر لاہور سنت نگر میں تھا"

لاہور میں جو ہندوؤں کے محلے تھے ان سب کا مجھے پتہ تھا۔ میرے قریب بیٹھے
ہوئے ایک آدمی نے خوش ہو کر کہا۔

"مہاشہ جی ہم بھی لاہور کے رہنے والے ہیں ہمارا گھر شاہ عالمی میں تھا"

یہ اچھی خاصی عمر کا ہندو تھا۔ اس نے لاہور کی باتیں شروع کردیں میں بڑا خوش ہوا
کہ انٹیلی جینس والے کے سوال جواب سے جان چھوٹی۔ میں نے لاہور کے ہندوؤں کے
محلوں اور وہاں مسلمانوں کے حملوں اور مکانوں کو آگ لگانے کی فرضی کہانیاں بیان کرنی
شروع کردیں۔ اس دوران میں انٹیلی جینس ایجنٹ کو ایک نظر دیکھ لیتا۔ وہ میری طرف
دیکھ کر اسی طرح مسکرا رہا تھا جیسے اسے میری کسی بات کا یقین نہ آرہا ہو۔ میں دوسرے
مسافر سے لاہور شہر کی باتیں کر رہا تھا اور دل میں سوچ رہا تھا کہ جالندھر تک بڑا لمبا سفر
ہے۔ انٹیلی جینس کا آدمی تو میری جان نہیں چھوڑے گا اس سے کس طرح پیچھا چھڑایا
جائے میں فل کمانڈو تھا اور کشمیر کے محاذ پر دشمن کی صفوں میں تباہی مچانے جا رہا تھا اگر
اس آدمی نے مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کردیا جو یہ کرسکتا ہے تو یہ میرے مشن کا بہت
بڑا نقصان ہوگا۔ میری کمر کے ساتھ بندھی ہوئی اسپرو کی گولیاں یعنی ٹیبلٹ بم بھی برآمد
ہو جائیں گے۔ میں نے اگر کہا کہ یہ سردرد کی گولیاں ہیں تو پولیس پوچھے گی کہ سردرد کی
گولیوں کو پلاسٹک کی ڈبی میں بند کرکے کمر کے ساتھ باندھنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر
پولیس کی لیبارٹری میں ان گولیوں کا تجزیہ کیا گیا تو فوراً یہ راز کھل جائے گا کہ ان گولیوں
میں دھماکہ خیز مادہ بھرا ہوا ہے۔ میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کرنے لگا۔ اب مجھے ڈر خوف
کوئی نہیں تھا۔ صرف ذہن الجھ سا گیا تھا کہ اس انٹیلی جینس والے کی وجہ سے کہیں میرا
مشن ادھورا نہ رہ جائے۔

کلکتہ ایکسپریس ہوا سے باتیں کرتی اپنی منزل کی طرف اڑی جا رہی تھی۔ آخر میں
نے یہی فیصلہ کیا کہ راستے میں کسی جگہ موقع دیکھ کر کسی بھی چھوٹے بڑے سٹیشن پر
چائے وغیرہ پینے کے بہانے اتر جاؤں گا اور وہاں سے فرار ہو جاؤں گا۔ ظاہر ہے اگر یہ
آدمی میرے پیچھے اتر بھی آیا تو دوڑنے میں میرا مقابلہ نہیں کرسکے گا۔ میں کمانڈو تھا۔ اور
گھوڑے کی طرح دوڑ سکتا تھا۔ یہ سوچ کر مجھے کچھ اطمینان سا ہوگیا۔ اب میں نے یہ سکیم
بنائی جب دن ڈھل جائے گا اور شام کا اندھیرا ہونے لگے گا تب ٹرین سے اتروں گا۔ جس
بات سے مجھے یقین ہوگیا کہ یہ انٹیلی جینس کا آدمی ہے اور ایک خاص مقصد لے کر میرا

پیچھا کر رہا ہے وہ بات یہ ہوئی کہ اس نے میرا اچانک پکڑ لیا اور عیاری سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ماراج! میرا وچار یہ کہتا ہے کہ آپ کو پاکستان سے آئے دو مہینے ہی ہوئے ہیں۔ آپ کا وچار کیا کہتا ہے"

میں اپنے حواس کو پوری طرح سنبھالے ہوئے تھا اور بظاہر بڑی بے نیازی اور اکھڑ کے ساتھ بول رہا تھا۔ اس آدمی کے اس سوال پر میں نے کسی قدر برہم ہو کر کہا۔

"آپ کوئی جوتشی ہیں؟ اگر آپ جوتشی ہیں تو آپ کو جیوتش ودیا کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ میری عمر اس وقت سات آٹھ سال کی تھی جب میں اپنے ماتا پتا کے ساتھ اپنا سب گھر بار پاکستان میں لٹوا کر امرتسر آیا تھا۔ تب سے لے کر آج تک میں کبھی پاکستان نہیں گیا"

وہ عیار آدمی برابر مسکرائے جا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"ماراج ناراض کیوں ہوتے ہیں۔ آپ کا نام کیا ہے؟

میں کندن لال کہہ کر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ میرا شک اب یقین میں بدل گیا تھا۔ یہ آدمی تھا پنجابی' ہندو۔ یا دلی کی انٹیلی جینس پولیس یا جالندھر امرتسر کی انٹیلی جینس پولیس کا آدمی تھا۔ وہ مجھ سے پنجابی میں ہی بات کر رہا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"بڑا اچھا نام ہے۔ سہگل جی کا بھی یہی نام تھا۔ وہ جالندھر میں رہتا تھا آپ بھی کہیں جالندھر تو نہیں جا رہے؟"

میرا دل ذرا سا تیز دھڑکا مگر فوراً ہی اپنے معمول پر آگیا۔ اس نے جان بوجھ کر اس شہر کا نام لیا تھا جہاں میں جا رہا تھا۔ جو شہر اس وقت میرا ٹارگٹ تھا۔ ہو سکتا ہے اس۔ بلف چال چلی ہو لیکن یہ اس کی کام کر گئی تھی۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ اگ سٹیشن پر کسی نہ کسی بہانے ٹرین سے اتر کر فرار ہو جاؤں گا۔ ایک بار فرار ہو گیا تو چا دن کی روشنی ہی کیوں نہ ہو۔ اس کا باپ بھی مجھے نہ پکڑ سکے گا۔

مصیبت یہ تھی کہ یہ ایکسپریس ٹرین تھی۔ سٹیشن پر سٹیشن چھوڑتی جا رہی تھی۔ مجھے

معلوم نہیں تھا کہ اگلا بڑا سٹیشن کونسا آرہا تھا۔ ایک مسافر نے میرا یہ مسئلہ حل کر دیا۔ نے کسی عورت سے کہا۔

"اماں بس اب میرٹھ آیا ہی سمجھو"

میرٹھ ایک بڑا شہر تھا۔ اس کا سٹیشن بھی بڑا تھا۔ یہاں اگر میں ایک دفعہ اتر کر پوش ہونے میں کامیاب ہو گیا تو پھر پولیس کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ میں کسی بھی طرف جاؤں گا اور کہیں سے بھی کوئی لاری پکڑ کر کسی دوسرے شہر پہنچ جاؤں گا۔ کبھی کبھی ڈو مشن میں ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ بالکل نپی تلی درست رپورٹوں کی روشنی میں ٹ تک پہنچنے کی سکیم تیار کی جاتی ہے۔ مگر کمانڈو جب اپنے ٹارگٹ پر پہنچتا ہے تو اکثر بھی ہوتا ہے کہ حالات بدل چکے ہوتے ہیں اور وہاں پھر اپنی عقل سے کام لے کر کسی ری سکیم پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اس بات کا امکان بھی تھا کہ اگر میں پکڑا جاؤں تو ہونے کا موقع نہ مل سکے۔ ایسی صورت میں مجھے سب سے پہلے ٹیبلٹ بم کی گولیوں حفوظ کرنا تھا۔

میں جس سیٹ پر بیٹھا تھا ٹائیلٹ اس کے ساتھ ہی تھی۔ میں ٹائیلٹ میں چلا گیا۔ زے کو اندر سے چٹخنی لگا کر میں نے فوراً اپنی کمر کے گرد بندھا ہوا رومال کھولا۔ اس پلاسٹک کی جو چھوٹی سی ڈبی بندھی ہوئی تھی اسے کھول کر اس میں سے ٹیبلٹ بم کی ی ٹکیوں کا فیتہ جو میں نے تہہ کر کے رکھا ہوا تھا نکال کر جیب میں ڈال لیا۔ ڈبی اور ل وہیں ٹائیلٹ میں سے نیچے لائینوں میں پھینک دیا۔ اب کسی کو ان گولیوں کے فیتے ک نہیں پڑ سکتا تھا۔ کوئی بھی اسے دیکھ کر یہی سمجھتا کہ یہ اسپرو کی گولیاں ہیں۔

ٹرین کی رفتار ہلکی ہو گئی تھی۔ میرٹھ کا سٹیشن آرہا تھا۔ میں ٹائیلٹ سے نکل کر اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ انٹیلی جینس ایجنٹ جھک کر میرے والی کھڑکی میں سے باہر رہا تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہو گئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ باہر کیوں دیکھ رہا وہ یقیناً" ریلوے پولیس کے سپاہیوں کو بلانا چاہتا تھا۔ ٹرین رکی تو عین سامنے دو کانسٹیبل کھڑے نظر آئے۔ انٹیلی جینس ایجنٹ نے انہیں اشارہ کیا اور خود ڈبے کے

دروازے کی طرف بڑھا۔ میرے پکڑے جانے میں اب کوئی شبہ نہیں تھا۔ پولیس کانسٹیبل اپنے آدمی کا مخصوص اشارہ پاکر ڈبے کی طرف بڑھے۔ میرے پاس فرار ہونے کی کوشش کرنے کے لئے صرف تین چار سیکنڈ تھے۔ ابھی انٹیلی جینس ایجنٹ ڈبے کے دروازے تک نہیں پہنچا تھا اور کچھ مسافر میرٹھ کے سٹیشن پر اترنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے ان کی آڑلی اور ڈبے کی دوسری طرف والی کھڑکی میں سے باہر کود گیا۔ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا جتنی آسانی سے میں نے بیان کر دیا۔ کوئی عام آدمی یہ نہیں کر سکتا تھا۔ مگر مجھے اس کی ٹریننگ دی گئی تھی اور یہ میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا دوسری طرف ریل کی ایک اور پٹڑی تھی اور اس کے آگے دوسرا پلیٹ فارم تھا۔ میں نے تیز سے لائن عبور کی اور اچھل کر دوسرے پلیٹ فارم پر چڑھ گیا اور تیز تیز قدموں سامنے والے گیٹ کی طرف بڑھا۔ اسی دوران پیچھے سے کانسٹیبلوں نے سیٹیاں بجانی شروع کر دی تھیں۔ مگر میں نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ دوسرے پلیٹ فارم پر چونکہ کوئی گاڑی نہیں کھڑی تھی اس لئے گیٹ خالی تھی۔ میں تیز قدم اٹھاتا گیٹ سے نکل گیا سامنے سڑک تھی۔ ایک طرف رکشے وغیرہ کھڑے تھے۔ میں نے جو پہلا خالی رکشا دیکھا اس میں بیٹھ کر رکشے والے سے کہا۔

"چلو"

اس نے پوچھا۔

"کدھر جانا ہے بابو جی؟"۔

میں نے کہا

"تم چلو ابھی بتاتا ہوں"

یہ موٹر رکشا تھا۔ بائیسکل والا رکشا نہیں تھا۔ رکشا چل پڑا۔ دن کے دس بجے کا ہوگا۔ بازار کھلے تھے۔ بڑی رونق تھی۔ ٹریفک بھی کافی تھی۔ میں نے پچھلی کھڑکی کا پر کر پیچھے دیکھا۔ دوسرے رکشے اور گاڑیاں اور تانگے وغیرہ آرہے تھے۔ ان میں پولیس کوئی گاڑی نہیں تھی۔ لیکن ایسا ہو سکتا تھا کہ خفیہ پولیس کا آدمی کسی دوسرے رکشے

تعاقب کر رہا ہو۔ اس زمانے میں ابھی موبائیل ٹیلی فون کا رواج نہیں ہوا تھا۔ خفیہ
اتنی جلدی پولیس کو الرٹ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر اس نے مجھے سٹیشن سے رکشا میں
ہوتے دیکھ لیا تھا تو ممکن تھا کہ وہ کسی دوسرے رکشے میں میرا پیچھا کر رہا ہو۔ لیکن
کا امکان بہت کم تھا۔

انڈیا میں جب کمانڈو کے ساتھ ایسی صورت پیش آتی ہے تو قدرتی طور اس کے دل
وہاں کے کسی مسلمان کا یا مسجد کا ہی خیال آتا ہے۔ کیونکہ انڈیا میں مسلمان کروڑوں
تعداد میں آباد ہیں۔ اگرچہ وہ ہندوؤں کی غلامی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ پھر اسلام کا
ط رشتہ ہر مسلمان کو ایک دوسرے کے قریب کر دیتا ہے۔ لیکن کمال شاہ نے مجھے یہ
ت بھی کر دی تھی کہ اگر کبھی ایسی صورت حال پیش آجائے تو سوچ سمجھ کر کسی
مان کے ہاں پناہ لینا۔ اگر پناہ بھی لینی پڑ جائے تو اسے اپنے بارے میں ہرگز نہ بتانا کہ تم
ہو اور کس مشن پر کہاں جا رہے ہو۔ اپنے آپ کو پاکستانی بھی ظاہر نہ کرنا اور پاکستان
بارے میں زیادہ باتیں بھی نہ کرنا۔ میرے محترم استاد اور مرد مومن کمال شاہ نے مجھے
ی بتا دیا تھا کہ انڈیا کی پولیس چاہے کیسی بھی ہے مگر اس کی خفیہ پولیس بڑی چاق و
د ہے۔ اس سے کبھی غافل نہ ہونا۔ چنانچہ میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ انٹیلی جینس ایجنٹ
ر میرے تعقب میں ہے۔ رکشا ایک چوک میں پہنچا تو ڈرائیور نے مجھ سے پوچھا۔

"آپ کو جانا کہاں ہے بابو؟"

میں نے کہا۔

"بائیں طرف والے بازار میں چلو۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔"

رکشا بائیں طرف والے بازار کی طرف گھوم گیا یہ بازار رونق والا نہیں تھا۔ یہ زمانہ
پینسٹھ کی انڈیا پاکستان جنگ سے ایک سال پہلے کا زمانہ تھا اور ابھی شہروں کی آبادی اتنی
نہیں بڑھی تھی۔ کشمیر کے محاذ پر حریت پرست کشمیری اپنی آزادی اور اپنے بقا کی
برابر لڑ رہے تھے۔ اسی جنگ سے تنگ آکر انڈیا نے اگست 1965ء میں آزاد کشمیر پر
کر دیا تھا۔ وہ اپنی فوجی طاقت کے بل بوتے پر آزاد کشمیر کو بھی ہڑپ کر لینا چاہتا تھا

تا کہ پورے کشمیر پر اس کا ناجائز قبضہ ہو جائے۔ مگر یہ سودا اسے بڑا مہنگا پڑا۔ جب آزاد کشمیر پر اس نے اٹیک کیا اور اپنی بھاری نفری اور چین کا ہوا دکھا کر امریکہ سے لئے ہوئے بے پناہ اسلحہ کے زعم میں اس نے پاکستان کی سرحد پر بھی گولہ باری شروع کر دی اور اس کی توپوں کے گولے پاکستان کے دیہات اعوان شریف میں گرے تو پاکستانی فوج میدان میں آگئی۔ اس کے بعد انڈیا کو جس عبرت ناک شکست کا سامنا کرنا پڑا اور جس قدر ذلت آمیز ہزیمت اٹھانی پڑی وہ ساری دنیا کو معلوم ہے۔ میں آگے چل کر اس زمانے کے حالات بھی بیان کروں گا۔ ابھی تو میں رکشے میں بیٹھا میرٹھ شہر کے کسی بازار میں سے گزر رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ خفیہ پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔

مجھ پر گھبراہٹ وغیرہ بالکل طاری نہیں تھی۔ لیکن میں ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کے لئے الرٹ ضرور ہو چکا تھا۔ اس وقت میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھے شک بلکہ بہت حد تک یقین تھا۔ جس بازار میں میرا رکشا جا رہا تھا اس کے آگے بھی ایک چوک آتا تھا۔ جیسے ہی رکشا چوک کے قریب پہنچا دوسری سڑک پر سے پولیس کی ایک گاڑی بڑی تیزی سے آئی۔ چوک میں آکر گاڑی کو بریک لگی۔ اس میں سے چار پانچ کانسٹیبل چھلانگیں لگا کر نکلے اور انہوں نے بازار کو بلاک کر دیا ایک انسپکٹر ہاتھ میں پستول لئے بازار کے درمیان میں آکر کھڑا ہو گیا۔ ہمارے آگے ایک گاڑی اور ایک رکشا جا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ دے کر انہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے رکشا ڈرائیور سے کہا۔

"رکشا روکو"

جیسے ہی رکشے کی رفتار ذرا کم ہوئی میں نے رکشے میں سے چھلانگ لگا دی اور سا ایک گلی میں گھس گیا۔ خفیہ پولیس والے نے اپنی اعلیٰ کارکردگی دکھاتی تھی۔ ضرور ا نے مجھے سٹیشن کے باہر رکشے میں سوار ہوتے دیکھ لیا تھا اور کسی طریقے سے پولیس سٹیش اطلاع کر دی تھی اور خود رکشا یا کوئی اور سواری لیکر میرے تعاقب میں روانہ ہو گیا تھا۔

مجھے اب یہ خطرہ تھا کہ گلی آگے سے بند نہ ہو۔ گلی بند نہیں ہوتی تھی۔ میں دوڑ کی بجائے تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ گلی بالکل خالی تھی۔ دونوں جانب مکان تھے۔

ڑی دور جا کر ایک اور بازار میں نکلتی تھی جو نسبتاً چھوٹا بازار تھا اور اس کی دکانیں بھی لی تھیں۔ یہاں مجھے مکانوں کے درمیان ایک مسجد کا دروازہ دکھائی دیا۔ مسجد کا دروازہ ف پہچانا جاتا ہے۔ میں سیدھا دو چار سیڑھیاں چڑھ کر مسجد میں داخل ہو گیا۔ چپل اتار بغل میں دبائی اور مسجد کے صحن میں سے گزر کر منبر والے چھوٹے سے ہال کمرے میں یا۔ یہاں ایک بزرگ صورت سفید ڈاڑھی والا بھاری بھرکم آدمی بیٹھا دعا مانگ رہا تھا۔ بھی اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ پولیس نے اس سارے علاقے کو ہرے میں لیا ہوگا اور تھوڑی دیر میں پولیس تلاشی لیتی ہوئی اس مسجد میں بھی پہنچ جائے ۔ یہ بات بھی واضح ہو چکی تھی کہ پولیس کو میرے پاکستانی جاسوس یا کشمیری حریت پسند نے کا یقین ہو چکا ہے اور وہ ہر حالت میں مجھے گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ یہ ان لوگوں کا اپنا تھا۔ پولیس کو یہ بھی یقین ہو گیا ہو گا کہ میں مسلمان ہی ہو سکتا ہوں اور وہ مجھے تلاش ی مسجد میں ضرور آئے گی کیونکہ ایک مسلمان حریت پسند اس قسم کے حالات میں مسجد ہی پناہ لے سکتا ہے۔ میں نے اس بزرگ سے جو کچھ کہنا تھا وہ سوچ لیا تھا۔ مگر میرے زیادہ وقت نہیں تھا۔ میں خدا سے یہ دعا مانگنے لگا کہ بزرگ دعا مانگنے سے جلد فارغ ۔

اتنے میں اس بزرگ نے منہ پر ہاتھ پھیرا اور اٹھ کر باہر جانے لگا تو میں نے السلام م کہا۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور وعلیکم السلام کر کے مسجد کے صحن کی ف بڑھ گیا۔ میں نے آواز دے کر کہا۔

"آپ سے ایک بات کرنی تھی"

وہ بزرگ رک گیا اور دو قدم چل کر واپس میرے قریب آکر بولا۔

"کہو میاں۔ کیا بات ہے؟"

معاملہ بڑا نازک تھا۔ اصل حقیقت چھپانے سے کام نہیں بن سکتا تھا۔ اور اصل یقت بیان کر دینے سے میرے لئے مزید خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔ یہ مسلمان بزرگ کسی ی قسم کا انڈین مسلمان بھی ہو سکتا تھا۔ اس وقت صرف اس بات کی ضرورت تھی

کہ اس مسلمان کے دل میں جذبہ ایمانی کو بیدار کر دیا جائے۔ چنانچہ میں نے ایک ہی سانس میں کہا۔

"میں الحمد اللہ مسلمان ہوں۔ اللہ اور اس کے نبی پاکؐ کے نام پر کشمیر میں اسلام کی خاطر جہاد کر رہا ہوں۔ ایک ضروری کام سے یہاں آیا تھا۔ پولیس میرے پیچھے لگی ہے۔ مجھے کچھ دیر کے لئے کسی جگہ چھپا دیجئے۔ آپ کو جنت کا ثواب ملے گا"

اس بزرگ کے دل میں ایمان کا جذبہ پہلے ہی سے بیدار تھا۔ وہ پکا مسلمان تھا۔ اس نے دوسری بات ہی نہ کی۔ صرف اتنا کہا۔

"مسجد کی چھت پر چلے جاؤ۔ وہیں بیٹھے رہنا میں آکر تمہیں ساتھ لے جاؤں گا"

میں دیوار کے ساتھ والی سیڑھیاں چڑھ کر مسجد کی چھت پر جا کر بیٹھ گیا۔ میری دونوں جانب مکانوں کی دیواریں میں اوپر تک چلی گئی تھیں۔ عقب میں کوئی مکان نہیں تھا۔ وہاں بھی ایک سیڑھی نیچے شاید کسی گلی میں جاتی تھی۔ مگر میں بزرگ کی ہدایت کے مطابق مسجد کی چھت پر ہی بیٹھا رہا۔ دوسرے بازار کی طرف سے پولیس کی سیٹیوں کی مخصوص آوازیں دو تین بار سنائی دیں۔ پولیس موجود تھی اور میری تلاش شروع ہو گئی تھی۔ جس رکشے میں میں سفر کر رہا تھا اس کے ڈرائیور نے ضرور پولیس کو بتا دیا ہو گا کہ میں فلاں گلی میں گھسا تھا۔ پولیس اس گلی میں پہنچنے ہی والی ہو گی۔ یا ہو سکتا ہے پہنچ گئی ہو اور اس مسجد کی طرف آ رہی ہو جس کی چھت پر میں چھپ کر بیٹھا ہوں۔ میں نے سوچا کہ بزرگ کو حالات کی سنگینی کا کہاں احساس ہو گا۔ مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے میں دوسری طرف والی سیڑھیاں اترنے کے لئے اٹھا ہی تھا کہ وہی بزرگ ان سیڑھیوں میں نمودار ہوا اور اشارے سے مجھے بلا کر کہا۔

"جلدی سے میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ"

مسجد کی یہ عقبی سیڑھیاں ایک تنگ گلی میں اترتی تھیں۔ گلی خالی تھی۔ وہ بزرگ میرے آگے آگے چل رہے تھے۔ میں ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ کوئی بات نہیں کر رہے

ے۔ میں بھی خاموش تھا۔ آگے جا کر یہ تنگ سی گلی ایک بازار میں نکل آئی۔ یہاں ایک ن کے باہر ایک پرانا سا او-سپا سکوٹر کھڑا تھا۔ بزرگ نے مجھے سکوٹر کے پیچھے بیٹھنے کو کہا۔ وں نے سکوٹر سٹارٹ کیا اور مجھے لے کر بازار میں اس سمت کو مڑ گئے جو پولیس کی ن والے بازار سے مخالف سمت تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے خطرے کے علاقے سے لے جانا چاہتے ہیں۔ بزرگ بڑی مہارت اور تیز رفتار کے ساتھ سکوٹر چلا رہے تھے۔ تین چوراہے عبور کرنے کے بعد انہوں نے ایک جگہ سے ریلوے کا پل پار کیا۔ دوسری ب گھاس منڈی تھی۔ سکوٹر وہاں سے بھی آگے نکل گیا۔ اس دوران بزرگ بالکل وش رہے۔ گھاس منڈی کے آگے شہر کی پرانی اور گنجان آبادی والا علاقہ شروع ہو گیا۔ دو تین تنگ سے بازاروں میں سے گزرنے کے بعد ہمارا سکوٹر ایک گلی میں داخل کے بعد ایک مکان کی ڈیوڑھی میں آکر رک گیا۔

بزرگ نے سکوٹر سے اتر کر بیٹھک کا دروازہ کھولا اور مجھ سے کہا۔

"اندر آجاؤ میاں"

یہ چھوٹی سی بیٹھک تھی جس کی فضا میں گھٹن اور ٹھنڈک سی تھی۔ اندھیرا بھی تھا۔ نے بتی جلا دی۔ بیٹھک کا فرش ننگا تھا۔ دو تین آرام کرسیاں اور ایک چھوٹی سی میزان کرسیوں کے درمیان پڑی تھی۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ بزرگ نے دروازہ بند کے چٹخنی چڑھا دی اور میرے سامنے کرسی پر بیٹھنے کے بعد کہا۔

"اب بتاؤ میاں اصل بات کیا ہے اور تم کون ہو؟ میں تو تمہیں کشمیری حریت پسند مجاہد سمجھ کر تمہیں بچا کر یہاں لے آیا ہوں۔ مگر تم مجھے اپنی باتوں سے کشمیری نہیں لگتے۔"

اصل حقیقت میں نے اس بزرگ کو بھی نہ بتائی۔ میں نے کہا۔
"میں مالیر کوٹلے کا رہنے والا پنجابی ہوں۔ شوق شہادت میں سرشار ہو کر کشمیر کے محاذ
حریت پرست مجاہدوں میں شامل ہوا ہوں۔ آپ نے ٹھیک فرمایا۔ میں کشمیری نہیں ہوں
لیکن مسلمان ہوں"
وہ بزرگ کہنے لگے۔
"تم عین وقت پر میرے پاس آ گئے تھے اگر ذرا دیر کر دیتے تو پولیس نے تمہیں
پکڑ لینا تھا۔ پولیس مسجد والی گلی میں تمہاری تلاش میں پہنچ گئی تھی۔ اب بتاؤ تم
کہاں جانا چاہتے ہو؟"
میں نے اپنی جیب سے جالندھر کا ریلوے ٹکٹ نکال کر دکھایا اور کہا۔
"میں جالندھر پہنچنا چاہتا ہوں۔ وہاں سے کسی نہ کسی طرح جموں کشمیر چلا جاؤں
گا۔"
بزرگ کہنے لگے۔
"اس کے لئے ہمیں کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ پولیس ریلوے
سٹیشن اور لاری اڈوں پر تمہاری نگرانی کر رہی ہوگی۔ خفیہ ایجنسی کے جر
آدمی نے تمہیں دیکھا ہوا ہے اس نے تمہارا حلیہ پولیس کو بتا دیا ہو گا۔"
وہ بزرگ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ مگر میرا اس شہر میں زیادہ دیر تک رکے رہنا

ں تھا۔ اس دوران پولیس شہر کی پوری پوری ناکہ بندی کر سکتی تھی اور پھر میرے لئے
ٹھ شہر سے نکلنا مزید مشکل ہو جاتا۔ میں نے کہا۔
"محترم کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ مجھے کسی طرح شہر سے باہر نکال دیں"
وہ کہنے لگے۔
"نکالنے کو تو میں ابھی تمہیں اپنے سکوٹر پر بٹھا کر شہر سے باہر پہنچا سکتا
ہوں۔ لیکن بھارتی پولیس کچی گولیاں نہیں کھیلی۔ وہ جگہ جگہ اور خاص طور پر
شہر سے باہر جانے والے راستوں پر لوگوں کو روک کر پوچھ گچھ کر رہی ہو گی
چور قاتل اور ڈاکو کے لئے پولیس اتنا تردد نہیں کرتی۔ کیا دوسرے ملک کے
جاسوس اور کشمیری مجاہدوں کو پکڑنے کے لئے تو وہ جان کی بازی بھی لگا دیتی
ہے۔ خدا نہ کرے اگر ہم پکڑ لئے گئے تو تمہارے ساتھ میں بھی پکڑا جاؤں گا۔
تم تو پولیس کی حراست سے نکل کر فرار بھی ہو سکتے ہو مگر میری تو ساری نسل
برباد ہو جائے گی"
میں خاموش رہا۔ بزرگ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ انہوں نے عین موقع پر میری مدد کی
۔ میں ان کی انسانی اور اسلامی ہمدردی کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ کچھ دیر
چنے کے بعد وہ کہنے لگے۔
"تم ایسا کرو کہ کسی نہ کسی طرح رات ہو لینے دو اتنی دیر یہاں چھپے رہو۔
یہاں کوئی تمہیں پکڑنے نہیں آئے گا۔ جیسے ہی رات ذرا گہری ہو گی میں
تمہیں سکوٹر پر بٹھا کر شہر سے باہر چھوڑ آؤں گا۔ جی ٹی روڈ پر پہنچ کر تم کسی
چلتی بس لاری یا ٹرک میں سوار ہو جانا۔ میرٹھ شہر کے کسی بس اڈے یا اسٹیشن
سے تمہارا گاڑی پکڑنا کسی طرح بھی ٹھیک نہیں رہے گا۔"
انہوں نے بڑی اچھی سکیم بتائی تھی۔ میں نے کہا۔ ٹھیک ہے۔ میں یہاں رات
نے کا انتظار کروں گا۔ میں نے ان کا شکریہ بھی ادا کیا۔ اس پر وہ بزرگ بولے۔
"میاں شکریے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بھی مسلمان ہوں اور

کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کا پرستار ہوں۔ ہماری انڈین حکومت نے کشمیریوں کی مرضی کے خلاف جموں کشمیر میں صرف ناجائز قبضہ ہی نہیں کر رکھا بلکہ اس کی فوج وہاں مسلمانوں پر بے پناہ مظالم توڑ رہی ہے۔ اب میری جوانی کی عمر نہیں رہی ورنہ میں خود جہاد کشمیر میں شامل ہو کر کافر ہندوؤں کے خلاف جنگ کرتا"

میں میرٹھ شہر کے اس بھارتی مسلمان بزرگ کے اس جذبے سے بڑا متاثر ہوا
دوپہر کا کھانا میں نے وہیں بیٹھک میں ہی کھایا۔ اوپر اس بزرگ کی معمر والدہ ایک ملاز
کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔ اس کے بڑے لڑکے نے شادی کے بعد شہر میں الگ مکان بن
ہوا تھا۔ دو لڑکیوں کی وہ شادی کر چکے تھے جن میں سے ایک سہارن پور میں اور دوسر
الہ آباد میں رہتی تھی۔ دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد میں بیٹھک میں ہی سو گیا۔ بزرگ
بیٹھک کو باہر سے تالا لگا گئے تھے۔ میں کافی حد تک بے فکر ہو گیا تھا چنانچہ شام تک سو
رہا۔ شام کو آنکھ کھلی تو وہ بزرگ بھی آ گئے۔ وہ ایک ٹرے میں چائے کی چینک اور دو
پیالیاں رکھ کر لائے تھے۔ ہم نے بیٹھک میں ہی چائے پی۔ وہ جہاد کشمیر کے بارے میں
باتیں بھی کرتے رہے۔ بزرگ نے اپنے لئے چائے کی تیسری پیالی بناتے ہوئے مجھ سے
پوچھا۔

"تم اور چائے پیو گے"

میں نے کہا۔

"جی نہیں شکریہ"

وہ اپنی پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے بولے۔

"بھائی مجھے سر درد کی بڑی پرانی شکائت ہے۔ شام کو یہ درد تیز ہو جاتی ہے۔ چائے کے ساتھ اسپرو کی دو ایک گولی کھالوں تو بالکل ٹھیک ہو جاتا ہوں۔ جلدی میں دکان سے اٹھ کر آ گیا ہوں۔ اسپرو کی ٹکیاں لانی یاد نہیں رہیں۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکالی۔ پھر ماچس نکالنے لگا

ئم بم ٹیبلٹ کی دو ٹکیاں باہر نکل آئیں وہ بزرگ بولے۔

"میاں یہ تو اسپرو کی ٹکیاں ہیں۔ لاؤ دو گولیاں مجھے دے دو۔"

انہوں نے میری جھولی میں پڑی ٹیبلٹ ٹائم بم کی ٹکیاں اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا
میں نے جلدی سے ٹکیاں اٹھا کر جیب میں ڈال لیں اور کہا۔

"معاف کیجئے گا۔ یہ اسپرو کی گولیاں نہیں ہیں۔ یہ تو جوڑوں کے درد کی دوا ہے"

میں تو اس خیال سے لرز گیا کہ اگر فرض کر لیا وہ بزرگ جلدی سے ایک گولی اٹھا کر
نہ میں ڈال کر نگل جاتے تو کیا ہوتا۔ جب وہ بزرگ چائے کے خالی برتن لے کر چلے گئے
یں نے کرتے کی چور جیب میں سے یعنی اس جیب میں سے جو کرتے کے پہلو میں خفیہ
ر بنا دی جاتی تھی اور جسے چور کیسہ کہتے تھے' میں نے اس میں سے اسپرو ٹیبلٹ بم
ہۃ باہر نکال لیا۔ باقی تیرہ گولیاں پلاسٹک کے فیتے میں ہی بند تھیں یہ دو گولیاں شاید
بھاگ دوڑ اور رکشے سے چھلانگ لگانے کی وجہ سے فیتے سے باہر نکل آئی تھیں۔
نے ان دونوں اسپرو بم کی گولیوں کو بھی فیتے میں ڈال کر پلاسٹک کا فیتہ اچھی طرح سے
کر جیب میں رکھ لیا۔ آگے سے میں اسپرو گولیوں یعنی اسپرو ٹیبلٹ بم کی ٹکیوں کو
ٹیبلٹ بم ہی لکھوں گا۔

یہ بزرگ بڑا پکا اور سچا مسلمان مومن تھا۔ اگر اس وقت وہ میری مدد نہ کرتا تو میرا
ں کے ہاتھوں پکڑا جانا یقینی تھا۔ میرٹھ کے کسی بازار میں اس کی گوٹے کناری کی دکان
۔ اس نے مجھے بتایا کہ تحریک پاکستان میں میرٹھ کے مسلمانوں نے بڑا بھرپور حصہ لیا
وہ کہنے لگا۔

"میرٹھ کے مسلمان بڑے دلیر مسلمان ہیں ہندو تو اب بھی ہم سے دب کر رہتا ہے۔ ٹھیک ہے حکومت ضرور ہندو کی ہے مگر ہم بھی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے ہیں۔"

اس بزرگ نے میری بڑی خدمت کی۔ اس کا مجھے اپنے گھر میں چھپا لینا بہت بے

ڈری اور دلیری کی بات تھی۔ اس بزرگ نے اپنے سارے خاندان کا مستقبل داؤ پر لگا دیا تھا۔ آج بھی وہ بزرگ مجھے یاد آتا ہے تو میں اس کی بہادری اور اخلاقی جرات پر واہ واہ کر اٹھتا ہوں۔ شام کو وہ آئے تو بولے۔

"میاں میں نے غسل خانے میں گرم پانی رکھوا دیا ہے جا کر نہا لو۔"

اس موسم میں شام کو خنکی ہو جاتی تھی۔ میں نے غسل کیا۔ رات ہو گئی۔ وہ اوپر سے کھانا لے آئے۔ ہم نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کہنے لگے۔

میں لاری اڈے اور ریلوے سٹیشن کا ایک چکر لگا کر دیکھ آیا ہوں۔ وہاں مجھے پولیس معمول سے زیادہ نظر آئی ہے۔ تمہارا اس طرف جانا واقعی مناسب نہیں ہے۔ میں تمہیں سکوٹر پر بٹھا کر شہر سے باہر جالندھر جانے والی سڑک پر چھوڑ آؤں گا"

جب انہیں معلوم ہوا کہ میں اس علاقے میں پہلی بار آیا ہوں اور ان علاقوں سے واقف نہیں ہوں تو وہ کہنے لگے۔

"دیکھو میاں۔ جالندھر شہر یہاں سے کافی دور ہے۔ وہ مشرقی پنجاب میں ہے۔ اور تم ابھی اتر پردیش میں ہو۔ یہاں سے نکلو گے تو آگے بڑا شہر مظفر نگر آئے گا۔ اس کے بعد تم سہارن پور پہنچو گے۔ سہارن پور کے بعد انبالہ آجائے گا۔ انبالے کے آگے بھارتی پنجاب شروع ہوتا ہے۔ انبالے کے بعد لدھیانہ اور پھر جالندھر آئے گا"

سفر باقی لمبا تھا۔ ان معنوں میں کہ پولیس میرا پیچھا کر رہی تھی۔ جی ٹی روڈ پر بھی سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ مگر میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ میں جی ٹی روڈ سے ہٹ کر کھیتوں میں پیدل سفر کروں۔ جو ممکن نہیں تھا۔ میں دل میں یہی طے کر لیا تھا کہ اللہ کا نام لے کر نکل پڑتا ہوں۔ آگے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ کا ٹائم ہو گا جب وہ بزرگ مجھے اپنے سکوٹر کے پیچھے بٹھا کر گلی میں سے نکلے۔ بازاروں میں کافی خاموشی تھی۔ ٹریفک بھی نہ ہونے کے برابر

تھی مگر سڑک کے کنارے بتیاں روشن تھیں۔ وہ مجھے ایسے راستوں سے لے کر گئے کہ جہاں روشنیاں زیادہ نہیں تھیں اور پولیس کا چیکنگ کا خطرہ نہیں تھا۔ ہم کھیتوں سے بھی گزرے۔ پھر جی ٹی روڈ آگئی جس پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لگے کھمبوں پر بلب روشن تھے۔ اس نے مجھے دو کھمبوں کے درمیان جہاں ذرا اندھیرا تھا اتار دیا اور کہا۔

"لو بھائی اب تمہیں خدا کے سپرد کیا۔ یہاں جو لاری جالندھر کی طرف جانے والی آئے گی اس کی پہلے چیکنگ ہو چکی ہو گی۔ پھر بھی ذرا ہوشیار ہو کر بیٹھنا۔ خدا حافظ!"

میں نے اس بزرگ کا شکریہ ادا کیا تو وہ ہاتھ ہلا کر سکوٹر سٹارٹ کر کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔ میں جی ٹی روڈ پر اکیلا کھڑا تھا۔ سڑک زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ دونوں طرف درخت تھے جن میں اندھیرا تھا۔ پیچھے میرٹھ شہر کی جانب شہر کی تھوڑی تھوڑی روشنیاں جھلملاتی نظر آ رہی تھیں۔ میں سڑک سے اتر کر ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس بزرگ نے مجھے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ کسی ٹرک وغیرہ کو ہاتھ دینے کی کوشش نہ کرنا ہو سکتا ہے وہ پولیس والوں کی گاڑی ہو۔ لاری کی نشانی انہوں نے یہ بتائی تھی کہ سواریوں والی لاری کی پیشانی پر بھی ایک بتی جل رہی ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد میرٹھ کی طرف سے ایسی ہی ایک لاری آتی دکھائی دی۔ میں نے آگے ہو کر اسے ہاتھ دیا مگر لاری نہ رکی۔ شاید رات کے وقت ڈرائیور رکنا نہیں چاہتا تھا یا شاید لاری سواریوں سے پہلے ہی بھری ہوئی تھی۔ ایک ٹرک آ کر گزر گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسری لاری آئی میں نے اسے ہاتھ دیا۔ وہ بھی نہ رکی۔ یہ لاری بھی سواریوں والی لاری تھی۔ اس کے بعد آدھا گھنٹہ میں سڑک کے کنارے درخت کے نیچے بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا مگر سواریوں والی لاری نہ آئی۔ شاید رات بارہ بجے کے بعد میرٹھ سے سواریوں والی لاری نہیں چلتی تھی۔ جب یہ خیال ذہن میں پیدا ہو گیا تو میں نے سوچا کہ میں ساری رات تو یہاں بیٹھ نہیں سکتا۔ بہتر ہے کہ کوئی ٹرک وغیرہ آئے تو اسے ہاتھ دے کر روکنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ اس شہر سے نکلنا بھی ضروری تھا۔

مزید آدھا گھنٹا گذر گیا۔ اس دوران جالندھر انبالے کی طرف سے دو تین ٹرک آئے اور میرٹھ کی طرف نکل گئے۔ میرٹھ کی طرف سے صرف ایک ٹرک گذرا جس نے میرے ہاتھ کے اشارے پر بھی ٹرک نہیں روکا۔ آخر دور سے کسی گاڑی کی روشنیاں نظر آئیں تو میں سڑک کے کنارے آکر کھڑا ہو گیا۔ روشنیاں قریب آئیں تو میں نے ہاتھ کا اشارہ دیا۔ یہ کوئی کار تھی۔ کار پہلے تو آگے نکل گئی۔ تھوڑی دور جا کر رکی اور پھر اسی طرح پیچھے کو آنے لگی اور میرے قریب آکر ٹھہر گئی۔ کار کے اندر کی بتی روشن ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک نیلی ساڑھی والی عورت بیٹھی ہے جس نے خوب میک اپ کیا ہوا تھا۔ اس نے ساتھ والی سیٹ کی طرف ہاتھ بڑھا کر کھڑکی شیشہ نیچے کیا اور مجھ سے پوچھا۔

"کہاں جانا ہے؟"

میں اس عورت کی دلیری پر بڑا حیران ہوا کہ آدھی رات کے وقت اس نے سنسان جگہ پر ایک اجنبی آدمی کے لئے گاڑی روک دی ہے اور اب پوچھ رہی ہے کہ کہاں جا ہے۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"بس مجھے اگلے شہر تک لے چلیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی؟"

اس نے دروازہ کھول دیا اور کہا۔

"اندر آجاؤ"

میں جلدی سے سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی کا دروازہ بند کر دیا گاڑی آگے چل پڑی۔ گاڑی میں کسی عطر کی بڑی مسحور کر دینے والی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ عورت نے گاڑی کا گیئر بدلتے ہوئے پوچھا۔

"اگلا شہر تو مظفر نگر ہے۔ کیا تم مظفر نگر جاؤ گے؟"

میں نے کہا

"اگر آپ کو اس سے بھی آگے جانا ہے تو مجھے آگے لے جائیں۔ میں آگے جا کر اتر جاؤں گا"

عورت ہنس پڑی۔ کہنے لگی۔

"آخر تمہیں کہاں جانا ہے۔ میں تو لدھیانے جا رہی ہوں۔ کیا تم میرے ساتھ لدھیانے چلو گے؟"

میں نے کہا

"آپ کی مہربانی ہو گی مجھے لدھیانے ہی جانا ہے۔"

عورت نے آہستہ سے کہا۔

چلو لدھیانے ہی چلے چلو۔ کہاں سے آرہے ہو اور میرٹھ شہر سے باہر اتنی دور تم کیسے کھڑے تھے؟"

میں نے یونہی کہہ دیا کہ یہاں ایک قریبی گاؤں میں اپنے ایک دوست کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ رات کو جانے کا پروگرام اس لئے بنایا کہ کل دن کے وقت لدھیانے پہنچ جاؤں

"میرا دوست ہی مجھے یہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ہاتھ دینے سے کوئی نہ کوئی لاری ضرور تمہیں بٹھا لے گی مگر دو لاریاں آکر نکل گئیں کوئی نہیں رکی"

اس عورت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں یار ہم تمہیں لدھیانے لے چلیں گے۔ اور تم سے کرایہ بھی نہیں لیں گے"

یہ کہہ کر عورت کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ وہ پنجابی میں مجھ سے بات کر رہی تھی۔ جب نے یار کا لفظ ادا کیا تو میں محتاط ہو گیا۔ عورت کی آواز مردوں ایسی بھاری آواز تھی۔ کی عمر چالیس برس کے قریب ہو گی۔ رنگ گورا تھا۔ بالوں میں خضاب لگایا ہوا تھا۔ لوں کے گرد حلقے سے بنے ہوئے تھے۔ اس نے گاڑی کے ڈیش بورڈ میں سے سگریٹ کٹ اور لائیٹر نکال کر مجھے دیا اور بولی۔

"پلیز مجھے اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر سلگا دو۔ تم سگریٹ پیتے ہو

نال؟"

میں نے کہا

"جی ہاں۔ کبھی کبھی پی لیتا ہوں"

"وری گڈ! بس ایک سگریٹ اپنے لئے بھی سلگا لو"

یہ سگریٹ بڑی اعلیٰ کوالٹی کے تھے۔ میں نے ایک سگریٹ سلگا کر اس عورت کو دیا۔ ایک سگریٹ خود سلگا لیا۔ گاڑی ایک خاص رفتار کے ساتھ جی ٹی روڈ پر انبالے کی جانب رواں دواں تھی۔ اس نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے ایک ہاتھ سے ٹیپ ریکارڈر کا بٹن دباتے ہوئے کہا۔

"گانا سنو گے؟ مجھے تو پنجابی گانے بڑے پسند ہیں"

گاڑی کی فضا کسی عورت کے پنجابی گانے سے گونجنے لگی۔ گانے وغیرہ کا مجھے بر واجبی سا شوق تھا۔ کہیں کوئی ریکارڈ لگا ہو تو سن لیتا تھا۔ انڈیا کے فلمی گانے میں کبھی نہیں سنتا تھا۔ کیونکہ انڈیا میرا دشمن ملک تھا۔ یہ پنجابی گانا جس کی ٹیپ اس عورت نے لگا تھی فلمی گانا نہیں تھا۔ عجیب سی آواز تھی گانے والی کی۔ بالکل مردانہ آواز تھی۔ عورت ساتھ ساتھ ہلکی سی آواز میں خود بھی گانے لگی۔

گاڑی نے دو تین میل کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ سڑک پر ایک جگہ پولیس کے آدمی کھڑے نظر آئے۔ وہ ہاتھوں کے اشاروں سے گاڑی کو رکنے کے لئے کہہ ر تھے۔ میں اگلی سیٹ پر بیٹھا بیٹھا ساکت سا ہو گیا۔ اتنا وقت بھی نہ چلا کہ میں گاڑی دروازہ کھول کر باہر کود کر بھاگ سکوں۔ اس عورت نے بڑی بے نیازی سے گاڑی پو کے سپاہیوں کے بالکل پاس جا کر روک دی اور کھڑکی کا شیشہ اتارتے ہوئے رعب آواز میں پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ گاڑی کیوں روکی ہے؟"

سڑک پر دو پولیس کانسٹیبل کھڑے تھے۔ اتنی دیر میں درختوں میں سے نکل کر تین پولیس کانسٹیبل آ گئے۔ ان سب کے کاندھوں پر رائفلیں لٹک رہی تھیں۔ پو

کانسٹیبل نے کہا۔

"میڈم جی ایک ملزم مفرور ہے اس کی تلاش میں ناکہ بندی کر رکھی ہے۔"

اس عورت نے غصیلی آواز کے ساتھ کہا۔

"میں تمہیں ملزم لگتی ہوں؟ جانتے ہو میں کون ہوں؟"

اس نے پرس میں سے ایک کارڈ نکال کر کانسٹیبل کو دکھایا۔

"یہ دیکھو۔ میں تمہارے انسپکٹر جنرل پولیس کی بیوی ہوں"

سارے کانسٹیبل گاڑی سے پرے ہٹ کر اٹن شن ہو گئے۔ انہوں نے بڑے زور سے سیلوٹ مارا اور بھاگ کر سڑک پر جو رکاوٹ کھڑی کر رکھی تھی اسے ہٹا دیا۔ جب ہاری گاڑی ان کے قریب سے گذری تو سپاہیوں نے ایک بار پھر سیلوٹ کیا۔ میں تو اللہ کے کرم پر حیران رہ گیا۔ کہاں مجھے یہ لگ رہا تھا کہ بس اب پولیس کے ہتھے چڑھ گیا اور کہاں یہ کہ وہی پولیس جو مجھے گرفتار کرنے کے لئے وہاں آئی تھی سلام کر کے پیچھے ہٹ ئی تھی۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں اور سگریٹ باہر پھینک ریا۔ تب میں نے اس عورت سے کہا۔

"آپ اتنے بڑے پولیس آفیسر کی پتنی ہیں اور رات کو اکیلی سفر کر رہی ہیں۔ کوئی ڈرائیور بھی آپ نے نہیں لیا۔ آپ واقعی بڑی بہادر عورت ہیں"

میں نے سوچا کہ اس عورت کی تھوڑی بہت تعریف ضرور کر دینی چاہئے اس نے سکرا کر کہا۔

"آئی جی پولیس کی بیوی ہوں اس لئے تو اکیلی بھی سفر کر لیتی ہوں۔ مجھے کون ہاتھ لگائے گا۔ ویسے بھی میں مردوں سے نہیں ڈرتی۔ آخر مرد ایک عورت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کیا برا سلوک کر سکتا ہے؟ مجھے سب کچھ پسند ہے۔"

میں سوچنے لگا کہ یہ عورت کس قسم کی ہو سکتی ہے۔ پھر میں نے اس کے بارے میں

سوچنا بند کر دیا۔ کیونکہ مجھے اس عورت سے اگر کوئی دلچسپی تھی تو صرف اتنی تھی کہ وہ مجھے میرٹھ شہر سے نکال کر لے جائے۔ اب جب کہ مجھ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہو چکا تھا کہ وہ آئی جی پولیس کی بیوی ہے تو وہ میرے لئے بہت بڑا خطرہ بھی تھی۔ میں تو ایک طرح سے اپنے آپ پولیس کے گھیرے میں آگیا تھا۔ ظاہر ہے یہ لدھیانے جا رہی ہے۔ راستے میں ہو سکتا ہے مزید پولیس کے آدمی اس کا خیر مقدم کرنے کے لئے آجائیں۔ وہ مجھے دیکھیں گے تو ضرور پوچھیں گے کہ میں کون ہوں۔ اس طرح اس بات کا پورا امکان تھا کہ میرا راز فاش ہو جائے اور میں پکڑا جاؤں۔ میں نے سوچ لیا کہ میں اس عورت کے ساتھ زیادہ دور نہیں جاؤں گا اور اگلے شہر مظفر نگر میں ہی اتر جاؤں گا۔ میں نے اس عورت سے یونہی باتیں کرنے کی غرض سے کہا۔

"لدھیانے میں تو آپ کی بہت بڑی کوٹھی ہو گی آخر آپ پولیس کے سب سے بڑے افسر کی پتنی ہیں"

اس نے سگریٹ کھڑکی سے باہر پھینکتے ہوئے کہا۔

"ہماری سرکاری کوٹھی تو انبالے میں ہے مگر میں لدھیانے اپنی ماتا جی کے پاس جا رہی ہوں"

میں سوچنے لگا کہ اگر میں اس عورت کے ساتھ بیٹھ کر لدھیانے تک بھی چلا جاؤں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ پولیس کے پاس میری تصویر تو ہے نہیں۔ انٹیلی جنس کے آدمی نے تو میری شکل ہی دیکھی تھی اور میرا حلیہ زیادہ سے زیادہ میرٹھ کی پولیس والوں تک ہی محدود ہو گا۔ یہ عورت بہت بڑے پولیس افسر کی بیوی ہے اور مجھ پر کچھ مہربان بھی لگتی ہے کم از کم اس کی باتوں سے اور میرے ساتھ جو اس کا رویہ تھا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا۔ اسی اعتبار سے میں اس کے پاس ایک طرح محفوظ بھی تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر مجھے بیٹھا دیکھ کر کوئی پولیس والا اس سے پوچھنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا کہ میں کون ہوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ لدھیانے تک اسی عورت کی گاڑی میں بیٹھ کر جانا چاہئے۔ لیکن میں اب بھی بڑا حیران تھا کہ یہ عورت رات کے وقت اکیلی گھر سے

دور جانے کے لئے کیسے نکل آئی تھی۔ میں نے اس کو مزید ٹٹولنے کی غرض سے کہہ

"میڈم! یہ راستہ بڑا ویران ہے۔ رات کو یہاں ڈاکو وغیرہ بھی آسکتے ہیں"

وہ بولی۔

"تم کیوں فکر کرتے ہو۔ میرے پاس بھرا ہوا پستول ہر وقت موجود ہوتا ہے"

اس نے ایک ہاتھ سے اپنے سامنے والا ڈیش بورڈ کھول کر مجھے اندر رکھا ہوا پستول

"اس میں بارہ گولیاں بھری ہوئی ہیں"

وہ اصل میں ریوالر تھا جس کو وہ پستول کہہ رہی تھی۔ اسلحے کی پہچان اسے مجھے زیادہ تھی۔ اس نے گانے کی ٹیپ بند کر دی تھی۔ کہنے لگی۔

"یار مجھے ایک اور سگریٹ لگا کر دو۔"

ں نے اسے دوسرا سگریٹ لگا کر دیا تو کہنے لگی۔

"تم نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ تم کون ہو؟ تمہارا نام کیا ہے۔ لدھیانے میں کہاں رہتے ہو۔ شکل صورت سے تو تم مجھے کوئی سٹوڈنٹ لگتے ہو"

ں نے کہا۔

"یس میڈم میں گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں بی اے کا سٹوڈنٹ ہوں۔ یہ رافائنل ائیر ہے"

ں کالج کا نام میں نے اس لئے دیا تھا کہ گورنمنٹ کالج ہر شہر میں ہوتا ہے۔ گاڑی کے شہر کے درمیان سے گذر گئی تھی۔ اب آگے سہارن پور شہر آنے والا تھا۔ وہ

"تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے؟"

ائیونگ میں بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ کمانڈو ٹریننگ کے دوران مجھے ہیوی وہیکل

کی ڈرائیونگ بھی سکھائی گئی تھی۔ کار تو میں لاہور میں بھی چلا لیا کرتا تھا۔ میں نے کہا۔

"ہاں جی۔ میں ڈرائیو کر لیتا ہوں"

اس نے گاڑی سڑک کے کنارے جا کر روک دی اور جمائی لے کر بولی۔

"مجھے نیند آ رہی ہے۔ آگے تم گاڑی چلاؤ"

میں سوچ میں پڑ گیا کہ اگر آگے پولیس کے کسی سپاہی نے روک لیا تو میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ میری گاڑی ہے۔ اس مسئلے کو اس عورت نے خود ہی حل کر دیا۔ اس نے پرس میں سے آئی جی پولیس کا کارڈ نکال کر مجھے دیا اور کہا۔

"اگر راستے میں کوئی پولیس والا روکے تو اسے یہ کارڈ دکھا دینا۔ وہ بھاگ جائے گا"

اب میری تسلی ہو گئی۔ میں گاڑی ڈرائیو کرنے لگا۔ میں اس بات پر بڑا حیران ہو رہا تھا کہ مشرقی پنجاب کے سب سے بڑے پولیس آفیسر کی بیوی یوں اکیلی گھر سے نکل پڑی ہے اور اس کے خاوند کو بھی پتہ نہیں ہے۔ اگر اسے معلوم ہوتا تو وہ آگے پولیس کو اطلاع کر دیتا کہ میری بیوی کی حفاظت کی جائے وہ اپنی مرضی سے یا ناراض ہو کر میرٹھ سے لدھیانے جا رہی ہے۔

یہ عورت سکھ تھی اور اس نے مجھے اپنا نام ہرپال کور ڈھلوں بتایا تھا۔ ڈھلوں اس کے آئی جی پولیس خاوند کی ذات تھی۔ اپنی شکل شبہات اور باتوں سے مجھے وہ کچھ دوسری قسم کی عورت لگتی تھی۔ مگر مجھے اس کے کردار کے کسی بھی پہلو سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح میں اس علاقے سے نکل جاؤں۔ اور پولیس کی دسترس سے باہر جاؤں۔ اس کے لئے قدرت نے مجھے ایک حیرت انگیز موقع فراہم کر دیا تھا یعنی خود پولیس میری حفاظت کر رہی تھی۔ ہرپال کور پچھلی سیٹ پر سو گئی تھی۔ کار جی ٹی روڈ پر مظفر نگر کو پیچھے چھوڑ آنے کے بعد اب سہارن پور کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سڑک ویران اور اندھیری تھی۔ کار کی ہیڈ لائٹس میں سے سڑک نظر آتی تھی۔ یہاں سڑک کے کنارے بجلی کے کھمبے بھی نہیں تھے۔ میں درمیانی رفتار سے گاڑی لے جا رہا تھا۔ اچانک

سڑک پر درخت کا بہت بڑا تنا بالکل درمیان میں پڑا نظر آ گیا۔ میں نے وہیں بریک لگا دی۔ بریک یکدم لگانے سے ہرپال کور کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے پیچھے سے نیند بھری آواز میں پوچھا۔

"کیا ہوا ہے؟ بریک کیوں لگا دی؟"

میں ابھی اس کو جواب دینے ہی والا تھا کہ اچانک دو آدمی میری کھڑکی کے سامنے آ گئے۔ انہوں نے منہ پر کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ ایک نے رائفل کا بٹ زور سے مار کر کھڑکی کا شیشہ توڑا اور رائفل کی نالی میری کنپٹی سے لگا کر کہا۔

"جو کچھ مال پانی ہے نکال دو"

ہرپال کور نے جب دیکھا کہ ڈاکو آ گئے ہیں تو گھبرانے کی بجائے اس نے بڑے رعب سے کہا۔

"میں آئی جی پولیس کرتار سنگھ ڈھلوں کی بیوی ہوں۔ سیدھی طرح جدھر سے آئے ہو ادھر چلے جاؤ نہیں تو ساری عمر جیل میں سڑتے رہو گے"

دوسرے ڈاکو کے پیچھے درخت کے پاس ایک اور ڈاکو بندوق تانے کھڑا تھا۔ اس نے آواز دے کر کہا۔

"ارے اندر عورت بھی ہے۔"

تیسرے ڈاکو نے سنا تو وہیں سے آواز دی۔

"ارے عورت کو نکال کر لے چلتے ہیں"

جس ڈاکو نے میری کنپٹی کے ساتھ رائفل کی نالی لگائی ہوئی تھی اس نے اندر ہاتھ ڈال کر کھڑکی کھول دی اور مجھے باہر نکلنے کو کہا۔ میں باہر نکل آیا انہوں نے ہرپال کور کو بھی پکڑ کر گاڑی سے نکال لیا۔ ہرپال کور ڈاکوؤں کو گالیاں دینے لگی۔ مجھے اتنا پتہ تھا کہ ہرپال کور کا ریوالور ڈیش بورڈ میں ہے۔ مگر ڈاکوؤں نے مجھے ڈیش بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھانے کی مہلت نہیں دی تھی۔ اب صورت حال کا نقشہ ایسا تھا کہ ایک ڈاکو رائفل کی نالی گردن سے لگائے میرے پاس کھڑا تھا۔ ایک ڈاکو کار کی تلاشی لے رہا تھا۔ جو ڈاکو

کار کی تلاشی لے رہا تھا اس نے ڈیش بورڈ میں سے ریوالور نکال کر کہا۔

"ارے یہ پستول بھی ہے"

ریوالور انہوں نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ اب ڈاکو ہرپال کور کو اپنے ساتھ لے جا
کے لئے اسے کھینچنے لگے۔ ہرپال کور نے چیخ کر مجھے کہا۔

"تم مرد ہو کہ کیا ہو؟"

ان ڈاکوؤں میں سے کسی کو خبر نہیں تھی کہ ان کی موت ان کے سروں پر منڈلا
لگی ہے۔ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ ان کے پاس ایک تربیت یافتہ کمانڈو کھڑا ہے۔
مجھے اس عورت کا ایک عام ڈرائیور سمجھ رہے تھے۔ چنانچہ جو دو ڈاکو ہرپال کور کو پکڑ
ایک طرف کھینچ رہے تھے انہوں نے اپنی بندوقیں یا رائفلیں کاندھوں پر ڈال ر
تھیں۔ وہاں درختوں کے نیچے اندھیرا تھا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس ابھی تک جل رہی تھ
ان کی روشنی کے عکس میں مجھے ایک ایک چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ جس ڈاکو نے رائفل
کی نالی میری گردن کے ساتھ لگائی ہوئی تھی وہ برابر میرے پاس ہی کھڑا تھا۔ شاید وہ اس
بات کا انتظار کر رہا تھا کہ اس کے ساتھی عورت کو کھینچ کر سڑک سے کچھ دور لے جائیں
تو وہ مجھے دھکا دے کر خود بھی ان کے پاس چلا جائے۔

لیکن اس دوران میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میرے لئے یہ کوئی مشکل
کام نہیں تھا۔ سکھ عورت نے مجھے طعنہ دیا تھا کہ تم مرد ہو کر تماشہ دیکھ رہے ہو، تمہیں
کیا ہو گیا ہے۔ میں اس کے طعنے سے بالکل مشتعل نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ میں اس وقت
تک اپنی حکمت عملی طے کر چکا تھا۔ بس وہ صرف ایک لمحہ ہی تھا۔ جس طرح بجلی چمک
غائب ہو جاتی ہے میں نے اپنے الٹے ہاتھ کو ایک خاص زاویے سے اپنے پہلو میں کھڑے
ڈاکو کی رائفل کی نالی پر زور سے مارا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ اس کے ساتھ
ہی میں نے ڈاکو کی ناف پر لات ماری۔ وہ ہائے کہہ کر جھکا تو میں نے اس کی گردن ا
بازو کے شکنجے میں لے کر ایک جھٹکا دیا۔ ایک تربیت یافتہ کمانڈو کا ایک جھٹکا ہی کافی
ہے۔ جھٹکا دینے سے پہلے میں نے اس کی گردن کا رخ دوسری طرف کر دیا تھا۔ ڈاکو

گردن کا منکا ٹوٹ چکا تھا۔ اندھیرے میں دوسرے ڈاکوؤں کو معلوم نہ ہو سکا کہ ان کے
ساتھی کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہ کچھ فاصلے پر بھی تھے اور وہاں اندھیرا بھی تھا۔ میں نے
رائفل اٹھا لی۔ اس کام میں زیادہ سے زیادہ تین سیکنڈ لگے ہوں گے۔ ڈاکو کی صرف ایک
ہی ہائے نکلی تھی۔ مجھے کچھ حیرت بھی ہوئی تھی کہ اس کے منہ سے ہائے کی آواز کیوں
نکلی۔ کیونکہ کمانڈو ٹریننگ کے مطابق مجھے اس کی ناف کے نیچے ایک ایسے مقام پر لات
کی ضرب لگانی چاہئے تھی کہ جہاں ضرب لگتے ہی آدمی کو اس قدر شدید تکلیف ہوتی ہے
کہ اس کے منہ سے ہائے بھی نہیں نکلتی۔ لیکن ٹریننگ کے بعد یہ میرا پہلا اصلی آپریشن
تھا۔ اس لئے تھوڑی سی غلطی ہو گئی تھی۔ درختوں میں مجھے دونوں ڈاکوں اندھیرے میں
بھی صاف نظر آ رہے تھے۔ کیونکہ اب میری آنکھیں ایک کمانڈو کی عقابی آنکھیں تھیں۔
ں ڈاکو سکھ عورت کو بازوؤں سے پکڑ کر کھینچ رہے تھے اور وہ زمین پر بیٹھی ہوئی شور
ہی تھی۔ میں نے رائفل کی نالی کا رخ ایک ڈاکو کی طرف کیا۔ اس کے سر کو ٹارگٹ
زد میں لیا اور فائر کر دیا۔ تھری ناٹ تھری کی رائفل سے فائر کا دھماکہ ہوا اور ڈاکو
ل کر پیچھے کو گر پڑا۔ میں اسی پوزیشن میں کھڑا رہا۔ رائفل کی میگزین میں دو چار جر
سے لوڈ کئے ہوئے تھے۔ میں نے پلک جھپکتے ہی سیفٹی کیچ کو آگے کیا اور دوسرے ڈاکو
سینے کو شست میں لے کر ٹریگر دبا دیا۔ دوسرے فائر کا دھماکہ ہوا اور تیسرا ڈاکو بھی وہیں
ہو گیا۔ میں نے رائفل وہیں پھینک دی اور دوڑ کر سکھ عورت کو زمین پر سے اٹھایا
ران پریشان ہو کر مجھے دیکھ رہی تھی۔

"تم نے فائر کئے تھے؟ میرا پستول تمہیں مل گیا تھا۔"

میں نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں میڈم۔ ریوالور میں نے ڈیش بورڈ سے نکال لیا تھا۔ موقع پاتے
ہی میں نے ان پر فائر کر دیا"

سکھ عورت میری تعریفیں کرنے لگی۔ جس ڈاکو کی لاش کار کے پاس پڑی تھی اور
کی گردن کا منکا میں نے توڑ دیا تھا سکھ عورت کا ریوالور اس کے پاس تھا۔ میں نے

سکھ عورت کو گاڑی میں بٹھاتے ہوئے اس کی آنکھ بچا کر ریوالر ڈاکو کی لاش کے قریب سے اٹھالیا۔ میں جلدی سے ڈرائیور سیٹ پر بیٹھا۔ گاڑی کا انجن بند تھا۔ ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ میں نے لائیٹس بجھا کر انجن سٹارٹ کیا۔ لائٹیں روشن کیں اور گاڑی کو فسٹ گیئر میں ڈال کر تیزی سے نکال کر آگے لے گیا۔ سکھ عورت کے ابھی تک حواس درست نہیں ہوئے تھے۔ وہ میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھی تھی اور پولیس کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔

"میں ساری پولیس کو ڈس مس کرادوں گی میں واہگورو کی قسم کھاتی ہوں۔ میں کسی کو نہیں چھوڑوں گی۔ اگر تم بہادری نہ دکھاتے تو بھگوان جانے میرا کیا حشر ہوتا"

اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر دبایا اور کہا۔

"کندن جی! میں تمہارا احسان نہیں بھولوں گی"

میں نے کہا۔

"میڈم یہ تو میرا فرض تھا۔"

وہ دائیں بائیں سر مار رہی تھی۔

"نہیں نہیں۔ تم بڑے جودھا ہو۔ میرا خاوند تو بڈھا کھوسٹ ہے۔ تمہاری جگہ وہ ہوتا تو کچھ بھی نہ کرتا۔ مجھے تمہارے جیسا خاوند چاہئے تھا۔ لدھیانہ آلینے دو۔ میں ساری پولیس گارڈ کو لائن حاضر کرادوں گی۔"

اور وہ مشرقی پنجاب کی پولیس کو گالیاں دینے لگی۔ پھر وہ سگریٹ سلگا کر پینے لگی۔ اس کا ریوالور میں نے ڈیش بورڈ کے اندر رکھنے کی بجائے اس کے اوپر رکھ دیا تھا۔ اس نے ریوالور اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی عین وقت پر میں نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اگر ساتھ نہ لاتی یا بھول جاتی تو بھگوان جانے میرا کیا حشر ہوتا"

اس نے ریوالور کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور حیران ہو کر بولی۔

"کندن جی! اس کا سیفٹی کیچ تو لاک ہے تم نے فائر کیسے کیا تھا؟"

میں نے کہا۔

"میں نے فائر کرنے کے بعد اسے لاک کر دیا تھا۔"

اچھا ہوا کہ اس نے ریوالور کا میگزین چیمبر کھول کر نہیں دیکھا۔ اگر دیکھتی تو اس میں پوری کی پوری بارہ گولیاں موجود تھیں۔ ایک بھی گولی فائر نہیں ہوئی تھی۔ میں خوامخواہ اسے نہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں نے ڈاکوؤں کی رائفل سے انہیں ہلاک کیا ہے اور ایک ڈاکو کی گردن توڑ کر اسے مارا ہے۔ سکھ عورت ہرپال کور نے ریوالور ڈیش بورڈ میں رکھ دیا۔ پھر میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"تمہارے لئے سگریٹ لگاؤں"

"جی نہیں شکریہ۔ میں گاڑی چلا رہا ہوں"

"تو پھر میرے سگریٹ کا ایک کش لگالو"

اور اس نے اپنی انگلیاں میرے منہ کے قریب کر دیں۔ میں نے ایک ہلکا سا کش لیا اور کہا۔

"میڈم پلیز! میں سگریٹ نہیں پینا چاہتا"

"کوئی بات نہیں کندن جی! سہارن پور کے بعد میں خود ڈرائیو کروں گی۔

اس کے بعد وہ پھر ڈاکوؤں کو اور پولیس کو گالیاں دینے لگی۔ گاڑی سہارن پور شہر میں داخل ہو گئی تھی۔ ابھی شہر کی پہلی سڑک میں آئے تھے بلکہ شہر میں داخل ہی ہوئے تھے کہ سڑک کے کنارے کی روشنیوں میں مجھے سڑک کی دونوں جانب پولیس کی چار پانچ گاڑیاں کھڑی نظر آئیں۔ پولیس کی پوری گارڈ سڑک کے دونوں جانب اٹن شن کھڑی تھی۔ میں یہی سمجھا کہ میری مخبری ہو گئی ہے اور سہارن پور کی پولیس مجھے گرفتار کرنے کے لئے پوری نفری کے ساتھ آن پہنچی ہے۔ ایک سکھ تھانیدار کی وردی میں سڑک کے درمیان کھڑا ہاتھ کا اشارہ کر رہا تھا۔ اس دوران ہماری گاڑی سکھ تھانیدار کے قریب پہنچ کر رک گئی تھی۔ سکھ عورت نے بڑی شان سے کہا۔

"یہ سب میری آؤ بھگت کے واسطے آئے ہیں۔ میرے بڈھے خاوند کو پتہ چل گیا ہو گا کہ میں گھر سے اکیلی لدھیانے جا رہی ہوں۔ میں نے نوکر کو بتا دیا تھا۔ بڈھا کھوسٹ میرے ساتھ کبھی کہیں نہیں جاتا۔ میں اکیلی جاتی ہوں تو پولیس کو خبردار کر دیتا ہے۔"

سکھ تھانیدار نے ہرپال کور کی سیٹ والی کھڑکی کے پاس آکر بڑے ادب سے سلیوٹ کیا اور پوچھا۔

"شریمتی جی آپ ہمارے آئی جی صاحب کی پتنی ہیں۔ ہم آپ کا سواگت۔۔۔۔"

ہرپال کور نے تھانیدار کو ڈانٹ کر کہا۔

"راستے میں ہم پر ڈاکو پڑا ہے۔ ڈاکو مجھے اغوا کر کے لے جانا چاہتے تھے۔ یہ میرا کزن میرے ساتھ نہ ہوتا اور پستول کے فائر کر کے انہیں ٹھکانے نہ لگاتا تو بھگوان جانے میرا کیا حشر ہوتا"

میں نے محسوس کیا کہ وہ یہ جملہ ہر بار دہراتی تھی کہ اگر ڈاکو مجھے پکڑ کر لے جاتے تو بھگوان جانے میرا کیا حشر ہوتا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس جملے سے وہ ایک خاص قسم کی لذت حاصل کر رہی ہوتی ہے۔ سکھ تھانیدار نے اسی وقت حوالدار اور سب انسپکٹر کو بلا کر حکم دیا کہ راستے میں ڈاکوؤں نے واردات کی ہے۔ فوراً سارے علاقے کو گھیرے میں لے لو۔ پھر اس نے ہرپال کور سے پوچھا۔

"یہ واردات کہاں ہوئی ہے میڈم؟"

"یہاں سے پندرہ بیس میل پیچھے"

تھانیدار نے اسی وقت پولیس کی گارد پیچھے روانہ کر دی اور ہرپال کور سے معافیاں مانگنے لگا کہ یہ ہماری غلطی ہے ہمیں معاف کر دیں۔ ڈاکوؤں کا ایک گروہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہے وہی یہ وارداتیں کر رہا ہے۔ ہم ابھی انہیں پکڑ کر آپ کے سامنے پیش کریں گے۔ ہرپال کور نے کہا۔

"اب وہاں تمہیں ان کی لاشیں ہی ملیں گیں"

تھانیدار نے ادب سے کہا۔

"میڈم! ہمیں آئی جی صاحب کا فون آگیا تھا لدھیانے آپ کی ماتا جی کے گھر تک ہماری پولیس کا سکواڈ آپ کے ساتھ جائے گا"

ہرپال کور نے کرخت لہجے میں تھانیدار کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"اب تمہاری سکواڈ کا کیا فائدہ ہو گا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ جب ڈاکوؤں نے ہمیں پکڑا تھا اس وقت تمہاری پولیس کہاں تھی؟ میں تمہاری ساری پولیس کے کان پکڑوا دوں گی۔ لدھیانے جاتے ہی ڈھلوں صاحب کو فون کرتی ہوں"

تھانیدار گھبرا گیا۔ خوشامدیں کرنے لگا۔ ہرپال نے مجھے کہا۔

"کندن جی! گاڑی چلاؤ"

میں نے انجن سٹارٹ کر دیا۔

سہارن پور سے نکلنے کے بعد ہماری گاڑی اس طرح جی ٹی روڈ پر جا رہی تھی کہ آگے بھی پولیس کی گاڑی تھی اور پیچھے بھی مسلح پولیس گارڈ کی گاڑی آ رہی تھی۔ ہرپال کور میری ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی مزے سے سگریٹ پی رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"تم تھک گئے تو میری سیٹ پر آجاؤ میں گاڑی چلاتی ہوں۔ تم بے شک پچھلی سیٹ پر لیٹ کر تھوڑی دیر آرام کر لو"

نیند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک میں ویسے ہی پولیس کی حراست میں تھا۔ گو یہ حراست مجھے گرفتار کرنے کے لئے نہیں تھی بلکہ ایک طرح سے میری حفاظت کے لئے تھی۔ دوسرے نیند اب میری غلام بن چکی تھی۔ وہ میرے حکم کی منتظر رہتی تھی۔ میں جب اسے حکم دیتا تھا وہ آتی تھی۔ یہ میری کمانڈو ٹریننگ کا کمال تھا اور میرے کمال شاہ کا بھی کمال تھا۔

میں نے کہا۔

"نہیں میڈم! مجھے بالکل نیند نہیں آرہی۔ میں بڑے مزے سے گاڑی چلا رہا ہوں۔"

ہرپال کور نے میرے ہاتھ کو دباتے ہوئے کہا۔

"کندن جی! تم مجھے میڈم نہ کہو۔ مجھے ہرپال کہو۔ مجھے اچھا لگے گا"

وہ اپنے بڈھے خاوند کی برائیاں کرنے لگی۔

"مرن جوگا شراب پی پی کر برباد ہوگیا ہے ایک تو ویسے ہی عمر میں مجھ سے تیس سال بڑا ہے۔ جانتے ہو کندن جی! میں اس کی دوسری بیوی ہوں۔ بس میرا گانا سننے آیا کرتا تھا۔ وہیں مجھ پر لٹو ہوگیا۔ اب اس میں ذرا بھی دم نہیں رہا۔ ہر وقت شراب کے نشے میں ہوتا۔ سرکار میں اس کی بہت چلتی ہے۔ وزیروں منتریوں کو اس نے دوست بنا کر رکھا ہے۔ ان کے ہر جائز ناجائز کام کر دیتا ہے۔ اس لئے ابھی تک ریٹائر نہیں ہوا----"

جب سکھ عورت نے یہ کہا کہ اس کا خاوند اس کا گانا سننے آیا کرتا تھا تو ساری میری سمجھ میں آگئی اور اس عورت کا سارا کردار میرے سامنے واضح ہوگیا۔ اب عورت میرے لئے کوئی معمہ نہیں تھی۔ وہ جو کچھ کر رہی تھی اسے ایسا ہی کرنا چاہئے اب صرف مجھے اس سے اپنے آپ کو بچانا تھا۔ کیونکہ میں اس راستے کا مسافر نہیں جس راستے پر وہ مجھے لے جانا چاہتی تھی۔ میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ لدھیانے تک عورت کے ساتھ چلوں کہ انبالہ پہنچ کر گاڑی سے اتر جاؤں اور وہاں سے کوئی ٹرین لوں۔ اگرچہ میں ایک طرح سے پولیس کے ہاتھوں محفوظ تھا پھر بھی خطرہ تھا کہ پنجاب کی پولیس کے پاس میرا حلیہ نہ پہنچ گیا ہو اور میں گرفتار نہ ہو جاؤں۔ کیونکہ اس طرح پولیس کی معیت میں زیادہ دیر تک رہنا مناسب نہیں تھا۔ کسی وقت بھی بھی میرا بھانڈا پھوٹ سکتا تھا۔

جب ہماری گاڑی انبالے پہنچی تو وہاں ہم رک گئے۔ پولیس نے ہماری زبر خاطر مدارت شروع کر دی۔ ہمیں بہترین برتنوں میں چائے پلوائی گئی۔ ساتھ اعلیٰ قس

بسکٹ بھی تھے۔ میں نے موقع دیکھ کر ہرپال کور سے کہا۔

"ہرپال جی! میرا خیال ہے میں انبالے ہی اتر جاتا ہوں"

"وہ کیوں؟"

ہرپال کور نے پریشان سا ہو کر پوچھا۔

میں نے کہا۔

"مجھے یاد آگیا ہے کہ انبالے میں مجھے اپنے ایک دوست کو ایک ضروری پیغام پہنچانا ہے۔ آپ کے ساتھ اب پولیس کی پوری گارد ہے۔ ڈر کی کوئی بات نہیں ہے"

ہم گاڑی میں ہی بیٹھے تھے۔ گاڑی میں اندھیرا سا تھا۔ ہرپال کور نے میرا ہاتھ تھام لیا اور بولی۔

"کندن جی! تمہیں میری جان کی قسم ہے۔ لدھیانے تک میرے ساتھ چلو۔ پھر بے شک وہاں سے اپنے گھر چلے جانا"

میں انکار نہ کر سکا۔ اس وقت رات کا پچھلا پہر بھی ڈھلنے لگا تھا۔ تھوڑی دیر انبالے میں رکنے کے بعد ہم لدھیانے کی طرف چل پڑے۔ لدھیانہ شہر کی آبادی میں ہماری گاڑی پولیس کی گاڑیوں کی حفاظت میں داخل ہوئی تو وہاں سے لدھیانہ پولیس کی ایک ویگن بھی پولیس کے حفاظتی سکواڈ میں آن شامل ہوئی۔ اس وقت ہرپال کور نے خود سٹیرنگ سنبھال لیا تھا اور وہ خود ڈرائیو کر رہی تھی۔ صورت حال ایسی بن گئی تھی کہ میں اسے کہہ نہ سکا کہ یہاں گاڑی روکو میں اترنا چاہتا ہوں۔ آگے پیچھے پولیس کی گاڑیاں تھیں۔ مجھے یہ خطرہ تھا کہ اگر میں کسی جگہ اتر گیا تو پولیس کا کوئی آدمی میرے پیچھے نہ لگ جائے۔ آخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس عورت کے گھر تک ہی جانا بہتر ہے۔ وہاں سے میں موقع محل دیکھ کر نکل جاؤں گا اور جالندھر جانے والی کوئی بس لاری یا ٹرین پکڑ لوں گا"

ہماری گاڑی شہر کے فیشن ایبل علاقے میں آگئی تھی۔ یہاں کشادہ باغیچوں والی پرانی ٹائپ کی کوٹھیاں تھیں جن کے برآمدوں میں بلب جل رہے تھے۔ اس وقت تک

ابھی سورج نہیں نکلا تھا مگر صبح کا نور چاروں طرف جھلکنے لگا تھا۔ ہرپال کور گاڑی ایک کوٹھی کے اندر لے گئی اور پورچ میں جا کر کھڑی کر دی۔ پھر میری طرف دیکھ کر کہا۔

"کندن جی! تم ایک بہادر نوجوان ہی نہیں ہو۔ تم نے میری جان بھی بچائی ہے۔ میں تمہیں اپنی ماتا جی سے ضرور ملاؤں گی"

پولیس کی گاڑی وہاں سے واپس چلی گئی تھیں۔ ہرپال کور نے مجھے ایک سجے ہوئے بڑے ہال کمرے میں بٹھایا اور کسی کو آواز دی۔ ایک نوکرانی دوڑتی ہوئی آنکھیں ملتی آئی اور ہرپال کور کو دیکھ کر ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور کہا۔

"ماتا جی جاگ رہی ہیں۔ سردار جی کا تین چار دفعہ فون آچکا ہے میرٹھ شہر سے"

ہرپال کور نے نوکرانی کو کوئی جواب نہ دیا۔ میری طرف دیکھا اور مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"آؤ کندن جی! میں تمہیں ماتا جی سے ملاتی ہوں"

میں خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گئی ج
بیڈ روم میں تھا۔ دیواروں پر شیشے میں جڑی ہوئی سکھوں کے گرو صاحبان کی رنگین
تصویریں لگی تھیں۔ صوفہ سیٹ کے ساتھ ڈبل بیڈ پر بوڑھی عورت شیر کی کھال جیسا ت
کمبل گھٹنوں تک لئے تکیوں کے سہارے نیم دراز تھی۔ اس کے بال سفید تھے اور چ
جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ ہرپال کور کی ماتا جی تھیں۔ صرف ایک بات اس بوڑھی خاتو
میں مجھے نمایاں اور الگ نظر آئی اور وہ یہ تھی کہ اس کے بوڑھے ہونٹوں پر پان کی لا
جمی ہوئی تھی۔ قریب ہی سنہری پاندان اور بیڈ کے پائے کے پاس اگالدان پڑا تھا۔ ہرپا
کور کو دیکھتے ہی وہ عورت غصے میں آگئی۔

"ہرپالو! تو حد سے بڑھتی جا رہی ہے۔ ڈھلوں کا میرٹھ سے کئی بار فون آچکا ہے۔ تو پاگل تو نہیں ہو گئی۔ آخر تجھے رات کے وقت اکیلی سفر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

ہرپال کور اپنی ماں کے پاس بیٹھ گئی اور بڑے پیار سے اس کا بوڑھا ہاتھ اپنے ہاتھوں لے کر بولی۔

"ماتا جی! میں اس بڈھے کی گود میں کب تک بیٹھی رہوں۔ نہ مرتا ہے نہ میری جان چھوڑتا ہے"

ماں نے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔

"یہ کون ہے؟"

ہرپال کور نے کہا۔

"ماتا جی! کندن ہے۔ لدھیانے کے کالج میں پڑھتا ہے۔ راستے میں میرا دوست بن گیا ہے۔ اس کو لفٹ دے کر لائی ہوں۔ بڑا بہادر جوان ہے"

ہرپال کور نے اپنی ماں کو راستے میں ڈاکہ پڑنے والے واقعے کے بارے میں کچھ نہ
۔اس بوڑھی عورت نے بیزاری سے کہا۔

"اچھا اچھا جاؤ اب میری جان نہ کھاؤ"

ہرپال کور مجھے اپنے کمرے میں لے آئی۔ اس کا کمرہ بڑی نفاست سے سجا ہوا تھا۔
روں پر انڈین فلم ایکٹرسوں کی بڑے سائز کی نیم عریاں تصویریں لگی تھیں۔ دھیمی سی
نی ہو رہی تھی۔ ایک ڈبل بیڈ تھا جس پر ریشمی بستر لگا تھا۔ کھڑکی پر مخمل کا بھاری پردہ
ا۔ اوپر ائیر کنڈیشنر لگا تھا۔ پلنگ کے پاس ہی صوفہ سیٹ تھا۔ ایک شیشے کی الماری میں
کے گلاس اور چینی کے نوادرات رکھے ہوئے تھے۔ پلنگ کی دونوں جانب ٹیبل لیمپ
۔ ان میں سے صرف ایک ٹیبل لیمپ جل رہا تھا۔ ہرپال کور میرے سامنے دیوار کی
منہ کر کے ساڑھی اتارنے لگی۔ میں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ مجھے اس کی ہنسی
آواز آئی۔

"کندن جی! بڑے شرماتے ہو۔ اچھا پھر ایسا کرو۔ سامنے والے غسل خانے میں جا کر نہا دھو لو۔ پھر اکٹھے چائے پئیں گے اور میں تمہیں تمہارے مکان پر چھوڑ آؤں گی۔"

میں بھی یہی چاہتا تھا۔ سامنے دیوار میں ایک دروازہ بنا ہوا تھا جو بند تھا۔ میں اسے
کھول کر اندر چلا گیا۔ سفید ٹائیلوں والا بڑا خوبصورت صاف ستھرا غسل خانہ تھا
ضرورت کی ہر شے وہاں موجود تھی۔ نہانے کے لئے ٹب بھی بنا ہوا تھا۔ میں نے اچھی
طرح سے دانت صاف کئے۔ میری تھوڑی تھوڑی شیو بڑھ آئی تھی۔ وہاں مجھے نیا سیفٹی
ریزر اور بلیڈ بھی پڑے ہوئے مل گئے۔ خدا جانے ہرپال کور نے یہ سیفٹی ریزر اور بلیڈ
کس لئے رکھے تھے۔ کیونکہ اس کا خاوند سکھ تھا اور سکھ شیو وغیرہ نہیں بناتے۔ میں نے
جلدی جلدی شیو بنائی۔ پھر ٹب میں فوارے کے نیچے بیٹھ کر نیم گرم پانی سے غسل کیا۔ میرا
جسم ہلکا پھلکا ہو گیا۔ اس کے بعد کپڑے پہن کر بالوں میں کنگھی کی۔ اور باہر نکل آیا۔

ہرپال کور بیڈ روم میں نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ ایسا موقع ہے یہاں سے فرار
جانا چاہئے۔ میں نے دروازے کو اپنی طرف کھینچا۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ میں نے پردہ
کر کھڑکی کھولنی چاہی۔ کھڑکی بھی بند تھی۔ پردہ پھر سے گرا کر میں صوفے پر بیٹھ گیا۔
ٹیبل پر ہرپال کور کے سگریٹوں کا پیکٹ پرس اور لائیٹر پڑا تھا۔ اتنے میں ہرپال کور دروازہ
کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ باریک ریشمی جارجٹ
ساڑھی میں ملبوس تھی۔ اس کے بال کھلے تھے جن میں وہ ایک ہاتھ سے کنگھی کر رہی
تھی۔ اس کے آتے ہی کمرے میں بڑے اعلیٰ کوالٹی کے پرفیوم کی خوشبو پھیل گئی۔ مجھے
دیکھ کر مسکرا کر بولی۔

"تم بڑے اچھے لگتے ہو مجھے کندن جی۔"

وہ صوفے پر میرے پاس آکر بیٹھ گئی اور کنگھی میز پر پھینک کر بالوں کا جوڑا پیچھے
بناتے ہوئے کہنے لگی۔

"میں تمہیں ابھی اپنے گھر نہیں جانے دوں گی اس کو بھی اپنا گھر ہی
سمجھو۔"

میں نے ذرا پرے ہٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں ہرپال جی! مجھے جلدی گھر پہنچنا ہے میری ماتا جی بھی میرا انتظار کر

رہی ہوں گی۔"

وہ میری طرف عجیب سی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ بولی۔

"چھوڑو یار۔ ناشتہ کر کے چلے جانا۔ میرا ڈرائیور تمہیں گھر چھوڑ آئے
گا۔ اپنی ماتا جی کو یہاں سے ٹیلی فون کر دو۔ بس۔ اور کیا چاہئے تمہیں"

میں نے کہا۔

"ہمارے گھر میں فون نہیں ہے۔"

وہ ہنس کر بولی۔

"میں پولیس افسر کی بیوی ہوں۔ تم نے میری شان دیکھ لی ہے۔ تم چلے
گئے تو میں پولیس بھیج کر تمہیں گھر سے بلوا لوں گی پھر کیا کرو گے؟"

میں نے دل میں سوچا کہ اس عورت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے مجھے لومڑی
کی عیاری سے کام لینا ہو گا۔ لومڑی میرے لئے کوئی انوکھا جانور نہیں تھا۔ کمانڈو ٹریننگ
کے دوران مجھے لومڑی بھی بنایا گیا تھا۔ مطلب یہ کہ مجھے اس کی ٹریننگ بھی دی گئی تھی
کہ اگر اس قسم کے حالات پیش آجائیں تو کس طرح لومڑی کی مکاری اور عیاری سے کام
لیا جاتا ہے۔

میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا ہرپال جی! میں ابھی گھر نہیں جاتا۔"

ہرپال کور نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ میں نے موڈ بدلنے کے لئے فوراً کہا۔

"مجھے تو سخت بھوک لگ رہی ہے"

جلدی سے الگ ہو کر اس نے زور سے آواز دی۔ نوکرانی دروازہ کھول کر اندر آئی۔
ہرپال نے کہا۔

"ناشتہ ابھی تک کیوں نہیں لگایا؟"

نوکرانی نے کہا۔

"میڈم جی لگا دیا ہے۔ میں یہی کہنے آئی تھی"

دوسرے کمرے میں جا کر ہم دونوں نے اکٹھے ناشتہ کیا۔ ناشتہ خالص ہندو سکھوں کا تھا۔ یعنی حلوہ پوڑیاں کچوریاں اور دہی وغیرہ ناشتہ کرنے کے بعد وہ مجھے واپس اپنے بیڈ روم میں لے آئی۔ یہاں بیڈ کی ایک جانب سیاہ رنگ کا ٹیلی فون بھی پڑا تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ہرپال کور ساڑھی درست کرتی ہوئی اٹھی اور ٹیلی فون اٹھا کر بولی۔

"ہیلو"

دوسری طرف سے اس کا سکھ خاوند بول رہا تھا۔ اس کا پتہ مجھے ہرپال کی گفتگو سے ہو گیا۔ وہ بڑے درشت لہجے میں اس سے بات کر رہی تھی اور اس طرح جھڑک رہی تھی جس طرح نوکروں کو جھڑکا جاتا ہے۔ صاف پتا لگ رہا تھا کہ اس کا خاوند اپنی بیوی سے بے حد ڈرتا ہے اور اسے اپنے پاس رکھنے پر مجبور ہے۔ ہرپال کور نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

"اب مجھے فون نہ کرنا۔ میں ساری رات کی جاگی ہوئی ہوں اب سونے جا رہی ہوں"

پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگی۔

"تم سمجھ گئے ہو گے۔ یہ میرے بڈھے خاوند ڈھلوں کا فون تھا۔ میرٹھ میں بیٹھا شراب پی رہا ہے۔ میں اسے شراب کے نشے میں مدہوش چھوڑ کر آئی تھی۔"

پھر اچانک اس نے مجھ سے پوچھا۔

"تم شراب پیتے ہو کندن جی؟ ضرور پیتے ہو گے۔ انڈیا میں تو سبھی پیتے ہیں"

میں نے کہا۔

"نہیں ہرپال جی! میں شراب نہیں پیا کرتا"

وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ میرے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"چلو نہ پینا۔ میں کبھی کبھی تھوڑی سی پی لیا کرتی ہوں۔ مگر شام کو پیتی

ہوں تم میرے پاس رہو گے تو میں تمہارے سامنے پیئوں گی"

اس دوران میرے دماغ میں ایک اور سکیم بالکل مکمل ہو کر تیار ہو چکی تھی۔ میں ں عورت کی خاص طور پر پولیس میں جو حیثیت تھی اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جموں ہنا چاہتا تھا۔ کیونکہ لدھیانہ سے جالندھر اور جالندھر سے جموں تک اکیلا جانے میں مجھے ستے میں کئی خطرات پیش آ سکتے تھے۔ اس کی اہم وجہ یہ تھی کہ پنجاب میں خالصتان کی یک کا بڑا زور تھا اور سیکورٹی اتنی سخت تھی کہ میرے ساتھ کچھ بھی پیش آ سکتا تھا۔ جبکہ عورت مشرقی پنجاب کے آئی جی پولیس کی بیوی تھی اور اس کا اثر و رسوخ میں دیکھ چکا ۔ میں نے اس کے اثر و رسوخ سے فائدہ اٹھانے کے لئے ایک سکیم تیار کر لی تھی۔ نچہ اس سکیم پر عمل کرتے ہوئے میں نے ہرپال کور سے کہا۔

"ہرپال جی! میرا من آپ سے الگ ہونے کو بالکل نہیں چاہتا۔ لیکن مجھے اپنی ماتا جی کا بھی خیال لگا ہوا ہے۔ انہیں میں نے میرٹھ سے چلتے ہوئے فون کر دیا تھا کہ میں لدھیانے صبح کے وقت پہنچ جاؤں گا۔ اب وہ میری راہ دیکھ رہی ہوں گی۔ میں چاہتا ہوں کہ گھر جا کر انہیں بتا دوں کہ میں آ گیا ہوں اور پھر کوئی بہانہ بنا کر وہاں سے نکل کر آپ کے پاس آ جاؤں گا۔"

ہرپال کور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو پھر میرا ڈرائیور تمہیں گاڑی میں بٹھا کر لے جائے گا۔ تم اسی گاڑی میں واپس آ جانا"

"میں یہی چاہتا تھا۔"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔"

وہ مجھے لے کر کوٹھی کی لابی میں آ گئی۔ یہاں پورچ میں اس کی گاڑی کھڑی تھی جس ڑی پوش سکھ ڈرائیور کپڑے سے صاف کر کے چمکا رہا تھا۔

ہرپال کور نے ڈرائیور سے کہا۔

"منگل سنگھ! کندن جی کو شہر لے جاؤ۔ انہیں وہاں ایک کام ہے۔ اس گاڑی میں واپس لے آنا"

منگل سنگھ ڈرائیور نے سلام کر کے کہا۔

"اچھا بی بی جی"

میں گاڑی میں بیٹھ گیا اور گاڑی کوٹھی کے پورچ سے نکل کر سڑک پر آ گئی۔ ڈرائیور نے مجھ سے پوچھا۔

"مہاراج کدھر کو جانا ہے"

میں نے اپنی سکیم پر عمل کرتے ہوئے کہا۔

"گورنمنٹ کالج کی طرف چلو"

مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ گورنمنٹ کالج لدھیانہ کہاں پر ہے۔ ڈرائیور نے اچھا جی کہا اور گاڑی کو آگے سے موڑ کر دوسری سڑک پر لے آیا۔ لدھیانہ شہر میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ یہ شہر مجھے عام شہروں کی طرح لگا۔ پرانے مکانوں والے کہیں کھلے اور کہیں گھٹے گھٹے بازار تھے۔ سڑکوں پر ہر قسم کی سواری چل رہی تھی۔ سکھ کرپانیں لٹکائے آتے جاتے نظر آرہے تھے۔ شلوار قمیض اور ساڑھی والی عورتیں بھی آجا رہی تھیں۔ گاڑی مختلف بازاروں سے گھومتی ہوئی ایک عمارت کے گیٹ کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ عمارت کے اوپر گورنمنٹ کالج لدھیانہ انگریزی اور ہندی میں لکھا ہوا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"یہاں تھوڑی دیر ٹھہرو میں کواٹروں میں اپنی ماتا جی سے بات کر کے ابھی آتا ہوں"

سکھ ڈرائیور کو میں نے اس لئے اپنی فرضی ماتا جی سے ملنے کا کہہ دیا تھا کہ وہ کسی شک شبہے میں نہ پڑے۔ لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ بھی آئی جی پولیس ڈھلوں صاحب کی اس طوائف زادی بیوی کے کردار سے بخوبی واقف تھا۔ اور ہرپال کور ایک طوائف ہونے کے ناطے اپنی مرضی کے لوگوں سے اکثر ملتی جلتی رہتی تھی۔ اس کا خاوند کسی مجبوری کی وجہ سے اپنی طوائف بیوی کے آگے بے بس تھا۔ ہرپال کور ہی نے مجھ

ھی بتایا کہ یہ کوٹھی اس کے خاوند نے اس کے اور اس کی ماتا جی کے لئے خاص طور پر
ائے پر لے کر دے رکھی ہے تاکہ اس کی ماتا طوائفوں کے بازار والے اپنے کوٹھے میں
رہے۔ کیونکہ ہرپال کور اپنی ماتا جی سے ملنے طوائفوں کے بازار میں بے دھڑک چلی جایا
تی تھی۔ ہرپال کور کے خاوند کا کوئی رشتے دار اس کو نہیں ملتا تھا۔ ڈھلوں صاحب کی
کوٹھی جالندھر میں تھی جہاں ان کا ہیڈ کوارٹر بھی تھا مگر وہ اکثر میرٹھ میں دیکھے جاتے
، جہاں بقول ہرپال کور ڈھلوں صاحب نے کسی طوائف سے دوستی کر رکھی تھی۔
ہال میں اس عورت کے سارے حالات اور بیک گراؤنڈ کو پوری طرح سمجھ گیا تھا۔
رت زبردست طبیعت کی مالک تھی اور اس کا خاوند کسی مجبوری کی وجہ سے اس کے
گے بھیگی بلی بن چکا تھا۔ انہی حالات کی روشنی میں میں نے اس عورت کے ذریعے جموں
نے کی سکیم بنائی تھی۔ کالج کھلنے کا ٹائم ہو چکا تھا۔ کالج میں ہندو سکھ لڑکے کتابیں ہاتھوں
لئے ادھر ادھر چل پھر رہے تھے۔ گراؤنڈ میں کچھ لڑکے کرکٹ بھی کھیل رہے تھے۔
کالج میں داخل ہو کر گراؤنڈ کی دوسری طرح درختوں میں جا کر تھوڑی دیر بیٹھا رہا۔ پھر
اور کالج کے گیٹ پر آکر ڈرائیور سے کہا۔

"چلو واپس چلو"

جب میں واپس آیا تو ہرپال کور بڑی بنی سنوری ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر بولی۔

ماتا جی سے کہہ آئے ہو ناں کہ تم کل گھر واپس آؤ گے؟"

میں نے کہا۔

"وہ ایسا ہوا ہے ہرپال جی کہ ماتا جی اور پتا جی جموں چلے گئے ہیں۔ وہاں میری بڑی بہن جی رہتی ہیں۔ ان کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ گھر میں صرف نوکر ہی تھا۔ ماتا جی انہیں کہہ گئی تھیں کہ کندن آئے تو اسے کہنا کہ وہ بھی کالج سے چھٹی لے کر جموں پہنچ جائے اب مجھے جموں جانا پڑے گا"

ہرپال کور میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلانے لگی اور ایک خاص انداز سے
طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"جموں جانا کونسی مشکل بات ہے۔ میرا ڈرائیور تمہیں خود جموں چھوڑ آئے گا۔ مگر تم آج کا سارا دن اور ساری رات میرے پاس رہو گے صبح صبح تمہیں میرا ڈرائیور لے جائے گا۔ جموں زیادہ دور نہیں ہے۔ دوپہر تک تم وہاں پہنچ جاؤ گے"

میری سکیم کامیاب ہو رہی تھی۔ مگر اس عورت کے ساتھ سارا دن اور ساری رات رہنا میرے لئے ایک کڑا امتحان تھا۔ ایک جوان پاکباز مرد کے لئے اس سے زیادہ سخت امتحان اور کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن میں نے اس امتحان میں سرخ رو ہونے کا فیصلہ کر لیا ہوا تھا۔

میں نے کہا۔

"اگر آپ کی خوشی اسی میں ہے تو ٹھیک ہے میں آپ کے پاس ٹھہر جاتا ہوں"

وہ سارا دن اور ساری رات میں نے اس مرد مار قسم کی طوائف زادی کے پاس کس قسم کے امتحان میں پڑ کر گذاری یہ ایک الگ کہانی ہے جس کو میں یہاں بیان نہیں کرنا چاہتا۔ بہرحال ایک کمرے میں بند رہ کر دن بھی گذر گیا۔ رات بھی گزر گئی۔ جب پچھلی رات کے چار بجے تو میں نے ہرپال کور کو جگا کر کہا۔

"ہرپال جی میرا جموں جانے کا وقت ہو گیا ہے"

ہرپال کور جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ اس معاملے میں وہ بڑی ذمے دار اور اپنے قول کی سچی عورت تھی۔ اس نے بالوں کو پیچھے باندھتے ہوئے کہا۔

"میں نے ڈرائیور کو کہہ دیا ہوا ہے۔ وہ گاڑی میں ہی سویا ہوا ہوگا۔ اسے جگا دینا۔ وہ تمہیں جموں لے جائے گا۔ مگر ذرا ٹھہرو"

وہ پلنگ پر سے اٹھ کر الماری کی طرف گئی۔ الماری میں سے اس نے مجھے انڈین کرنسی کے سو سو روپے کے پانچ نوٹ نکال کر دیئے اور کہا

"یہ اپنے پاس رکھنا۔ ان میں سے اپنی بیمار دیدی کے لئے پھل فروٹ

بھی خرید کر لے جانا۔"

میں روپے نہیں لے رہا تھا مگر ہرپال کور نے زبردستی نوٹ میری گل خان والی نائیلون کی جیکٹ کی جیب میں ڈال دیئے اور میرا ماتھا چوم کر کہنے لگی۔

"کندن جی! مجھے تم سے سچ مچ پریم ہو گیا ہے جلدی لدھیانہ واپس آجانا۔ واپس آکر سیدھا میرے پاس آنا۔"

میں جانے لگا تو اس نے مجھے روک کر کہا۔

"ذرا ٹھہرو۔"

اس نے الماری کا نچلا دراز کھول کر اس میں سے ایک چھوٹا ڈبا نکالا۔ ڈبے میں سے ریلوے کے ٹکٹ کے برابر ایک کارڈ نکال کر مجھے دیا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسا وزٹنگ کارڈ ہوتا ہے۔ مگر اس پر کسی کا نام پتہ وغیرہ بالکل نہیں لکھا تھا۔ ہرپال کور نے کارڈ مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"یہ کارڈ اپنے پاس رکھنا۔ راستے میں کوئی پولیس والا اگر پوچھے تو اسے یہ کارڈ دکھا دینا۔ اول تو میری گاڑی دیکھ کر پولیس تمہیں کہیں بھی نہیں روکے گی۔ لیکن تم جانتے ہو کہ آج کل خالصتان کی موومنٹ چل رہی ہے۔ ہو سکتا پولیس تمہیں روک کر چیکنگ وغیرہ کرے۔"

میں نے کارڈ کو غور سے دیکھا۔ اس پر انگریزی حروف میں صرف LOOT3 لکھا تھا۔ یعنی ایل زیرو زیرو ٹی تھری۔ میں نے ہرپال کور نے یونہی پوچھا کہ یہ کس کا نمبر ہے؟ وہ بولی۔

"تمہیں اس سے کیا۔ بس یہ سمجھ لو کہ یہ جادو کا نمبر ہے۔ پولیس کا بڑے سے بڑا افسر اور چھوٹے سے چھوٹا ملازم بھی اس نمبر کی اصلیت کو جانتا ہے۔ وہ اسے دیکھ کر دو قدم پیچھے ہٹ جائے گا"

اس نے میرا منہ چوما اور کہا۔

"میرے پریتم اب دیر نہ لگانا جموں سے لدھیانہ آکر سیدھے میرے پاس

آنا۔"

میں نے ہندوؤں کی طرح ہرپال کور کو پرنام کیا اور بیڈ روم سے نکل گیا۔ اکتوبر کے شروع میں چار بجے ابھی رات کا ہلکا اندھیرا چھایا ہوتا ہے۔ میں کوٹھی کے پورچ میں آیا تو وہاں گاڑی کھڑی تھی اور اندر ڈرائیور منگل سنگھ سویا ہوا تھا۔ میں نے اسے جگایا۔ ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ بے چارہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کہا۔

"سردار جی! جموں جانے کے لئے تیار ہو ناں؟"

منگل سنگھ گاڑی سے باہر نکل آیا تھا۔ اس نے مجھے سلیوٹ مار کر کہا۔

"مہاراج بالکل تیار ہیں جی۔ بیٹھو گاڑی میں"

میں جان بوجھ کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی پورچ سے نکل کر لدھیانے کی سنسان نیم اندھیری سڑکوں پر نکل آئی۔

کار جی ٹی روڈ پر جالندھر کی طرف دوڑتی چلی جا رہی تھی۔

سڑک پر رات کو چلنے والے ٹرکوں کی آمد و رفت بھی جاری تھی۔ میں کار کی پچھلی نشست پر بڑے سکون کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اب مجھے اس بات کی ذرا بھی پریشانی نہیں تھی کہ پولیس مجھے پکڑے گی۔ میرے پاس ہرپال کور کا دیا ہوا کارڈ موجود تھا جس پر خفیہ پولیس کا کوئی کوڈ نمبر درج تھا۔ یہ کارڈ آگے بھی میرے بڑے کام آسکتا تھا۔ میں نے اسے اپنی جیکٹ کی اندر والی جیب میں سنبھال کر اسپرو ٹیبلٹ بم کی گولیوں والے پلاسٹک کے لفافے کے ساتھ ہی رکھ لیا تھا۔ جیسے جیسے کار آگے بڑھ رہی تھی دن کی روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔ جالندھر کی آبادی شروع ہوئی تو دن نکل آیا تھا۔ یہاں ایک جگہ پولیس کے کچھ سپاہی کھڑے تھے۔ انہوں نے ہاتھ دے کر کار کو روک لیا۔ یہ سپاہی سکھ تھے۔ وہ ڈرائیور کے پاس آئے اور پوچھا کہ کہاں سے آرہے ہو۔ کہاں جانا ہے۔ ڈرائیور نے کہا۔

"مہاراج یہ آئی جی صاحب کے سمدھی ہیں۔ انہیں جموں لے جا رہا ہوں"

اصل میں ہرپال کور کی کار پولیس کی کی کار نہیں تھی اور اس کی نمبر پلیٹ بھی پولیس کی نہیں تھی۔ یہ اس زمانے کی بڑی قیمتی ٹیوٹا گاڑی تھی جو اس کے خاوند ڈھلوں صاحب نے خاص طور پر باہر سے منگوا کر اپنی چہیتی بیوی کو دی تھی۔ سکھ کانسٹیبل نے ڈرائیور سے کہا۔

"مہاراج آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر ہم بھی ڈیوٹی سے مجبور ہیں۔ اپنا لائسنس دکھاؤ"

ڈرائیور منگل سنگھ نے لائسنس دکھایا۔ لائسنس پر کہیں یہ نہیں لکھا تھا کہ یہ مشرقی پنجاب کے انسپکٹر جنرل پولیس کا ڈرائیور ہے۔ کانسٹیبل نے لائسنس واپس ڈرائیور کو دیتے ہوئے اپنے ساتھی کانسٹیبل کو بلا لیا اور کہا۔

"یہ کہتا ہے میں آئی جی صاحب کے سمدھی کو جموں لے جا رہا ہوں؟"

دوسرا کانسٹیبل میری کھڑکی کے پاس آگیا۔ اس نے مجھے مشتبہ نگاہوں سے دیکھا۔ پوچھا۔

"مہاراج آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

میں نے بڑے اطمینان سے ویسے ہی بیٹھے بیٹھے کہا۔

"منگل سنگھ ڈرائیور نے تمہیں بتایا نہیں کہ میں جموں جا رہا ہوں"

کانسٹیبل بولا۔

مہاراج جموں میں حالات گڑبڑ ہیں۔ ہماری ڈیوٹی لگی ہے کہ کسی گاڑی کو چیکنگ کے بغیر جموں سائیڈ کی طرف نہ جانے دیا جائے۔ آپ کو ہمارے ساتھ ذرا تھانے تک چلنا ہوگا"

میں نے جیب سے ہرپال کور کا دیا ہوا کارڈ نکال کر کانسٹیبل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر یہ کارڈ دیکھ لو۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں کون ہوں اور یہ گاڑی کس کی ہے؟"

کارڈ کو کانسٹیبل نے ہاتھ میں لے کر دیکھا تو فوراً سیدھا ہو گیا۔ اس نے اسی وقت کارڈ مجھے واپس کر دیا اور سلام کر کے بولا۔

"شما کر دینا مہاراج۔ ہم مجبور ہیں۔ ہماری ڈیوٹی ہی ایسی ہے۔"

میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"چلو بھئی آگے چلو"

خفیہ کوڈ والے کارڈ نے اپنی کرامت دکھا دی تھی۔ یہ اس کارڈ کا ٹیسٹ تھا جو میری
قع سے بڑھ کر کامیاب ثابت ہوا تھا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ یہ کام مشکل حالات میں
ے بڑے کام آسکتا تھا۔ یہ تو ایک طرح سے الہ دین کا چراغ میرے ہاتھ آگیا تھا۔ ہو
ہے اس کا کوئی توڑ بھی ہو جو کہ ضرور ہو گا لیکن ابھی تک مجھے اس کا علم نہیں تھا۔
تک تو یہی ہوا تھا کہ کارڈ کا خفیہ کوڈ نمبر پڑھتے ہی کانسٹیبل نے سلیوٹ مار دیا تھا۔ ایسا
ن ہو سکتا تھا کہ یہ کارڈ اگر میں کسی پولیس کے اعلیٰ افسر کو دکھاتا تو مجھ سے پوچھ گچھ
تا اور پوچھتا کہ یہ کارڈ میں نے کہاں سے لیا ہے اور حقیقت معلوم کرنے کے لئے وہ
ی دوسرا کوڈ ورڈ بھی مجھ سے پوچھتا۔ لیکن ابھی وہ مقام نہیں آیا تھا اور کم از کم جموں
میرا راستہ صاف تھا۔

گاڑی جالندھر سے ہوشیار پور کی طرف ہو گئی۔ ہوشیار پور پہنچ کر ہم نے ناشتہ کیا۔
ئے پی۔ میں گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ ڈرائیور ہوٹل میں سے سب کچھ میرے لئے لے
ا تھا۔ یہاں جالندھر لدھیانہ کے مقابلہ میں دن کے وقت گرمی بالکل نہیں تھی۔ آگے
ا کا پہاڑی علاقہ شروع ہونے والا تھا۔ یہ بات مجھے سکھ ڈرائیور نے بتائی تو میں نے

"ہاں سردار جی میں جانتا ہوں۔ کئی بار جموں آچکا ہوں"

حالانکہ یہ سارا علاقہ میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ ہوشیار پور سے چلے تو اونچے نیچے
ے بھرے ٹیلوں اور چھوٹی چھوٹی وادیوں کا علاقہ شروع ہو گیا۔ ہوا تازہ اور خنک ہوتی
۔ جموں کے قریب کچھ خشک پہاڑیاں آئیں۔ میدانی علاقہ بھی آیا جہاں دھوپ میں
ڑی حدت تھی۔ آگے جا کر چڑھائی شروع ہوئی تو موسم مزید خوشگوار ہو گیا۔ ہماری کار
ا شہر کی حدود میں داخل ہوئی تو یہاں سڑک پر باقاعدہ رکاوٹ کھڑی کی ہوئی تھی۔
ہاں ٹرک وغیرہ ایک طرف قطار میں کھڑے تھے اور پولیس ان کی چیکنگ کر کے انہیں
ے جانے کی اجازت دے رہی تھی۔ وہ دن کے تین بجے کا وقت ہو گا۔ میں گاڑی سے

نکل کر سڑک کے کنارے ٹہلنے لگا۔ سیکریٹ پولیس کے خفیہ کوڈ نمبر والا کارڈ میری جیب
میں تھا مجھے کسی کا ڈر خوف نہیں تھا۔ میں نے یونہی وقت کاٹنے کے لئے سگریٹ بھی سلگا
لیا۔ میں اگر چاہتا تو ڈرائیور کو اپنا سیکریٹ کارڈ دے کر آگے بھجوا سکتا تھا تاکہ پولیس ہمیں
جانے کی اجازت دے دے مگر مجھے اتنی جلدی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اپنے
ذہن میں اس آدمی کا نام پتہ اور حلیہ اور وہ کوڈ الفاظ یاد کر کے دہرا رہا تھا جس سے ملنے
کے لئے مجھے دلی والے گل خان نے ہدایت کی تھی۔ مجھے اس شخص کا نام حلیہ اور پتہ اور
اس کے آگے بولے جانے والے کوڈ الفاظ بالکل نہیں بھولے تھے۔ یہ سب کچھ میں
راستے میں بھی یاد کرتا رہا تھا۔

جب کافی دیر ہو گئی اور ٹرک گاڑیاں اپنی جگہ پر اسی طرح کھڑی رہیں تو میں کار میں
آ کر بیٹھ گیا اور میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"گاڑی کو نکال کر آگے لے چلو۔ میں پولیس سے خود بات کرتا ہوں"

بے چارا ڈرائیور بھی بیٹھے بیٹھے تنگ آ گیا تھا۔ اس نے فوراً انجن سٹارٹ کیا اور
گاڑی کو سڑک کی ایک طرف سے نکال کر وہاں لے گیا جہاں سڑک پر پولیس نے رکاوٹ
کھڑی کر رکھی تھی۔ ہماری کار کو آتے دیکھ کر دو تین پولیس کانسٹیبل ڈنڈے لے کر آگے
آ گئے اور کار کو رکنے کا اشارہ کرنے لگے۔ گاڑی رکی تو کانسٹیبل نے کہا۔

"قطار میں لے جاؤ گاڑی کو قطار میں لے جاؤ پیچھے لے جاؤ۔۔"

میں نے کھڑکی میں سے سر باہر نکال کر کانسٹیبل سے کہا۔

"اپنے کسی افسر کو بلاؤ۔ جلدی کرو۔ میرے پاس ٹائم نہیں ہے"

ہمارے پاس نئی کار دیکھ کر پولیس والے ویسے ہی ذرا ٹھٹک سے جاتے ہیں۔ جب
میں نے اسے اپنے پولیس افسر کو بلانے کے لئے کہا تو وہ جلدی سے سڑک کے کنارے
بنے ہوئے کھوکھے کے اندر چلا گیا۔ کوئی پولیس افسر اندر بیٹھا تھا۔ اس نے کوئی پروانہ
اور اپنی انا کو مجروح نہ ہونے دیا۔ دو تین منٹ لگا کر باہر نکلا اور بڑی شان بے نیازی سے
چلتا ہوا میرے قریب آ کر پوچھا۔

"کیوں جی! کیا بات ہے۔ آپ کو معلوم ہے سب لوگ قطار میں کھڑے
ہیں۔ آپ کو بھی قطار میں کھڑے ہو کر آنا چاہئے"

میں نے بڑے آرام سے جیب میں سے سیکریٹ پولیس کا کارڈ نکال کر اسے دکھایا۔
کارڈ میں نے اس کو نہ دیا بلکہ اپنے ہاتھ میں ہی رکھا۔ کارڈ کو اس نے جھک کر دیکھا اور
راً پیچھے ہٹ گیا اور بولا۔

"سوری سر! ویری سوری!"

اس نے دوڑ کر پولیس کانسٹیبل کو رکاوٹ ہٹانے کا اشارہ کیا۔ رکاوٹ ہٹ گئی اور
اری کار جموں شہر میں داخل ہو گئی۔ گاڑی جب ایک پرانے مندر کے قریب سے گذری
ڈرائیور نے مجھ سے پوچھ ہی لیا کہ سر آپ کو کس محلے میں جانا ہے۔ میں کیا بتاتا۔ یہ شہر
میں پہلی بار دیکھ رہا تھا جس خاص آدمی سے میں ملنے جا رہا تھا۔ اس کے محلے کا نام میں
نا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

تم ایسا کرو کمپنی باغ چلو۔ وہاں سے ہمارا گھر قریب ہی ہے۔ میں وہاں اتر
جاؤں گا تم واپس چلے جانا"

گل خان نے کہا تھا کہ اس خاص آدمی کا مکان کمپنی باغ کی ایک قریبی بستی میں ہے۔
ں بستی کا نام میں یہاں نہیں لکھوں گا۔ اگر نام لکھ بھی دوں کوئی فرق نہیں پڑے گا
بونکہ وہ مجاہد اب اس بستی سے چلا گیا ہوا ہے۔ پھر بھی بطور احتیاط میں بستی کا نام نہیں
ہ رہا جموں کا کمپنی باغ ایک نہر کے کنارے پرانے ریلوے سٹیشن کے قریب ہی واقع
ہے۔ اس کی ایک جانب دریائے توی گذرتا ہے۔ یہاں تقسیم ملک کے بعد دو تین نئی
بادیاں پڑ گئی ہیں جن میں سے شاستری نگر اور گاندھی نگر بڑی مشہور ہیں۔ جموں میں
سم دن کے وقت اتنا ٹھنڈا نہیں تھا۔ سائے میں خنکی ضرور تھی۔ شہر کے مکانوں کی
دٹ پہاڑی علاقوں جیسی تھی۔ سب مکانوں اور کوٹھیوں کی چھتیں ڈھلوان تھیں۔ کمپنی
غ کے راستے میں کئی مندر آئے۔ صرف ایک مسجد کے مینار دور سے دکھائی دیئے تھے۔
رائیور نے ایک باغ کے گیٹ کے پاس ایک طرف کر کے گاڑی روک دی اور کہا۔

"لیجئے مہاراج آپ کا کمپنی باغ آگیا"

میں نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

"اب تم گاڑی واپس لے جاؤ اور شریمتی جی کو میرا پرنام کہنا"

"اچھا مہاراج!"

ڈرائیور ہرپال کور کی گاڑی لے کر وہیں سے واپس مڑ گیا۔

میں کمپنی باغ کے مین گیٹ کے سامنے کھڑا تھا۔ گل خان نے جیسے جیسے مجھے بتایا تھا ویسے ویسے چلتا میں اس خاص آبادی میں آگیا جہاں ہمارا اپنا آدمی جس کا فرضی نام میں صادق رکھ لیتا ہوں رہتا تھا۔ وہ مجھے اپنی دکان پر ہی مل گیا۔ اس کی دکان کس چیز کی تھی اور کہاں تھی؟ یہ میں ظاہر نہیں کروں گا۔ آپ کو ان باتوں سے دلچسپی بھی نہیں ہونی چاہئیے۔ میں نے اس کی دکان پر جا کر اسے سلام کیا۔ اور گل خان کا ایک خفیہ نام لے کر کہا کہ مجھے اس نے بھیجا ہے۔

صادق دکان میں بیٹھا کسی چیز کی مرمت کر رہا تھا۔ اگر میں نے اس چیز کا نام لکھ دیا تو ظاہر ہو جائے گا کہ اس کی دکان میں کیا کام ہوتا تھا۔ صادق نے میری طرف صرف اس وقت دیکھا جب میں نے اسے سلام کیا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے کام میں لگ گیا۔ جب میں نے گل خان کا خفیہ نام لیا تب بھی اس نے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ میں چپ چاپ بیٹھ رہا۔ صادق نے نوکر سے کہا۔

"چائے لے آؤ"

چائے آگئی۔ صادق نے کپڑے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے چائے پیالیوں میں ڈالی۔ ساتھ بسکٹ بھی تھے۔ اب اس نے خاص کوڈ الفاظ میں ایک جملہ بولا۔ اس کے جواب میں میں نے وہی جملہ بول دیا جو گل خان نے مجھے یاد کرا دیا تھا۔ صادق نے خفیہ کوڈ کا دوسرا جملہ بولا۔ میں نے بھی کوڈ والا دوسرا جملہ بول دیا۔ تب صادق خاموش ہو گیا۔ وہ چائے پیتے ہوئے دکان کے باہر بازار میں سے آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ دکان میں ایک گاہک موجود تھا جس کو صادق کا نوکر کچھ چیزیں دکھا رہا تھا۔ جب گاہک چلا گیا تو صادق

نے کہا۔

"رامو! بھاگ کر سگریٹ لے آ"

یہ نوکر ہندو ڈوگرہ تھا۔ وہ دکان سے نکل گیا تو صادق نے چائے پیتے ہوئے میری طرف دیکھے بغیر مجھ سے پوچھا۔

"پہلے کبھی جموں کشمیر آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"بالکل نہیں۔ پہلی بار یہاں آیا ہوں"

"وہ خاموشی سے چائے پیتا رہا۔ اس کی نگاہیں بازار پر لگیں تھیں۔ پھر اس نے پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ جو بازار ہے اس کی بائیں جانب چلتے جانا۔ پہلے ایک گلی آئے گی۔ وہ گلی چھوڑ دینا اس کے بعد ایک اور گلی آئے گی جس کے باہر کمیٹی کا نلکہ لگا ہوا ہے۔ اس گلی میں داخل ہو جانا۔ وہاں تمہیں گودام نظر آئیں گے۔ آخر میں ایک گودام آئے گا۔ اس کے دروازے پر تالا لگا ہوگا۔ میں تمہیں چابی دیتا ہوں۔ تالہ کھول کر گودام میں میرا انتظار کرو۔ اندر سے دروازے کو چٹخنی لگا لینا۔ میں آکر آواز دوں گا اور پوچھوں گا پرتاپ سنگھ دفتر سے آگئے ہیں۔ پھر تم دروازہ کھول دینا"

صادق نے اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں سے مجھے تالے کی چابی نکال کر دی اور

"چلے جاؤ"

میں اٹھ کر بازار میں آگیا اور بائیں طرف چل پڑا۔ کچھ دور چلنے کے بعد ایک گلی آئی۔ میں نے وہ گلی چھوڑ دی۔ دوسری گلی آئی جس کے باہر کمیٹی کا نلکہ لگا تھا تو میں اس گلی میں داخل ہو گیا۔ گلی کی دونوں جانب گوداموں کے دروازے تھے جو بند تھے۔ یہاں کوئی مکان بظاہر نظر نہیں آرہا تھا۔ آخری گودام کا تالا کھول کر میں اندر چلا آیا اور

دروازے کو بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ اب میں نے ماحول کا جائزہ لیا۔ یہ ایک لمبا سا کمرا تھا
جس میں بہت سارا سامان پڑا تھا۔ لکڑی کے کھوکھے اور بکس بھی پڑے تھے۔ گلی والی
دیوار کے روشندان میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ ایک دھیمی روشنی والا بلب
چھت کے ساتھ لٹکا جل رہا تھا۔ کچھ ٹوٹا پھوٹا فرنیچر بھی پڑا تھا۔ میں ایک سٹول پر بیٹھ کر
صادق کا انتظار کرنے لگا۔

کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد باہر سے کسی نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی اور
پوچھا۔

"پرتاپ سنگھ دفتر سے آ گئے ہیں؟"

میں نے چٹخنی اتار کر دروازہ کھول دیا۔ صادق اندر آ گیا۔ اندر آتے ساتھ ہی اس
نے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی اور مجھے اشارے سے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ گودام کے
کونے میں بھی ایک چھوٹا سا دروزہ تھا۔ صادق نے اسے کھولا۔ اندر ایک کوٹھری تھی
اس کی کھڑکی وغیرہ نہیں تھی۔ صادق نے بٹن دبایا۔ چھت سے لگا بلب روشن ہو گیا
یہاں ایک چارپائی اور تین پرانی کرسیاں پڑی تھیں۔ صادق نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کو کہا
خود چارپائی پر بیٹھ گیا۔ پھر میری طرف غور سے دیکھنے لگا۔

"تم پنجابی مسلمان لگتے ہو۔ پاکستان کے کس شہر سے آئے ہو"

"میں نے اسے مختصر الفاظ میں اپنے آنے کا مقصد بیان کر دیا۔ وہ مسکرایا

"ماشاءاللہ!"

پھر کہنے لگا۔

"کمال شاہ صاحب نے تمہیں کتنے مہینے کمانڈو ٹریننگ دی ہے؟"

"چھ مہینے"

"اس کا مطلب ہے تم فل کمانڈو بن چکے ہو۔ ورنہ کمال شاہ زیادہ سے
زیادہ تین مہینے ٹریننگ دیتے ہیں۔"

میں نے اسے بتایا کہ مجھے گل خان نے بھی ہائی ایکسپلوزیز کی ٹریننگ دی ہے۔ صا

مجھ سے پوچھا۔

"گل خان نے تمہیں ٹیبلٹ بم دیئے ہیں؟"

میں نے جیب سے اسپرو ٹیبلٹ بم کی ٹکیاں نکال کر اس کے سامنے رکھ دیں اور وہ
ولا بھی اسے دکھایا جس پر دار چینی، الاچی، کالی مرچ وغیرہ کے نام اور مقدار لکھی تھی
لاہر کسی پکوان کا نسخہ لگتا تھا مگر یہ سارے الفاظ کوڈ ورڈ تھے اور ان کو کھولنے یعنی ڈی
ر کرنے سے ٹیبلٹ بم خود تیار کرنے کا فارمولا ظاہر ہو جاتا تھا۔ گل خان نے مجھے وہ
نہ بھی بتا دیا تھا جس کی مدد سے میں الاچی دار چینی اور کالی مرچ کے الفاظ اور حروف کو
ں کر فارمولے میں تبدیل کر سکتا تھا۔

گل خان نے اسپرو ٹیبلٹ بم کا فیتہ مجھے واپس کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ سر درد والی اسپرو کی ٹکیاں ہیں۔"

پھر اس نے ایک کشمیری حریت پرست کمانڈو کا نام لیا اور کہا۔

"تم اس کشمیری مجاہد کو جا کر رپورٹ کرو گے۔ یوں سمجھ لو کہ اس آدمی
سے ملنے کے بعد اپنی منزل پر پہنچ جاؤ گے۔"

میں نے پوچھا۔

"یہ کشمیری کمانڈو مجھے کہاں ملے گا؟"

صادق بولا۔

"جموں سے تم کشمیر جانے والی لاری میں بیٹھ کر سری نگر جاؤ گے۔ سری
نگر شہر کے درمیان میں دریائے جہلم بہتا ہے۔ اس دریا پر سات پل بنے
ہوئے ہیں۔ تم کسی ایک پر سے دریا پار کر کے شہر کی دوسری جانب پہنچ کر شمال
کی جانب جو پہاڑیاں ہیں اس طرف جاؤ گے ان پہاڑیوں کے درمیان کئی
درے بنے ہوئے ہیں"

اس کے بعد صادق نے مجھے حریت پسند کشمیری کمانڈو تک پہنچنے کے لئے جو راستہ بتایا
ہ راستہ آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ صادق نے مجھے سارا راستہ

سمجھا دیا کہ میں کن کن پہاڑیوں اور پہاڑی دروں سے گذر کر کشمیری حریت پرست کمانڈو تک پہنچ سکتا ہوں۔ اس کشمیری کمانڈو کا فرضی نام میں شیروان رکھتا ہوں۔ اب میں اس کمانڈو کو اس نام سے یاد کروں گا۔ آپ بھی یہ نام اپنے ذہن میں بٹھالیں۔ کیونکہ آگے میرے کمانڈو مشن اسی کمانڈو شیروان کی راہنمائی میں ہی ہوں گے۔

صادق کہنے لگا۔

”تم پہلے کبھی کشمیر نہیں گئے۔ اس لئے تمہیں بہت ہوشیاری کے ساتھ یہ سفر طے کرنا ہوگا۔ تمہارے پاس کوئی اسلحہ یا کمانڈو چاقو وغیرہ تو نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔

”ایسی کوئی چیز میرے پاس نہیں ہے۔ صرف یہ اسپرو ٹیبل بم ہیں۔ ان کا کوڈ ورڈ میں لکھا ہوا نسخہ ہے اور کچھ انڈین کرنسی میں روپے ہیں۔“

صادق نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ تم تربیت یافتہ کمانڈو ہو مجھے یقین ہے کہ راستے میں اگر کوئی دشواری پیش آئی تو اس سے بخوبی نمٹ لو گے“

میں نے خدا جانے کیوں صادق کو پنجاب سیکرٹ پولیس کا وہ خفیہ کارڈ نہ دکھایا جس پر خاص نمبر لکھا ہوا تھا اور جس کو دیکھ کر پولیس بھی گھبرا کر مجھے راستہ دے دیتی تھی۔ بس میں نے یہی سوچا کہ اس خفیہ کارڈ کو خفیہ ہی رکھا جائے تو بہتر ہے۔ صادق کو بتانے کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔

وہ کہنے لگا۔

”سری نگر ایک دن ایک رات کا سفر ہے۔ تمہیں پرانے ریلوے سٹیشن کے قریب جموں سری نگر لاری اڈے سے کوئی نہ کوئی بس لاری مل جائے گی۔ راستے میں کسی سے زیادہ بات نہ کرنا۔ سی آئی ڈی کے آدمی تقریباً ہر لاری میں ساتھ ہوتے ہیں۔ تمہیں زیادہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم تربیت یافتہ کمانڈو ہو۔ حالات دیکھ کر بات کرنا۔ لیکن اپنے آپ کو مسلمان ظاہر نہ کرنا۔

کوئی بہت پوچھے تو کہہ دینا کہ کشمیر کی سیر کرنے جا رہا ہوں۔ آج کل وہاں سیبوں کا موسم بھی ہے۔ کشمیر کے سیب اسی موسم میں ہوتے ہیں۔“

میں نے صادق سے پوچھا کہ مجھے جموں سے کس وقت چلنا چاہئے۔

اس نے کہا۔

”آج کی رات تم جموں میں ہی رہو گے۔ کل صبح ہونے سے پہلے اڈے پر پہنچ جانا۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ تمہیں اکیلے ہی لاری اڈے جانا ہوگا اب پہلے میں جاؤں گا۔ میرے جانے کے دس منٹ بعد تم گودام کو تالا لگا کر میری دکان پر پہنچنا۔ ہم وہیں کھانا وغیرہ کھائیں گے۔ رات تم میری دکان میں ہی بسر کرو گے۔ میں احتیاطاً تمہیں اپنے مکان پر نہیں لے جا رہا۔ یہاں دو وجہ سے سیکورٹی بڑی سخت کر دی گئی ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ سکھ خالصتان بنانے کے لئے زبردست تحریک چلا رہے ہیں۔ جموں کے سکھ اس تحریک کے حامی ہیں اور کچھ تو کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کی بھی حمایت کرتے ہیں مگر کھل کر نہیں۔ دوسری وجہ کشمیری حریت پسندوں کی تحریک آزادی کشمیر ہے جس کے شعلے سارے مقبوضہ کشمیر میں بھڑک رہے ہیں۔ جگہ جگہ خفیہ پولیس کے آدمی عجب عجیب حلیوں میں گھوم پھر رہے ہیں تمہیں ان سے بھی خبردار رہنا ہوگا۔ اب میں جاتا ہوں۔“

صادق چلا گیا۔ اس کے جانے کے دس منٹ بعد میں بھی گودام بند کر کے گلی میں سے گذر کر بازار میں آیا اور پھر اس کی دکان پر پہنچ گیا۔ اس وقت دکان پر ایک گاہک اور صادق کا ہندو ملازم بھی موجود تھا۔ صادق نے مجھے دیکھ کر کہا۔

”مہاراج آپ کے کام میں ذرا دیر لگے گی آپ گھر چلیں میں لڑکے کے ہاتھ پہنچا دوں گا“

میں نے کہا۔

”کوئی بات نہیں شاہ جی۔ میں یہیں بیٹھ کر انتظار کر لیتا ہوں۔ مجھے کوئی

خاص کام بھی نہیں ہے۔"

صادق کسی چیز کی مرمت کر رہا تھا۔ میں اس چیز کا نام نہیں لکھ رہا۔ وہ کہنے لگا۔

"آپ کی مرضی ہے۔"

میں دکان کے اندر کونے والے بنچ پر بیٹھ گیا۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ صادق نے ہند
ملازم سے کہا۔

"رامو تمہارے پتا جی بیمار ہیں تم چھٹی کیوں نہیں کر لیتے۔ جا کر پتا جی کی
سیوا کرو۔ تمہاری ماتا اکیلی ہوں گی"

رامو خوش ہو کر بولا۔

"استاد جی! میں آپ سے چھٹی مانگتے ہوئے ڈر رہا تھا"

صادق نے کہا۔

"نہیں نہیں۔ ڈرنے کی کیا بات ہے۔ جاؤ چھٹی کرو۔ میں کام سنبھال
لوں گا۔ آج کوئی زیادہ کام بھی نہیں ہے"

میں سمجھ گیا۔ صادق نے جان بوجھ کر اپنے ہندو ملازم کو دکان سے رخصت کر د
تھا۔ راموں چلا گیا۔ دوسرا گاہک بھی جب چلا گیا تو صادق کہنے لگا۔

"یہاں کسی کا کچھ پتہ نہیں ہے کہ کس کو خفیہ پولیس نے اپنے ساتھ ملا
رکھا ہے۔ خاص طور پر اپنے ہندو ملازم پر تو مجھے بالکل اعتبار نہیں ہے اب تم
ایسا کرو۔ دکان کے پیچھے جو کوٹھری ہے وہاں جا کر آرام کرو۔ ہم وہیں بیٹھ کر
کھانا کھائیں گے"

میں دکان کی پچھلی کوٹھری میں آکر چارپائی پر لیٹ گیا۔ نہ جانے کیوں مجھے ہرپال کور ک
خیال آگیا۔ اس عورت نے نادانستہ طور پر میری بڑی مدد کی تھی۔ اس کی وجہ سے میں بے
فکر ہو کر جموں پہنچ گیا تھا۔ پھر اسی کی وجہ سے میرے ہاتھ انڈین سیکورٹی پولیس کا وہ خفیہ
کارڈ آگیا تھا جس پر لکھا ہوا پراسرار نمبر میرے بڑے کام آیا تھا اور آگے چل کر بھی کا
آنے والا تھا۔ جب صادق کا گھریلو ملازم اس کا کھانا لے کر آیا تو صادق نے دکان کا درواز

کر دیا اور کھانا لے کر کوٹھری میں آگیا۔ کوٹھری میں گرمی بالکل نہیں تھی۔ یہ پہاڑی
وں میں ستمبر کا موسم تھا۔ جموں اگرچہ کوہ مری اور کشمیر کی طرح کا پہاڑی علاقہ نہیں
پھر بھی وہاں پنجاب کے میدانوں والی گرمی بالکل نہیں تھی۔ ہم دونوں نے کھانا کھایا۔
کے بعد میں وہیں سو گیا۔ رات تک سویا رہا۔ صادق نے کوئی آٹھ بجے رات دکان بند
تو مجھے کوٹھری میں سلا کر گیا۔ کوٹھری کے پیچھے ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جہاں ایک تنگ
ن تھا۔ اسی صحن میں غسل خانہ موجود تھا۔ صادق جاتے ہوئے کہہ گیا کہ میں صبح صبح
اؤں گا۔

میں بڑے مزے سے ساری رات آرام سے سویا رہا۔ صبح صبح صادق آگیا۔ اس وقت
پھٹ رہی تھی۔ صادق کہنے لگا۔

"اب تم یہاں سے نکل کر سیدھے لاری اڈے پہنچو۔ کوئی رکشہ تانگہ
لے لینا۔ اسے کہنا پرانے جموں ریلوے سٹیشن کے سامنے جو لاری اڈہ ہے وہاں
لے چلے وہاں سے سری نگر کو لاریاں جاتی ہیں۔ باقی میں نے کشمیری کمانڈو کی
بابت تمہیں جو کچھ سمجھا دیا ہے اسے یاد رکھنا اور اسی کو جا کر رپورٹ کرنا۔ میں
نے تمہیں جو خاص شعر یاد کرایا ہے یہ شعر صرف کشمیری کمانڈو کو الگ جا کر سنا
دینا اور کہنا کہ مجھے اس شعر کے شاعر نے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ وہ سمجھ
جائے گا کہ تم کون ہو اور کس غرض کے لئے اس کے پاس آئے ہو۔ باقی باتیں
تم اس سے زبانی کر لینا۔ اب خاموشی سے دکان میں سے نکل جاؤ"

میں منہ ہاتھ دھو کر پہلے ہی سے تیار بیٹھا تھا۔ صادق سے مصافحہ کیا اور دکان سے
کر بازار میں ایک طرف چلنے لگا۔ ابھی جموں شہر میں دن کی روشنی پوری طرح نہیں
تھی۔ دور سے کسی مندر کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ایک سائیکل رکشا
مل گیا۔ میں اس میں بیٹھ کر جموں سری نگر لاری اڈے پر آگیا۔ یہاں ایک لاری
ی دیر پہلے سری نگر کے لئے روانہ ہوئی تھی۔ دوسری لاری کے لئے ٹکٹ کھل گئے
۔ لاری اڈے کی اونچی چھت کے نیچے ادھر ادھر کچھ لوگ بیٹھے ناریل کا حقہ پی رہے

تھے۔ کچھ سواریاں سو رہی تھیں۔ میں نے سری نگر کا ٹکٹ خریدا اور ایک طرف خالی بنچ
پر بیٹھ گیا۔ یہاں جموں آنے کے بعد پہلی دفعہ میں نے دو فوجیوں کو دیکھا۔ وہ وردی میں
تھے۔ وہ ٹکٹ والی کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے میرے قریب سے گذرے تو بلب کی
روشنی میں میں نے ان کے کاندھے پر جموں کشمیر رائفلز لکھا ہوا پڑھا۔ یہ دونوں ڈوگر
فوج کے جوان تھے۔ انہوں نے فوجی تھیلے اٹھائے ہوئے تھے اور ان کی رائفلیں سلنگوں
کے ساتھ کاندھوں پر لٹک رہی تھی۔ ان کی وردیاں گرم تھیں۔ ظاہر ہے وہ کشمیر کے محا
پر جا رہے تھے جہاں یقیناً سردی پڑ رہی تھی۔ میں نے سگریٹ لگا لیا تھا اور خاموش بیٹھ
مزے سے سگریٹ پی رہا تھا اور ماحول کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ اتنے میں ایک خالی لار
آکر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ کنڈیکٹر نے بلند آواز میں کہا۔

"سری نگر جانے والی سواریاں آجائیں"

میں جلدی سے اٹھا اور لاری میں پچھلے دروازے کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا
اس سیٹ کا انتخاب میں نے اس لئے کیا تھا کہ اگر حالات کہیں نازک صورت اختیار
جائیں تو میں لاری سے کود سکوں۔ دیکھتے دیکھتے لاری بھر گئی۔ جموں کشمیر رائفلز کے دونو
ڈوگرہ فوجی بھی اسی لاری میں آکر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد لاری اپنی منزل کی طرف روا
ہو گئی۔ جموں شہر سے باہر نکلے تو سپیدہ صبح چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ راستے میں ا
بہت بڑے محل کی عمارت آئی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ جموں کے سابق راجہ کا
تھا۔ ایک جانب پہاڑی ڈھلان پر مکانات بنے ہوئے تھے جہاں ایک مندر کا کلس چمک
تھا۔ لاری جموں سری نگر روڈ پر دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ لاری مسافروں سے بھر چکی تھ
اس لئے راستے میں کوئی سواری ہاتھ دیتی تو ڈرائیور گاڑی نہیں روکتا تھا۔

راستے میں سڑک کے کنارے جموں کی دیہاتی عورتیں سروں پر ٹوکرے یا
لکڑیوں کے گٹھے یا دودھ کے برتن رکھے شہر کی طرف جاتی نظر آئیں۔ ان عورتوں کا لب
ہندو عورتوں والا تھا۔ دور اوپر اونچی پہاڑی پر کسی مندر کا کلس طلوع ہوتے سورج
سنہری کرنوں میں چمکتا نظر آیا تو لاری میں بیٹھے ہوئے ہندوؤں نے بلند آواز میں نعرہ لگایا

"جے شیراں والی ماتا کی جے"

معلوم ہوا کہ یہ جموں کا مشہور مندر شیراں والی ماتا کا مندر تھا۔ اب ہم جس علاقے
ے گذر رہے تھے وہ پہاڑی علاقہ تھا۔ کہیں چڑھائی آجاتی۔ کہیں ڈھلان شروع ہو جاتی۔
ڑیوں پر جنگلی جھاڑیاں اور کافی درخت اگے ہوئے تھے۔ دھوپ نکل آئی تھی۔ کبھی
ی ان پہاڑیوں کی طرف سے گرم ہوا کا جھونکا اور کبھی سرد ہوا کا جھونکا آجاتا تھا۔ آگے
ے پہاڑی قصبہ آیا جس کے آگے پہاڑی سرنگ میں لاری داخل ہو گئی۔ سرنگ کی
سری جانب خشک اور چٹانوں جیسی پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا سڑک اب اونچائی پر
ئی تھی۔ نیچے دور دریائے توی سانپ کی طرح بل کھاتا نظر آ رہا تھا۔ لاری چٹانوں کے
میان بنی ہوئی سڑک پر جا رہی تھی۔ یہ سلسلہ ختم ہوا تو پہاڑی جنگل کی سڑک پر چلتی
ں پھر اودھم پور آگیا۔ یہ آرمی ہیڈ کوارٹر ہے اور جموں کشمیر کا سب سے بڑا ہوائی اڈہ
، فوجی چھاؤنی یہیں پر ہے۔ دونوں ڈوگرہ فوجی یہاں اتر گئے۔ اودھم پور کے آگے پھر
رائی علاقہ آگیا۔ یہاں جگہ جگہ کیکر کے درختوں کے جھنڈ نظر آ رہے تھے میں ان
ختوں کو دور ہی سے پہچان سکتا تھا۔ اس کے آگے صنوبر اور دیودار کے درختوں کے
نڈ گذرنے لگے۔ سڑک کے کنارے کنارے دونوں جانب کہیں کہیں مکئی کے کھیت
ہاتے تھے۔ یہاں پہلی بار ہوا میں پہاڑوں والی ٹھنڈک محسوس ہوئی۔

آخر ایک سو پانچ کلو میٹر کا سفر طے کرنے کے بعد ہماری لاری کد پہنچ کر رک گئی۔ کد
ے صحت افزا مقام ہے۔ یہاں چشمہ بہہ رہا تھا۔ سب مسافر لاری سے اتر گئے۔ میں نے
ا اتر کر چشمے کے پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ چشمے کے پانی کے دو تین گھونٹ پیئے۔ قریب
کھانے پینے اور چائے کی دکانیں تھیں جنہیں شمالی بھارت میں ڈھابے کہا جاتا ہے۔ یہاں
انے لدھیانہ جموں سے نکلنے کے بعد پہلی بار دکانوں پر اردو میں لکھے ہوئے دو چار بورڈ
دیکھے۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت کے آبادی والے علاقے شروع
گئے ہیں۔ لاری کد سے روانہ ہوئی تو رام بن جا کر رکی۔ رام بن دریائے چناب کے
نارے آباد ہے۔ ہر طرف دھوتیوں والے ہندو نظر آ رہے تھے۔ کہیں کہیں مسلمان بھی

لمبے فرن پہنے نظر آجاتے تھے۔ مگر رام بن میں ہندو زیادہ آباد تھے۔ لاری یہاں سے پھر آگے روانہ ہوگئی۔ اس دوران کسی مسافر کے ساتھ میری زیادہ بول چال اس لئے نہ ہو سکی کہ اکثر مسافر اترتے چڑھتے رہے۔ لاری میں ابھی تک میرے لئے کوئی تشویش کی بات پیدا نہیں ہوئی تھی۔ راستے میں ایک جگہ دو تین پولیس کے سپاہی بھی لاری میں سوار ہوئے مگر کسی نے میری طرف توجہ نہ کی۔ وہ آگے جاکر اتر گئے۔

پٹنی ٹاپ ایک مقام آیا۔ یہاں پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر دیودار کے بے شمار درخت تھے۔ یہاں معلوم ہوا کہ کشمیر کا علاقہ شروع ہو رہا ہے۔ یہاں خنکی بڑھ گئی تھی۔ چنانچہ میں نے اپنی نائیلون کی جیکٹ کے بٹن بند کر لئے۔ یہاں میں نے دھابے میں بیٹھ کر کھا کھایا۔ آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ یہ بادل دیودار کے درختوں میں سے ہو کر گزرتے تھے۔ یہاں پینے کا پانی بڑا ٹھنڈا تھا۔ اس کے بعد بنوت کا شہر آیا۔ یہ جگہ بھی کافی ٹھنڈک والی تھی۔ لگتا تھا کہ مری میں آگیا ہوں۔ یہاں دکانوں اور مکانوں پر اردو میں لکھے ہوئے بورڈ زیادہ تھے۔ یہاں سے مسلمانوں کی اکثریت شروع ہوگئی تھی۔

کشمیر کی وادی تک ابھی لاری نے آدھا سفر طے کیا تھا۔ رات کے نو بجے کے قریب لاری بانہال پہنچ کر ٹھہر گئی۔ ڈرائیور نے اعلان کیا کہ رات بانہال میں ٹھہریں گے۔ لاری صبح سری نگر روانہ ہوگی۔ یہاں ہلکی ہلکی بارش شروع ہوگئی۔ لاری کے اڈے میں ایک لمبا ہال کمرہ تھا یہاں مسافروں نے اپنے بستر لگا لئے۔ میرے پاس کوئی بستر نہیں تھا۔ مجھے بستر کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں کونے والے ایک بنچ پر سمٹ سمٹا کر پڑ گیا۔ دال خشکہ میں نے تھوڑا بہت کھا لیا تھا۔ سردی ضرور محسوس ہو رہی تھی مگر میرا جسم کمانڈو ٹریننگ نے سردی گرمی برداشت کرنے کا عادی بنا دیا تھا۔ میں نے وہیں رات گذار دی۔ دوسرے دن صبح چھ بجے لاری سری نگر کے لئے چلی۔ بانہال کی بڑی لمبی سرنگ بھی آکر گذر گئی پھر قاضی کنڈ کا قصبہ ایا۔ یہاں کشمیر کا کلچر صاف طور پر نظر آنے لگا تھا۔ جگہ جگہ مسجدیں تھیں۔ کشمیری خواتین سر پر دوپٹہ باندھے پھرن پہنے بازار میں آجا رہی تھیں۔ کشمیری جوان اور بوڑھے لمبے لمبے فرغل پہنے ہوئے تھے۔ پام پور کے آس پاس زعفران کے

بت بھی دیکھے۔ اب ہم کشمیر کی وادی میں داخل ہو چکے تھے۔

سری نگر کوئی پچاس ساٹھ میل دور رہ گیا تھا کہ ایک جگہ سڑک پر ڈوگرہ فوجی کھڑے ے۔ انہوں نے لاری رکوا لی۔ میں ہوشیار بیٹھ گیا۔ اور فوجی لاری کے پاس آئے۔ انہوں نے سارے مسافروں کو بڑے غور سے دیکھا۔ پھر لاری کو چیک کیا۔ لاری کے اوپر چھت چڑھ کر سامان کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور لاری کو آگے جانے کی اجازت دے دی۔ گھنٹے گھنٹے کے سفر کے بعد ڈوگرہ چھاؤنی کے گیٹ کے آگے لاری رک گئی۔ یہاں بھی ڈوگرہ ج کے سپاہیوں نے جن میں ایک سکھ بھی تھا لاری کی چیکنگ کی۔ جب ان کی تسلی ہو ی تو انہوں نے لاری کو آگے جانے کی اجازت دے دی۔ تھوڑی دیر بعد لاری سری نگر میں داخل ہوگئی۔ میں نے کشمیری مجاہدین کا یہ شہر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اخباروں ں اس شہر کے بازاروں مسجدوں اور نشاط باغ کی تصویریں ہی دیکھی تھیں۔ موسم یہاں ردیوں کا تھا۔ ہوا ٹھنڈی تھی۔ آسمان پر بادل نہیں تھے۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ لاری ے میں جاکر کھڑی ہوگئی۔ میں اڈے سے نکل کر سیدھا دریائے جہلم کی طرف چل پڑا میں نے راستے میں دیکھ لیا تھا۔ ہماری لاری اس کے ایک پل پر سے گذری تھی۔

میں نے کسی سے نہ پوچھا اور خود ہی اندازے سے دریا کے ایک پل پر پہنچ کر اسے ر کیا۔ دوسری جانب بازار تھے۔ بازاروں میں پولیس اور ڈوگرہ فوج کے سپاہی پھر رہے ے۔ کشمیری جوانوں کے چہروں کے ناقابل شکست عزم کی چمک تھی۔ یہاں سارا ماحول لامی تھا۔ مسجدیں جگہ جگہ تھیں۔ خانقاہیں تھیں۔ دکانوں پر کہیں کوئی ہندی کا بورڈ نظر ں آتا تھا۔ سب بورڈ اردو اور انگریزی زبانوں میں لکھے ہوئے تھے۔ مجھے ایسے محسوس ا جیسے میں پاکستان میں آگیا ہوں۔ میں ایک ریستوان میں آکر بیٹھ گیا۔ پاکستان سے نکلنے بعد پہلی بار میں نے پاکستانی کھانا یعنی پلاؤ روغن جوش کے ساتھ کھایا۔ ہو کوئی کشمیری ان میں بات کر رہا تھا۔ اردو زبان بھی عام بولی جاتی تھی۔ ریستوران میں قائد اعظم کی ویر لگی ہوئی دیکھ کر سر فخر سے بلند ہوگیا۔ کئی دکانوں کے اوپر پاکستانی پرچم بھی لہرا رہے ے۔

یہاں سے مجھے اپنے کشمیری مجاہد کمانڈو کی تلاش میں شمال کی جانب جو پہاڑیاں تھیں اس طرف جانا تھا۔ میں اندازہ لگا کر شہر کی شمال کی طرف بازاروں میں چلتا گیا۔ کافی دیر تک چلنے کے بعد میں شہر سے باہر آگیا۔ سڑک کے دونوں جانب چنار اور سفیدے کے اونچے اونچے درخت کھڑے تھے۔ ہرے بھرے کھیت تھے۔ سیب کے درخت بھی دیکھے۔ کشمیری کسان مرد عورتیں کھیتوں میں کام کر رہی تھیں۔ کشمیری کسانوں کی حالت انتہائی فلاکت زدہ تھی۔ ہندو حکمرانوں نے کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کر کے یہاں کے حقیقی کشمیری مسلمانوں کی معاشی زندگی کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ کشمیر کی ساری دولت ہندو غاصب سمیٹ رہا تھا اور کشمیری مسلمان جو کشمیر کے مالک تھے غریبانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ میں نے دور شمال کی جانب پہاڑوں پر نگاہ ڈالی۔ جموں والے ہمارے آدمی یعنی دکاندار صادق نے یہاں مجھے پہاڑیوں کی ایک خاص نشانی بتائی تھی۔ میں نے اس نشانی کو دو پہاڑوں کے درمیان ایک جگہ دیکھا تو اسی طرف روانہ ہو گیا۔ میں اس شعر کو دل ہی دل میں بار بار دہرا رہا تھا جو مجھے کشمیری کمانڈو شیروان کے آگے جا کر سنانا تھا اور جو اس بات کا خفیہ اشارہ تھا کہ میں کمال شاہ کا تربیت یافتہ کمانڈو ہوں اور جہاد کشمیر میں شریک ہونے آیا ہوں۔ مجھے کشمیری کمانڈو شیروان کو یہ خاص شعر سنانے کے بعد جو اردو کا شعر تھا یہ بھی کہنا تھا کہ مجھے اس شعر کے شاعر نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔

آسمان پر بادل برابر چھائے ہوئے تھے۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ میں کھیتوں کے درمیان سے ہو کر گذر رہا تھا۔ کسی کھیت میں ہل چلا ہوا تھا۔ کسی کھیت میں فصل لہرا رہی تھی۔ چلنے سے مجھے سردی نہیں لگتی تھی۔ جسم گرم ہو گیا تھا۔ پہاڑ ابھی دور تھے۔ کوئی دو ڈھائی گھنٹے چلنے کے بعد میں پہاڑوں کی ترائی میں یعنی ان کے دامن میں پہنچ گیا۔ راستے میں ایک دو لکڑی کے چھوٹے چھوٹے بوسیدہ مکانوں والے گاؤں بھی آئے۔ یہاں کشمیری عورتیں کہیں دھان کوٹ رہی تھیں۔ کہیں لکڑیاں کاٹ رہی تھیں۔ پہاڑی علاقہ شروع ہوا تو جنگلی جھاڑیاں بھی شروع ہو گئیں۔ آخر میں پہاڑ کے دامن میں اس جگہ پر آگیا جہاں دو پہاڑیوں کے درمیان ایک تنگ راستہ دوسری طرف جاتا تھا۔ یہاں وہ درہ تھا جس

ارے میں جموں والے صادق نے مجھے بتایا تھا۔ دو پہاڑوں کے درمیان اس تنگ سے
ے میں جنگلی جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ میرے لئے ان میں سے گذرنا کوئی مشکل
تھا۔ اگرچہ میرے پاس کمانڈو چاقو تو نہیں تھا۔ مگر ایک تربیت یافتہ کمانڈو کے فولادی
ان جھاڑیوں کو توڑنے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ میں ہاتھوں سے جھاڑیوں کو توڑتا ہوا
ادھر ہٹاتا راستہ بناتا درے میں سے گذر گیا۔

آگے ایک کھلی جگہ تھی جہاں چھوٹے چھوٹے درخت اور گھاس تھی۔ کچھ فاصلے پر
اڑیاں تھیں جن کی ڈھلانوں پر چڑھ کے درخت اوپر تک اگے ہوئے تھے۔ ان کی
ں پر بادل ہی بادل تھے۔ جیسے جیسے دن ڈھل رہا تھا سردی بڑھ رہی تھی۔ مجھے ان
وں کے درمیان سے گذر کر آگے جانا تھا۔ وہی منزل تھی۔ میں چلتا چلتا ان پہاڑیوں
پاس آگیا۔ یہاں بھی پہاڑیوں کے درمیان تنگ راستہ بنا ہوا تھا۔ یہ ایک گلی سی تھی
میں اونچی اونچی گھاس اگی ہوئی تھی۔ یہاں سے گذرتے ہوئے مجھے آدھا گھنٹہ لگ
میں درے سے باہر نکلا تو سامنے دیوار اور چنار کے درختوں کا ایک گھنا پہاڑی جنگل
اں بے حد نشیب و فراز تھے۔ کہیں زمین ایک دم نشیب میں اتر جاتی۔ کہیں اچانک
ئی شروع ہو جاتی۔ یہ قدرتی جنگل تھا۔ کہیں کوئی پگڈنڈی تک نہیں تھی۔ لگتا تھا کہ
سے انسانوں کا گذر نہیں ہوتا۔ آس پاس کوئی انسانی آبادی بھی نہیں تھی۔ میں ایک
پر پہنچ کر رک گیا۔ چشمے کا پانی ایک ٹیلے کی جھاڑیوں میں سے نیچے چھوٹے سے
میں گر رہا تھا۔ میں نے یہاں منہ ہاتھ دھویا۔ پانی پی کر پیاس بجھائی پانی واقعی کشمیر
شموں کا آب حیات تھا۔

اتنی دیر میں سورج مغربی پہاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا تھا جس کی وجہ سے میری طرف
ا ڈھلانوں پر ایک دم گہری چھاؤں اور اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ
را ہونے سے پہلے پہلے مجھے کشمیری مجاہد کمانڈو شیروان کے ٹھکانے تک پہنچ جانا چاہئے
ہ جموں والے صادق نے مجھے یہاں جو خاص نشانی بتائی تھی وہ مجھے رات کے
رے میں نظر نہیں آسکتی تھی۔ یہ ایک خاص نشانی تھی۔ میں اٹھ کر ایک طرف چل

پڑا۔ چند قدم چلنے کے بعد پہاڑی شگاف نظر آئے۔ یہاں ایک جانب کھڑے ہو کر میں نے صادق بھائی کی ہدایت کے مطابق بالکل سیدھ میں دیکھا۔ ایک جگہ میں نے دو درختوں کی خاص نشانی دیکھ لی۔ یہ درخت انگریزی کا ایک خاص لفظ بنائے ہوئے ایک جانب جھکے ہوئے تھے۔ مجھے ان درختوں کے پاس پہنچنا تھا۔ میں آگے چل پڑا۔ جب ان درختوں کے قریب پہنچا تو اچانک میری دونوں جانب سے تین آدمی نکل کر میرے سامنے آگئے۔ انہوں نے سیاہ رومال منہ اور سر پر اس طرح باندھ رکھے تھے کہ مجھے صرف ان کی چمکتی ہوئی آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں سٹین گن تھی۔ وہ نیم کمانڈو کے لباس میں تھے۔ دو جوانوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ تیسرے نے اردو زبان میں مجھ سے پوچھا۔

"کون ہو تم؟ یہاں کیسے آگئے ہو؟"

اس سے پہلے کہ میں انہیں کوئی جواب دوں انہوں نے میرے ہاتھ پیچھے باندھ کر مجھے سر سے دباتے ہوئے نیچے بٹھا دیا اور کشمیری زبان میں ایک دوسرے سے کوئی بات کی۔ ان میں سے ایک نے سٹین گن کا رخ میری طرف کر دیا۔ میں نے کہا۔

"بھائی میں مسلمانوں ہوں۔ مجھے اپنے لیڈر کے پاس لے چلو۔ مجھے کمال شاہ صاحب نے بھیجا ہے"

کمال شاہ کا نام سن کر وہ ٹھٹھک سے گئے۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا فوراً ایک مجاہد نے میری آنکھوں پر کالی پٹی باندھی اور مجھے بازو سے پکڑ ایک طرف لے جانے لگا۔ کئی اونچی نیچی جگہوں سے گذر کر مجھے ایسے لگا کہ میں جھاڑیوں کے درمیان آگیا ہوں۔ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر ایک بار پھر مجھے نیچے بٹھا دیا گیا۔ انہوں نے آپس میں کشمیری میں کوئی بات چیت کی۔ ایک مجاہد نے مجھ سے اردو میں پوچھا۔

"تم کہاں کے رہنے والے ہو؟"

میں نے کہا۔

"پاکستان سے جہاد کشمیر میں شامل ہونے کا جذبہ لے کر آیا ہوں۔"

وہ میری تلاشی لینے لگے۔ میری جیب سے اسپرو ٹیبلٹ بم والا پلاسٹک کا لفافہ اور ہربرٹ ایجنسی کا کارڈ نکلا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"یہ کارڈ پر کس کا نمبر لکھا ہے؟"

میں نے کہا۔

"بھائی یہ کارڈ کمانڈ مجاہد کمال شاہ صاحب نے مجھے دیا ہے کہ اسے کشمیری کمانڈو لیڈر شیروان کو پہنچا دوں۔ اور باقی سر درد کی گولیاں ہیں"

یہاں تو میں نے کشمیری کمانڈو لیڈر کا نام شیروان ہی لکھا ہے۔ ان کے آگے میں نے اس کا اصل نام لیا تھا۔

یہاں مجھ سے ایک بڑی زبردست بھول ہو گئی تھی۔ مجھے ایک کمانڈو کی حیثیت سے ایسا کرنا نہیں چاہئے تھا۔ میں نے ان لوگوں کی شناخت معلوم کئے بغیر بتا دیا تھا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں اور کمال شاہ نے مجھے بھیجا ہے۔ وہ لوگ انڈین فوج کے کمانڈو بھی ہو سکتے تھے جو اس علاقے میں کشمیری حریت پسندوں کی تلاش میں چھپ کر نگرانی کر رہے ہوں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ کشمیری مجاہد کمانڈو شیروان کے آدمی ہی تھے۔ وہ مجھے وہاں سے اٹھا کر ایک اور جگہ لے گئے۔ یہاں انہوں نے میری آنکھوں کی پٹی کھول دی۔ میں ایک سرنگ کے دہانے کے اندر بیٹھا تھا جہاں دیوار پر لالٹین جل رہی تھی۔ ایک آدمی سٹین گن لئے میرے سامنے بیٹھا رہا۔ باقی کسی طرف چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد دونوں مجاہد واپس آئے اور مجھے ساتھ لے کر ایک اور غار میں آگئے۔ یہاں کشمیری مجاہد کمانڈو شیروان سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ اس نے اپنا چہرہ سیاہ رومال میں چھپا رکھا تھا۔ وہ چوڑے قد کاٹھ کا ایک جوان آدمی تھا۔ آنکھیں چیتے کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ سٹین گن اپنے گھٹنوں پر رکھی تھی۔ وہ کمانڈو کی وردی میں تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تمہیں کمال شاہ صاحب نے یہاں بھیجا ہے؟"

میں نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"پہلے مجھے اس بات کا یقین ہونا چاہیئے کہ تم ہی کمانڈو لیڈر شیروان ہو"

اس کے تینوں ساتھی وہیں موجود تھے۔ غار میں دو تین سیکنڈ کے لئے خاموشی چھا گئی۔ میں نے بڑا معقول سوال کیا تھا۔ وہ مسکرانے لگا۔ پھر کہا۔

"دلی میں تم کس آدمی سے ملے تھے؟"

میں نے گل خان کا نام لے دیا۔ کمانڈو شیروان نے دوسرا سوال کیا۔

"جموں میں کس کے پاس ٹھہرے تھے؟"

میں نے صادق کا نام لیا تو شیروان بولا۔

"اس نے تمہیں میری اور اپنی شناخت کے لئے کوئی خفیہ لفظ ضرور بتایا ہو گا۔ کیا تم بتا سکتے ہو؟"

میں نے صادق کا بتایا ہوا اردو کا شعر پڑھ کر سنایا تو کمانڈو شیروان نے پوچھا۔

"جس شاعر کا یہ شعر ہے اس کا نام کیا ہے؟"

اس سوال سے اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ کشمیری کمانڈو شیروان ہی ہے۔ شیروان کو بھی یقین ہو گیا تھا کہ میں صحیح آدمی ہوں اور مجھے کمال شاہ صاحب نے ہی گل خان اور جموں والے صادق صاحب کی راہ نمائی میں اس کے پاس بھیجا ہے۔

کمانڈو شیروان مسکراتے ہوئے بولا۔

"مجھے تو یقین ہو گیا ہے کہ تم اپنے آدمی ہو۔ میرا خیال ہے تمہیں بھی یقین آجانا چاہیئے کہ تم کمانڈو شیروان کے سامنے بیٹھے ہو"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"جی ہاں۔ مجھے یقین آگیا ہے۔ اب کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں ہے"

کشمیری کمانڈو شیروان نے اٹھ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ پھر گلے ملا اور اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"تم لوگ اپنی اپنی ڈیوٹی پر جاؤ اور ہمارے لئے چائے بھجوا دو"

اب غار میں میں اور کمانڈو شیروان دونوں اکیلے تھے۔ میری جیب سے انڈین سیکرٹ لیس کے خاص نمبر والا جو کارڈ نکلا تھا وہ کارڈ اور اسپرو ٹیبلٹ بم کی گولیوں والا لفافہ انڈو شیروان کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے مجاہد میری تلاشی لینے کے بعد یہ چیزیں اس کے الے کر چکے تھے۔ کمانڈو شیروان نے اسپرو کی گولیوں کو دیکھ کر کہا۔

"یہ تو سردرد کی گولیاں ہیں۔ مگر یہ کارڈ پر کس کا نمبر لکھا ہوا ہے"

میں کشمیری کمانڈو شیروان سے ان چیزوں کا راز نہیں چھپا سکتا تھا۔ میں نے دونوں ں کی اصل حقیقت بیان کر دی۔ انڈین سیکرٹ پولیس کے خفیہ نمبر والا کارڈ دیکھ کر وہ ش ہوا۔ کہنے لگا۔

"یہ نمبر بہت کام آسکتا ہے۔ باقی یہ اسپرو ٹیبلٹ بم والی گولیاں خاص خاص بھارتی فوجی اور پولیس افسروں کو ٹھکانے لگانے میں ہماری مدد کر سکتی ہیں۔ لیکن یہ گولی کسی کو کھلانے کے لئے اس شخص کا اعتماد حاصل کرنا بھی ضروری ہو گا۔ ایسا تو کسی خاص مشن میں ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ بہر حال یہ گولیاں تم اپنے پاس رکھو۔"

پھر کمانڈو شیروان نے وہ کاغذ دیکھا جس پر بظاہر پلاؤ وغیرہ بنانے کے مصالحوں کا نسخہ تھا۔ اس کے بارے میں' میں نے اسے بتایا کہ یہ اسپرو بم بنانے کا فارمولا ہے تو اس گل خان کی فنی مہارت کی بڑی تعریف کی۔ کہنے لگا۔

"یہ نسخہ ہم یہاں محفوظ جگہ پر سنبھال کر رکھیں گے۔ گولیاں تم اپنے پاس ہی رکھو۔ کیونکہ آئندہ کسی کمانڈو مشن میں یہ استعمال کی جا سکتی ہیں۔"

اس کے بعد کمانڈو شیروان نے مجھے کشمیر کے محاذ کی ساری صورت حال سمجھائی اور کھول کر بتایا کہ کہاں کہاں انڈین ملٹری فورس نے اپنے مورچے اور فیلڈ ہیڈ کوارٹر بنا ے ہیں۔ اس نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"یہاں جموں رائفلز کی آرٹلری رجمنٹ نے پہاڑی پر کچھ میڈیم توپیں نصب کر رکھی ہیں۔ یہ گن پوسٹیں ہم ابھی تک تباہ نہیں کر سکے۔ ان کے

گولے ہمارے خفیہ ٹھکانوں کی نشان دہی پر گرتے ہیں اور ہمیں شدید نقصان اٹھا کر وہاں سے کسی دوسری جگہ فرار ہونا پڑتا ہے۔ ان توپوں کی شیلنگ سے کئی بار ہمارے ایمونیشن کے ذخیرے بھی تباہ ہوئے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔

"انڈین فوج کو آپ لوگوں کے خفیہ ٹھکانوں کا کیسے پتہ چل جاتا ہے۔ آپ اس کا سدباب کیوں نہیں کرتے؟"

کمانڈو شیروان بولا۔

"ملٹری انٹیلی جینس کے آدمی سفید کپڑوں میں مسلمانوں کا بھیس بدل کر ساری وادی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کسی نہ کسی طرح انہیں ہمارے خفیہ ٹھکانے کا سراغ مل جاتا ہے اور ان پہاڑیوں پر لگی ہوئی توپیں وہاں گولہ باری شروع کر دیتی ہیں۔"

میں نے اسے کہا۔

"آپ لوگ ان گن پوسٹوں کے عقب میں جا کر اپنا خفیہ ٹھکانہ کیوں نہیں بنا لیتے"

کمانڈو شیروان کہنے لگا۔

"ایسا ہم کر تو کر سکتے ہیں مگر اس طرح ہم اپنے محاذ سے بہت دور ہو جائیں گے۔ ہمیں یہاں رہ کر انڈین فوج کے کنوائیوں پر بھی اٹیک کرنا ہوتا ہے تاکہ وادی میں مقیم ڈوگرہ رجمنٹوں کو سپلائی نہ پہنچ سکے۔ ہم اس وادی میں کسی جگہ چھپے رہنے پر مجبور ہیں۔ اور یہ ساری وادی اور اس کی پہاڑیاں انڈین آرٹلری رجمنٹ کی توپوں کی زد میں ہیں۔ ان توپوں کو تباہ کرنے کے لئے ہماری کئی کمانڈو پارٹیاں رات کو جا چکی ہیں مگر کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ ہمارے کئی جوان شہید ہو چکے ہیں۔ ہمیں ہر حالت میں ان توپوں کو خاموش کرنا ہے۔"

ایک مجاہد ہمارے لئے چائے لے کر آگیا۔ یہ کشمیری سبز چائے تھی اور چھوٹے سے دار میں تھی۔ ساتھ دو پیالیاں اور نمکین قلچے بھی تھے۔ یہ نمکین قلچے چھوٹے سائز ے تھے اور میں نے پہلی بار کھائے۔ کشمیری چائے کے ساتھ ان کا ذائقہ بڑا مزیدار لگا۔

کشمیری کمانڈو شیروان نے نقشے والا کاغذ لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا اور کہا۔

"اس پر کل بات کریں گے۔"

پھر وہ مجھے کمانڈو ٹریننگ کی باتیں کرنے لگا۔ بہت جلد اسے معلوم ہو گیا کہ میں نے انڈو کی فل ٹریننگ لی ہوئی ہے۔ وہ کہنے لگا۔

"کمال شاہ ایک مرد مومن ہے۔ اس نے جتنے مجاہدوں کو ٹریننگ دے کر ہمارے پاس بھیجا ہے انہوں نے اپنی فنی مہارت اور جرات سے کام لے کر فوج کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ ان میں سے اکثر کمانڈو شہید بھی ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے مشن پر گئے۔ ٹارگٹ تو مار لیا مگر خود واپس نہ آسکے۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کمانڈو جب کسی مشن پر جاتا ہے تو اس کے زندہ واپس آجانے کی بہت کم امید ہوتی ہے۔ وہ خود بھی موت کو قبول کر کے اپنے مشن پر روانہ ہوتا ہے۔"

پھر کمانڈو شیروان نے جہاد کشمیر کی مزید تفصیلات بتائیں اور کہنے لگا۔

"ہمارے حریت پرست کشمیری مجاہد وادی اور شہروں کے ہر محاذ پر انڈین فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی شہید ہوتا ہے تو سات آٹھ ڈوگرہ فوجیوں کو جہنم میں پہنچا کر شہید ہوتا ہے۔ ہم کشمیری کمانڈو ہیں۔ ہمارا کام محاذ سے پیچھے ان پہاڑیوں میں ہی رہ کر انڈین فوج کے سپلائی کانوائیوں' اس کے ایمونیشن ڈپوؤں اور دوسری فوجی تنصیبات پر کمانڈو اٹیک کر کے انہیں تباہ کرنا ہے۔ لیکن انڈین آرٹلری کی یہ توپیں ہر جگہ وادی میں ہمارا پیچھا کرتی ہیں۔ ہمیں کسی ایک جگہ بیٹھ کر کسی مشن کی سکیم تیار نہیں کرنے دیتیں۔ اس ہائیڈ آؤٹ میں آئے ہمیں صرف دو روز ہی ہوئے ہیں۔

ابھی تک انڈین ملٹری انٹیلی جینس کو ہمارے اس ہائیڈ آؤٹ کا سراغ نہیں مل سکا۔ جیسے ہی کسی جاسوس نے اس پہاڑی کی نشان دہی کی یہاں توپوں کی شیلنگ شروع ہو جائے گی۔ ہمارے لئے سب سے بڑی پرابلم یہ ہے کہ ہم ان پہاڑیوں کے علاوہ اور کسی طرف نہیں جاسکتے۔ کیونکہ جموں سے سری نگر جانے والی سڑک ان ہی پہاڑیوں سے گذرتی ہے اور ملٹری سپلائی اور ایمونیشن لے کر فوجی ٹرک اسی سڑک پر سے گذرتے ہیں جنہیں ہمیں ہر حالت میں تباہ کرنا ہوتا ہے۔"

ہم چائے بھی پیتے رہے اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتے رہے۔ کمانڈو شیروان کی زبانی مجھے جہاد کشمیر کے تقریباً ہر محاذ کی تفصیل معلوم ہوگئی۔ شیروان کہنے لگا۔

"اس وقت ہمارا سب سے پہلا ٹارگٹ جنوبی پہاڑیوں پر لگی آرٹلری کی توپیں ہیں۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ کل کتنی توپیں ہیں؟"

کمانڈو شیروان نے کہا۔

"فائرنگ کے وقت صرف چار توپیں پوائنٹ آؤٹ ہوئی ہیں۔ اور یہ جنوبی پہاڑ کی ڈھلوان اور چوٹی پر فاصلے فاصلے پر نصب ہیں۔ میں صبح کے وقت تمہیں یہ جگہ دور سے دکھاؤں گا۔ ہماری جتنی کمانڈو پارٹیاں ان توپوں کو تباہ کرنے گئی ہیں ان میں سے صرف ایک مجاہد شدید زخمی حالت میں کسی نہ کسی طرح واپس آنے میں کامیاب ہوا ہے۔ ہمارے کئی جوان کمانڈو واپس نہیں آسکے۔ یا تو وہ وہیں شہید ہو گئے یا انہیں بھارتی فوج نے پکڑ لیا۔ جو زخمی مجاہد واپس آنے میں کامیاب ہوا تھا اس نے بتایا ہے کہ وہ صرف ایک توپ کے بنکر تک ہی پہنچ سکا تھا۔ یہ توپ سیمنٹ کی موٹی دیوار کے اندر لگی ہوئی ہے اور وہیں مشین گن پوسٹ بھی ہے۔ جو ذرا سے شک پڑنے پر اندھا دھند گولیوں

کی بوچھاڑیں مارنے لگتی ہے۔"

رات کے دس بجے میں نے کشمیری کمانڈو لیڈر شیروان کے ساتھ کھانا کھایا اور وہیں ڑ کر سو گیا۔ دوسرے روز کافی دن چڑھے اٹھا۔ میری کئی دنوں کی نیند پوری ہو گئی تھی۔ اد رکھیں۔ کمانڈو چاہے کتنا ہی فولاد کا آدمی کیوں نہ ہو۔ ایک وقت آتا ہے کہ اسے بھی پنی نیند پوری کرنی ہوتی ہے اور اپنے جسم کی توانائی بحال کرنی ہوتی ہے۔

کمانڈو لیڈر شیروان رات کو تین آدمیوں کے ساتھ کسی مشن پر گیا ہوا تھا۔ وہ دوپہر کے وقت آیا۔ اس وقت ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ سردی اچھی خاصی تھی۔ کمانڈو یروان نے مجھے بتایا کہ اسے خبر ملی تھی کہ انڈین آرمز بریگیڈ کا ایک کانوائے گذرنے والا ہے۔ ہم ساری رات ایک جگہ گھات لگا کر بیٹھے رہے مگر کانوائے نہیں آیا۔

"معلوم ہوتا ہے شیڈول میں کوئی تبدیلی ہو گئی ہوگی۔ تم سناؤ۔ رات اچھی طرح سے گذری؟ آؤ بیٹھ کر کچھ کھا پی لیں۔ پھر نئے مشن پر باتیں کریں گے۔"

ہم نے خفیہ غار میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اس وقت وادی کشمیر کے آسمان پر بادل چھائے ئے تھے اور ہلکی بارش کا سلسلہ جاری تھا۔ کھانا کھانے کے بعد کشمیری کمانڈو لیڈر روان نے کہا۔

"تمہیں یہ لباس تبدیل کر دینا چاہئے۔ یہاں موسم سرد ہے۔"

اس نے میرے لئے کمانڈو کی نئی وردی منگوائی۔ یہ کوئی خاص وردی نہیں تھی۔ رے خاکی رنگ کی گرم پتلون گرم قمیض اور گرم جیکٹ تھی۔ سر پر میں نے کشمیری ت پرست کمانڈوز کی طرح سیاہ رومال باندھ لیا۔ مگر کمانڈو شیروان کی طرح میں نے بھی پنے منہ کو نہ ڈھانپا۔ جس وقت شیروان کو یقین ہو گیا تھا کہ میں ان کا اپنا آدمی ہوں تب ں نے اپنے منہ کے آگے سے سیاہ کپڑا ہٹا دیا تھا۔ اب اس نے بھی صرف اپنے سر پر یاہ رومال باندھا ہوا تھا ہم نے ظہر کی نماز غار میں ہی پڑھی۔ نماز کے بعد ہم نے آزادی ٹیر کے لئے خدا کے حضور دعا مانگی۔

غار کے اندر اندھیرا ہونے کی وجہ سے لالٹین ہر وقت روشن رہتی تھی۔ کمانڈو شیروان نے جیب میں تہہ کیا ہوا نقشہ نکال کر اپنے گھٹنوں پر پھیلایا اور بھارتی فوج نے جو جنوبی پہاڑ پر توپیں لگا رکھی تھیں ان کی پوزیشن مجھے سمجھانے لگا۔ ابھی اس کو گفتگو شروع کیئے ایک منٹ ہی ہوا ہو گا کہ ہمیں غار کے باہر ایک خاص قسم کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ ہم دونوں سمجھ گئے کہ یہ دشمن کے توپ کے گولے کی آواز ہے جو ابھی ہمارے اوپر آکر گرے گا۔ مگر ہم پہاڑی کے اندر تھے اتنے میں غار کے باہر دھماکہ ہوا۔ اس کے بعد گولہ باری شروع ہو گئی۔ گولے ہمارے غار کے اردگرد پھٹ رہے تھے۔ کمانڈو شیروان اور میں غار سے باہر نکل آئے تھے۔ ہمارے دوسرے حریت پرست کشمیری کمانڈو ساتھی ایک جگہ سے ایمونیشن کے بکس نکال نکال کر غار کی عقبی پہاڑی کی طرف دوڑ دوڑ کر لے جا رہے تھے۔ ساری وادی توپوں کی گولا باری سے گونج رہی تھی۔ کمانڈو شیروان نے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے دشمن کو خبر مل گئی ہے کہ ہمارا نیا ہائیڈ آؤٹ کہیں اس پہاڑی میں ہے۔ جلدی سے پیچھے کی طرف نکل چلو"

انہوں نے دوسری جگہ پہلے سے چن رکھی تھی۔ یہ وہاں سے دور ایک پہاڑی کے پیچھے جو چٹانیں تھیں وہاں ایک بہت بڑی چٹان کے اندر والا قدرتی غار تھا۔ ۲۱ کے آگے سے تیز رفتار پہاڑی ندی گذرتی تھی۔ چٹان کے غار تک جانے کے لئے ایک خفیہ راستہ تھا۔ ہم توپوں کی گولا باری میں وہاں سے اپنا سارا اسلحہ اور ایمونیشن نکال کر نئی جگہ پر لے آئے جنوبی پہاڑ کی ڈھلان اور چوٹی پر لگی ہوئی بھارتی آرٹلری کی چاروں توپیں وقفے وقفے سے پہاڑی پر ایک ہی جگہ گولے فائر کرتی رہیں۔ ہمارا کوئی کشمیری مجاہد نہ زخمی ہوا نہ شہید ہوا۔ نئے چٹانی غار میں آکر شیروان کہنے لگا۔

"یہ ڈرامہ ہمارے ساتھ پچھلے کئی مہینوں سے کھیلا جا رہا ہے۔ آس پاس وادی میں چرواہوں اور کسانوں کے بھیس میں پھرتے بھارتی ملٹری انٹیلی جینس کے جاسوسوں کو ذرا ہمارے ٹھکانے کا سراغ ملتا ہے تو اوپر کی پہاڑیوں سے اس مقام پر شیلنگ شروع ہو جاتی ہے۔ بھارتی فوجی اس طرف خود آکر چھاپہ

مارنے سے گھبراتے ہیں۔ ایک بار ہمارے دوسرے محاذ پر وہ ایسی غلطی کر بیٹھے تھے ہمارے حریت پسند مجاہد ہائیڈ آؤٹس میں پہلے سے تیار بیٹھے تھے۔ انڈین فوج کی پلاٹون جیسے ہی پہاڑی جنگل میں داخل ہوئی ان پر چٹانوں اور درختوں کے پیچھے سے گولیوں اور گرینڈوں کی بارش شروع ہو گئی۔ ایک بھی بھارتی فوجی بچ کر نہیں گیا تھا۔"

میں نے کمانڈو شیروان سے کہا۔

"میرے ساتھ اپنا ایک کمانڈو کر دو۔ میں آج رات کو ہی یہ توپیں تباہ کرنے کے مشن پر جاتا ہوں"

کمانڈو شیروان نے کہا۔

"میں خود تمہارے ساتھ جاؤں گا"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"کمانڈر! ایک محاذ پر ایک وقت میں صرف ایک ہی جرنیل کو لڑنا چاہئیے۔ تم یہاں پیچھے رہو گے۔ کوئی مجاہد میرے ساتھ کر دینا جو ان پہاڑی راستوں سے اچھی طرح واقف ہو باقی میں سنبھال لوں گا۔ بارش بھی ہو رہی ہے۔ خدا کرے کہ یہ بارش رات بھر جاری رہے ایسے خطرناک کمانڈو مشن کے لئے بارش بڑی فائدے مند ثابت ہوتی ہے۔"

نئے ہائیڈ آؤٹ میں آکر میں نے ایک بار پھر نقشے پر توپوں کی پوزیشن کا اندازہ لگایا۔ وقت یہ توپیں شیلنگ کر رہی تھیں اس وقت میں نے ایک ٹیکری پر کھڑے ہو کر والے پہاڑ کی ڈھلان کا غور سے مشاہدہ کیا تھا۔ توپ جب گولا فائر کرتی ہے تو رات ت اس میں سے شعلہ نکلتا دکھائی دیتا ہے لیکن دن کے وقت صرف دھواں نکلتا یہ دن کا وقت تھا۔ میں نے دیکھا کہ پہاڑ کی ڈھال پر چار جگہوں سے گولے فائر ہو تھے۔ ان چاروں جگہوں سے فائر کے بعد دھواں نکلتا دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا تھا توپیں پہاڑ کی چوٹی سے کافی نیچے ایک لائن میں نصب کی گئی ہیں اور ان چاروں کے

درمیان میرے حساب سے زیادہ سے زیادہ ساٹھ ستر گز کا فاصلہ تھا جو پہاڑی جنگل ہونے
کی وجہ سے سو گز بھی ہو سکتا تھا۔ یہ ساری باتیں میں نے اپنے ذہن میں بٹھالی تھیں اور
اس کی روشنی میں نقشے پر کشمیری کمانڈو لیڈر شیروان کے لگائے ہوئے پنسل کے نشانات
دیکھ رہا تھا۔ جب میں نے ساری پوزیشنیں ذہن میں اچھی طرح بٹھالیں تو کمانڈو لیڈر
شیروان سے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں اسی وقت اپنے مشن پر نکل جانا چاہئے"

کمانڈو لیڈر شیروان نے میرے ساتھ ایک کشمیری کمانڈو کر دیا جس کا اصل نام کچھ
اور تھا۔ فرضی نام میں جہانگیر بٹ رکھ لیتا ہوں۔ یہ تربیت یافتہ کمانڈو تھا اور میری طرح
جوان اور توانا تھا۔ اسی وقت رات کے نو سوا نو بجے کا ٹائم ہو گا۔ ہمارے پاس ایک ایک
سٹین گن تھی۔ آٹھ آٹھ گرنیڈ تھے۔ کمانڈو چاقو میرے پاس بھی تھا اور ایسا ہی ایک خاص
چاقو جہانگیر بٹ کے پاس بھی تھا۔ جہانگیر بٹ تمام پہاڑی علاقوں سے واقف تھا۔ جس
وقت ہم اپنے خفیہ ٹھکانے سے نکلے تو رات تاریک تھی مگر بوندا باندی رک گئی تھی۔
اخروٹ اور چنار کے اونچے اونچے درختوں سے اندھیرے میں بارش کا رکا ہوا پانی ٹپ ٹپ
گر رہا تھا۔

جہانگیر بٹ مجھے ایک پہاڑی کے پیچھے سے نکال کر ایک چھوٹی سی وادی میں لے آیا
زمین بارش کی وجہ سے گیلی تھی۔ مگر جنگلی گھاس کی وجہ سے پھسلن زیادہ خطرناک نہیں
تھی۔ وادی کے درختوں کا اندھیرا ہمیں کچھ نہیں کہتا تھا۔ ہم دونوں اے ون کمانڈو تھے
اور اندھیرے میں بھی اپنا ٹارگٹ دیکھ سکتے تھے۔ ہم خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔ اس
قسم کے کمانڈو مشن پر جاتے ہوئے خاموشی سب سے زیادہ ضروری ہوتی ہے۔ صرف
انتہائی ضرورت کے وقت ہم ایک دوسرے سے ایک آدھ بات سرگوشی میں کر لیتے۔ زیادہ
تر ہم اندھیرے میں اشاروں سے کام لیتے۔

ہم وادی سے نکل گئے۔ اب وہ پہاڑ ہمارے سامنے تھا جس کی ڈھلان پر چوٹی کے
قریب انڈین آرمی کی کسی آرٹلری رجمنٹ نے اپنی چار میڈیم توپیں ڈھلائے کر ر

اور جو کشمیری مجاہدین کو خاص طور پر حریت پرست کمانڈوز کو سخت نقصان پہنچا رہی
۔ جہانگیر بٹ چلتے چلتے رک گیا۔ وہ جھک کر کچھ دیکھنے لگا۔ پھر میرے قریب ہو کر
آواز میں بولا۔

"دوست! ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں۔ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ"

ہم نے ایک برساتی پہاڑی نالہ عبور کیا۔ پانی ہماری پنڈلیوں تک تھا مگر بڑا تیز رفتار
دوسرے کنارے پر جنگل کا ایک کھلا تختہ آ گیا۔ یہاں کہیں کہیں عمودی چٹانیں رات
اندھیرے میں اوپر کو اٹھی نظر آ رہی تھیں۔ جہانگیر بٹ ان جنگلاتی پہاڑی راستوں کا
ی تھا۔ ہم چلتے چلتے ایک کھڈ میں اتر گئے۔ یہ کھڈ آگے جا کر ایک طرف مڑ گئی تھی۔
میں جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ راستہ پتھروں سے بھرا ہوا تھا۔ کھڈ میں ہم کافی دیر
چلتے رہے۔ اس کے دونوں کنارے دیواروں کی طرح اونچے تھے۔ کھڈ سے باہر نکلے تو
ار اور چنار کے درختوں کے جھنڈ اوپر کو جا رہے تھے۔ جہانگیر بٹ نے آہستہ سے کہا۔

"دوست! یہاں سے خطرناک ایریا شروع ہو رہا ہے۔ یہ اس پہاڑ کی
ڈھلان ہے جہاں توپیں لگی ہوئی ہیں"

میں نے کہا۔

"ان گن پوسٹوں کی گشتی پارٹیاں بھی رات کو ضرور گشت پر ہوں گی۔"

جہانگیر بٹ نے آہستہ سے کہا۔

"ہمیں ان سے بھی ہوشیار رہنا ہو گا۔"

چیڑھ کے درختوں کا جنگل پہاڑ کی ڈھلان پر ذرا اوپر جا کر اچانک ختم ہو گیا۔ اب
لان پر جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں میں نے اندھیرے میں ایک جگہ رک کر اوپر دیکھا۔
ہی پہاڑی ڈھلان تھی جہاں میں نے شروع رات میں توپوں کو فائر کرتے دیکھا تھا۔ مگر
ائی کافی بلندی تک چلی گئی تھی۔ ہم ایک دوسرے کے درمیان پانچ گز کا فاصلہ
کر جھاڑیوں کو پکڑ پکڑ کر پہاڑ کی چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ یہاں گن پوسٹوں کی گشتی
کا کوئی بھی ڈوگرہ فوجی ہمیں مل سکتا تھا۔ ہم بڑی احتیاط کے ساتھ بغیر آواز پیدا کئے

آہستہ آہستہ اوپر چڑھ رہے تھے۔ رات کے اندھیرے میں اندازے سے دشمن کی توپوں کے بنکروں کو پوائنٹ آؤٹ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ جب ہم تقریباً پہاڑ کی آدھی چڑھائی چڑھ گئے تو میں نے جہانگیر بٹ کو اپنے منہ سے ایک پرندے کی ہلکی سی آواز نکال کر روک دیا۔ وہ وہیں جھاڑی کے پاس بیٹھ گیا۔ میں ٹیک کر چلتا اس کے پاس گیا اور سرگوشی میں کہا۔

"مجھے سگریٹ کے تمباکوں کی بو محسوس ہوئی ہے"

جہانگیر بٹ نے سانس دو تین بار اوپر کھینچ کر فضا کو سونگھا اور آہستہ سے بولا۔

"لگتا ہے گن پوسٹ کی پٹرول پارٹی کے آدمی آس پاس ہی کہیں ہیں"

سگریٹ کی بو بہت ہلکی تھی۔

اسے ایک کمانڈو ہی فضا میں سونگھ سکتا تھا۔ بو مسلسل نہیں آرہی تھی۔ اس کی ایک ی سی لہر ہمارے قریب سے ہو کر گذر گئی تھی۔ بارش کی وجہ سے جھاڑیاں گیلی تھیں۔ وہیں بیٹھ گئے۔ پھر میں نے جہانگیر بٹ کے کان میں کچھ کہا۔ وہ جلدی سے مجھ سے دس م کے فاصلے پر بائیں جانب ہو کر جھاڑیوں میں بیٹھ گیا۔ میری ناک فضا میں سگریٹ کی بو تلاش کر رہی تھی۔ میں نے جہانگیر بٹ کمانڈو کے کان میں یہ کہا تھا کہ اگر گشتی پارٹی ڈوگروں کی دو دو چار چار کی ٹولی ادھر آئے تو اسے گذر جانے دینا۔ ہمیں خواہ مخواہ ان مانڈو اٹیک کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ میں نے اس لئے کہا تھا کہ اگر ہم ان پر جھپٹے تو ن کے دو فوجیوں کی تو چشم زدن میں گردن توڑ دیں گے لیکن اگر تیسرے فوجی نے بھی فائر کر دیا تو اوپر گن پوسٹ پر دشمن بیدار ہو جائے گا اور ہمارا مشن بھی ساتھ ہی ہو جائے گا۔

ہم دس پندرہ منٹ تک جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھے رہے۔ دوبارہ نہ تمباکو کی بو آئی نہ ہی دشمن کی گشتی پارٹی کا کوئی فوجی ادھر سے گذرا۔ میں دبے پاؤں چل کر جہانگیر کے پاس گیا اور اسے بھی کہا کہ ہمیں مزید اوپر چلنا ہو گا۔ چڑھائی دشوار گذار تھی۔ ہم اپنی ٹریننگ کے مطابق آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے درمیان تھوڑا فاصلے ڈالے چڑھتے جا رہے تھے۔ تھوڑی دور اوپر گئے تو چھوٹے چھوٹے درختوں نے ہمارا راستہ

روک لیا۔ ہم کبھی کسی درخت کے بائیں طرف سے اور کبھی دائیں جانب سے ہو کر چڑھائی چڑھتے گئے اور کوشش کر کے اپنی سمت کو برقرار رکھا۔

اچانک ہمیں انسانی آوازیں سنائی دیں۔ ہم وہیں اپنی اپنی جگہ پر دبک گئے۔ دو آدمی باتیں کرتے آ رہے تھے۔ یہ گشتی پارٹی کے ڈوگرہ سپاہی ہی ہو سکتے تھے۔ آوازیں قریب آئیں تو سگریٹ کی بو بھی آئی۔ گشتی پارٹی کو پٹرول ڈیوٹی پر سگریٹ پینے کی اجازت نہیں ہوتی۔ لیکن یہ ڈوگرے سگریٹ پی رہے تھے۔ لیکن لگتا تھا کہ وہ سگریٹ مٹھی میں چھپا کر پی رہے ہیں کیونکہ جس طرف سے آوازیں آ رہی تھیں اس طرف مجھے سگریٹ کی چمک ایک بار بھی نظر نہیں آئی تھی۔

دونوں ڈوگرہ سپاہی اپنے کسی کمانڈنگ آفیسر کے خلاف باتیں کر رہے تھے۔ میں جھاڑی کے پیچھے بیٹھے آنکھیں سکیڑ کر غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ درختوں کے درمیان مجھے دو سائے دکھائی دیئے جو ہماری طرف ہی آ رہے تھے۔ میں نے سانس روک لی کمانڈو جہانگیر بٹ نے بھی سانس روک لیا ہو گا۔ رات کے اندھیرے میں ڈوگرہ سپاہی کے سامنے سے ہمارے درمیان سے گذر گئے۔ وہ جھاڑیوں کو پکڑ پکڑ کر پہاڑ کے پہلو میں سے ہو کر جا رہے تھے۔ نہ وہ چڑھائی چڑھ رہے تھے نہ ڈھلان پر نیچے اتر رہے تھے۔ جب وہ دور چلے گئے اور ان کی آوازیں آنا بھی بند ہو گئیں تو جہانگیر بٹ جھاڑیوں سے نکل کر میرے پاس آ کر بیٹھ گیا اور سرگوشی میں بولا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ ہم ٹارگٹ کے قریب پہنچ گئے ہیں"

میں نے اسے کہا۔

"اوپر چار توپیں لگی ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق ان کا درمیانی فاصلہ ساٹھ ستر گز سے زیادہ نہیں ہے۔ اگر کوئی ایک گن پوسٹ پوائنٹ آؤٹ ہو جائے تو وہ میرا ٹارگٹ ہو گا۔ تم اس کے متوازی دوسری گن پوسٹ پر اٹیک کرو گے"

ہم نے اپنے پاس جو آٹھ آٹھ گرنیڈ اور ایک ایک سٹین گن رکھی ہوئی تھی

انتہائی مجبوری کا اسلحہ تھا۔ یعنی یہ اس وقت استعمال کرنا تھا جب دوسرا کوئی چارہ کار نہ رہا ہو۔ وگرنہ ہمارا مشن ایک خاموش کمانڈو مشن تھا۔ ہمیں چار گن پوسٹوں پر اس طرح حملہ کرنا تھا کہ مورچے میں موجود ڈوگرہ فوجیوں کو مشین گن فائر کرنے کی مہلت نہ مل سکے۔ ہم دشمن کو خاموشی سے چیتے کی طرح جھپٹ کر آناً فاناً ہلاک کر دینا چاہتے تھے۔ اگر ایک گن پوسٹ کی مشین گن فائر ہوتی ہے تو دوسرے پوسٹ کے سپاہی ایک دم فائر کھول سکتے تھے۔ اس طرح ہماری سکیم کے ناکام ہو جانے کا خطرہ تھا۔

میں نے اندھیرے میں پہاڑی کے اوپر کی طرف دیکھتے ہوئے جہانگیر بٹ سے کہا۔

"میرے حساب کے مطابق ایک گن کو اسی جگہ ہونا چاہئے۔"

اچانک چاروں طرف روشنی پھیل گئی۔ ہم نے سر نیچے کر لئے۔ دشمن کو شاید شک پڑ گیا تھا کہ کشمیری کمانڈو پارٹی اٹیک کرنے آ رہی ہے یا پھر اس نے احتیاط کے طور پر ایک ساتھ تین روشنی راؤنڈ فائر کر دیئے تھے۔ یہ روشنی راؤنڈ ایسے تھے کہ جن کے ساتھ پیراشوٹ بندھے ہوئے تھے۔ روشنی کے گولے آہستہ آہستہ نیچے آ رہے تھے۔ ساری وادی روشن ہو گئی تھی۔ میری نگاہیں اوپر لگی ہوئی تھیں۔ پہلا روشنی راؤنڈ پیراشوٹ کے ساتھ آہستہ آہستہ نیچے آ کر درختوں میں غائب ہو گیا۔ دوسرے روشنی راؤنڈ میں بھی میں اوپر نہ دیکھ سکا۔ تیسرا روشنی راؤنڈ فائر ہوا تو اچانک مجھے اوپر جھاڑیوں میں سے ایک گن کی نالی باہر نکلی ہوئی نظر آ گئی۔ میں نے جہانگیر بٹ کا کندھا ہلا کر اشارے سے اوپر گن کی نالی یا بیرل دکھایا۔ اس نے خوش ہو کر آہستہ سے کہا

"دوست! یہ میڈیم گن کی نالی ہے"

"یا اللہ! یہ تیرا کرم ہے"

میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ روشنی راؤنڈ بجھ گئے تھے۔ وادی اور پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر ایک بار پھر تاریکی چھا گئی تھی۔ دشمن نے روشنی راؤنڈ کی روشنی میں ہمیں تو نہیں دیکھا تھا مگر ہم نے دشمن کی چار توپوں میں سے ایک توپ کو دیکھ لیا تھا۔ ہم نے اس توپ کے رخ کی جانب چڑھائی پر چڑھنا شروع کر دیا۔ ہم اس طرح چڑھائی چڑھ رہے تھے

جس طرح کوئی چیتا یا شیر اپنے شکار کو دیکھ کر دبے پاؤں اپنے جسم کو سکیڑ کر اس کی طرف آواز کئے بغیر بڑھتا ہے۔ ہم سانس بھی بڑی آہستہ سے لے رہے تھے۔ ہم توپ کے بنکر کے قریب آگئے تھے مگر ہمیں پتہ نہیں تھا۔ پتہ اس وقت لگا جب اچانک گن پوسٹ کے بنکر میں سے کسی سپاہی نے دوسرے کو آواز دی اور اسے کچھ کہا جو ہماری کچھ میں نہ آسکا۔ یہ آواز سنتے ہی ہم نے اندھیرے میں اپنے اپنے کمانڈو چاقو نکال لئے۔ گرنیڈ ہماری جیکٹ کی جیبوں میں تھے۔ سٹین گن کو ہم نے پیٹھ پر اس طرح ڈال رکھا تھا کہ چلتے وقت اس کی ہلکی سی آواز بھی پیدا نہ ہو۔ چاقو نکالتے ہی میں نے جہانگیر بٹ کو گن پوسٹ کی دائیں جانب اوپر جانے کا اشارہ کیا اور ہم دونوں الگ الگ ہو کر اوپر رینگنے لگے۔ چڑھائی پر رینگنا ہمت طلب کام تھا اور ہمت ہمارے پاس موجود تھی۔ فاصلہ ڈال کر جھاڑیوں کی جڑوں کو پکڑ پکڑ کر اوپر کی طرف رینگ رہے تھے۔

تاریکی میں مجھے اوپر کوئی دس پندرہ گز کے فاصلے پر میڈیم گن کی نالی بنکر سے باہر نکلی ہوئی نظر آئی۔ یہ نالی جہانگیر بٹ نے بھی ضرور دیکھ لی ہوگی۔ کیونکہ وہ میرے متوازی مجھ سے سات گز کے فاصلے پر اوپر کی طرف رینگ رہا تھا۔ ہم جھاڑیوں کو پکڑ پکڑ کر اس طرح رینگ رینگ کر چڑھائی چڑھ رہے تھے کہ ذرا سی بھی آواز پیدا نہ ہو۔ اس کام کی ہمیں سخت ٹریننگ دی گئی تھی۔ میں توپ کی نالی کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ میں نے اندھیرے میں غور سے دیکھا۔ یہ ایک پکا بنکر نما مورچہ تھا جس کے اوپر گنبد سا بنا ہوا تھا۔ کمانڈو جہانگیر بٹ بنکر کی دوسری طرف نکل گیا۔ میں بائیں جانب بنکر کی دیوار کے ساتھ لگ کر رینگتا ہوا آگے ایک چھوٹے سے چبوترے پر آگیا۔ گن پوسٹ کا راستہ پیچھے کی جانب تھا۔ یہاں بنکر میں مجھ سے کوئی ایک فٹ اوپر دو سوراخ تھے۔ یقیناً یہاں مشین گن لگی ہوئی تھی۔ سوراخ چوکور تھے۔ تاریکی میں مجھے مشین گن کی نالی نظر نہیں آئی تھی۔

میں سانپ کی طرح چبوترے کے پتھروں پر رینگ رینگ کر مورچے کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ یہاں مجھے ایک اور گول سوراخ نظر آیا۔ اس میں سے ہلکی ہلکی روشنی نکل رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے گردن اونچی کر کے سوراخ کے ساتھ اپنی

ہ نکھیں لگا دیں۔۔ اندر ایمونیشن کے بکسوں پر تین فوجی آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ یہاں سردی زیادہ تھی اور ہوا بھی سرد چل رہی تھی۔ وہ تمام چینی کے مگ ہاتھوں میں لئے ہائے پی رہے تھے۔ میں بڑی احتیاط کے ساتھ گردن نیچی کر کے پیچھے ہٹ گیا۔ پھر سکیم ے مطابق بنکر کے عقب میں ایک جانب جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ میں نے دوسری رف جو جھاڑیاں تھیں ان کی طرف ایک سائے کو رینگ کر بڑھتے دیکھا۔ یہ میرا ساتھی مانڈو جہانگیر بٹ تھا۔ وہ بھی جھاڑیوں میں چھپ گیا۔ سکیم کے مطابق میں نے ایک چھوٹا اپتھر اٹھا کر آہستہ سے بنکر کے گنبد کے اوپر اچھال دیا۔ پتھر نے سیمنٹ کے گنبد پر گرنے ے آواز پیدا کی۔ بنکر کے اندر کچھ تیز تیز آوازیں آئیں۔ پھر ایک سپاہی بنکر کے دوازے سے نکل کر باہر آگیا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے چلنے کے انداز ے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ بات اس کے ذہن میں نہیں ہے کہ وہاں کوئی کشمیری کمانڈو بھی سکتا ہے۔ وہ غالباً یہی سمجھ رہا تھا کہ درخت کے اوپر سے کوئی شاخ یا پھل ٹوٹ کر بنکر کی ت پر گرا ہے۔ پھر بھی وہ محتاط ضرور تھا۔ وہ بنکر کی دوسری طرف گھوم کر کھڑا ہو گیا۔ ا نے آواز دی۔

"ادھر کون ہے؟"

اس دوران میں جھاڑیوں کے پیچھے سے رینگتا ہوا اس کے عقب میں آگیا تھا۔ میں پ کی طرح رینگ کر ڈوگرہ سپاہی کے عقب میں آیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ سانپ کے ینگنے کی آواز پیدا ہو سکتی تھی مگر میری معمولی سی آہٹ بھی نہیں ہوئی تھی۔ میری ھیں اپنے شکار پر جم گئی تھیں۔ اب ایک لمحہ آنے والا تھا۔ وہ لمحہ ایک سیکنڈ کا رواں حصہ بھی ہو سکتا تھا۔ ایک سیکنڈ کا ایک سوواں حصہ بھی ہو سکتا تھا۔ اس سے وہ دیر لگانا مجھے میرے استاد کمانڈو کمال شاہ نے نہیں سکھایا تھا۔

آخر وہ لمحہ آگیا۔ جیسے ہی ڈوگرہ اپنے بنکر کی طرف مڑ کر جانے لگا میں اس پر چھلانگ لا کر اس کی گردن اپنے دائیں بازو کے شکنجے میں لے کر بائیں ہاتھ والا چاقو اس کی گردن پوری طاقت سے پھیر چکا تھا۔ چاقو کے پھیرتے ہی میں نے اسے وہیں زمین پر لٹا کر اس

کے حلق پر اپنا پاؤں رکھ کر دبایا تا کہ اس کے نرخرے میں سے سانس نکلنے کی آواز پیدا نہ ہو۔ اس آپریشن میں ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت لگا تھا۔ ڈوگرہ فوجی کی لاش بنکر کے عقب میں زمین پر پڑی تھی۔ میں اس کی لاش کو پاؤں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا جھاڑیوں میں لے گیا۔ اور نظریں ایک بار پھر بنکر کے دروازے پر لگادیں۔ کوئی دس پندرہ سیکنڈ کے بعد ایک اور ڈوگرہ سپاہی بنکر کے دروازے پر آگیا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں نہیں تھی بلکہ سلنگ کے ساتھ اس کے کاندھے سے لٹک رہی تھی۔

اس دوسرے ڈوگرے نے پہلے ڈوگرے کا نام لے کر اسے گالی دی اور پھر پوچھا کہ وہ کدھر مرگیا ہے۔ جب اس کے مرے ہوئے ساتھی نے اسے کوئی جواب نہ دیا تو وہ میری طرف آنے کے بجائے دوسری طرف چلا جدھر جھاڑیوں میں میرا ساتھی کمانڈو جہانگیر بٹ گھات لگائے بیٹھا تھا۔ میں نے اس دوسرے ڈوگرہ سپاہی کو جہانگیر بٹ والی جھاڑیوں کی طرف جاتے دیکھا۔ اس کے بعد گہری خاموشی چھاگئی۔ میں جہانگیر بٹ کی تربیت کے کمال پر اسے داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ اپنا کام کرچکا تھا۔ سکیم کے مطابق اسے دوسرے ڈوگرے کو ہلاک کرنے کے بعد میرے پاس آجانا تھا۔ اندھیرے میں ایک سایہ جھاڑیوں میں سے نکل کر تیزی سے میری طرف بڑھا۔ یہ کمانڈو جہانگیر بٹ تھا۔ وہ میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ کمانڈو نائف کھلا ہوا ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے گھاس پر چاقو کو رگڑ کر ڈوگرہ فوجی کا خون صاف کیا اور سرگوشی میں کہا۔

"اندر صرف ایک ہی ہے"

"ہاں۔۔۔"

میں نے بغیر آواز کے سرگوشی میں جواب دیا۔ ہم دونوں کی نگاہیں بنکر کے دروازے پر لگی تھیں جس پر نمدہ گرا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے ہلکی روشنی تھی۔ میں نے جہانگیر بٹ اشارہ کیا۔ ہم دونوں الگ الگ ہو کر گیلی گھاس پر پیٹ کے بل رینگتے ہوئے بنکر کی طرف بڑھے اور پھر اس کے دروازے کی دونوں جانب بنکر کی پختہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہوئے۔ کھلے چاقو ہم دونوں کے ہاتھوں میں تھے۔ بنکر کے اندر جو کوئی بھی ڈوگرہ فوجی ا

رہ گیا تھا اسے اپنے دو ساتھیوں کے لئے باہر نکلنا ہی تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جیسے ہی اس نے دروازے پر پڑا ہوا نمدا اٹھایا۔ ہم نے اسے وہیں دبوچ لیا۔ اس کا کام تمام کرنے کی بجائے اسے ہم اندر بنکر میں لے گئے اور اسے سے پوچھا کہ باقی کی تین گن پوسٹیں کہاں ہیں۔ وہ ہم دونوں کے ہاتھوں میں چاقو اور سٹین گنیں اور سر پر بندھے ہوئے سیاہ رومال دیکھ کر فوراً سمجھ گیا کہ ہم کشمیری حریت پرست مجاہد ہیں۔ وہ خوف زدہ ہو کر بولا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ مجھے نہ مارنا"

لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اسے دوسری تین گن پوزیشنوں کا پتہ نہ ہو اور یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ہم اس سے اپنا مطلب حاصل کئے بغیر مار ڈالتے۔ تھوڑے سے ٹارچر کے بعد اس نے باقی کی تینوں گن پوسٹوں کی نشان دہی کر دی۔ یہ گن پوسٹیں میرے اندازے کے عین مطابق وہاں سے متوازی لائن میں پچاس پچاس گز کے فاصلے پر تھیں۔ اس کے بعد ہم اسے مورچے سے نکال کر باہر لے آئے میں نے اسکی گردن کو ایک جھٹکا دیا اور اس کا بھی کام تمام کر دیا۔ مورچے کے اندر مشین گن بھی لگی ہوئی تھی۔ میڈیم گن کے ایمونیشن کے چھ سات بکس بھی پڑے تھے۔ دوسرے اسلحہ کے بکس بھی تھے۔ اس ڈوگرہ فوجی سے ہم نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ نیچے جو پٹرول گشت کر رہی ہے وہ کس پوسٹ کی ہے اس نے بتایا تھا کہ وہ تیسری گن پوسٹ کی ٹیم ہے۔

وہاں سے ہم دوسری گن پوسٹ کی طرف چل پڑے۔ وہ بھی ہمیں مل گئی جو وہاں سے پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر بائیں جانب تھی۔ رات کے اندھیرے اور خاموشی میں ہم اپنے ٹارگٹ پر پہنچ گئے۔ یہ توپ بھی پختہ بنکر کے مورچے میں تھی۔ باہر سناٹا طاری تھا۔ دروازے پر نمدا لٹک رہا تھا۔ توپ کا بیرل باہر نکلا ہوا تھا۔ سردی کافی بڑھ گئی تھی۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ ہم نے بنکر کے ایک سوراخ میں سے بڑی احتیاط کے ساتھ دیکھ لیا کہ اندر دشمن کے چار فوجی موجود تھے۔ یہاں ہمیں کسی کو باہر نکالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمیں اپنی مطلوبہ معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ ہم سٹین گنیں لے کر ایک دم سے بنکر میں داخل ہوئے اور جاتے ہی فائر کھول دیا۔ چاروں فوجی خون میں لت پت ادھر ادھر

گرتے ہوئے تڑپنے لگے۔ یہاں سے ہم تیسری گن پوزیشن پر گئے۔ وہاں بھی ہمیں اسی طرح چارج کر کے اندر موجود ڈوگرہ فوجیوں کو ہلاک کرنا تھا مگر ہم بنکر کے دروازے پر ہی پہنچے تھے کہ گشتی ٹیم کے فوجی اچانک ایک طرف سے نکل آئے انہوں نے ہمیں للکارا۔ ہم نے فائر کھول دیا۔ بنکر کے اندر سے بھی فوجی مشین گنیں لے کر باہر نکل آئے۔

اب ہمارے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہم نے اوپر تلے تین گرنیڈ پھینکے۔ تین دھماکے ہوئے اور پٹرول پارٹی کے فوجیوں اور بنکر میں سے باہر نکل کر جو سپاہی آئے تھے ان کے پرخچے اڑ گئے۔ گرنیڈ کے دھماکوں نے چوتھی گن پوسٹ کے سپاہیوں کو چوکنا کر دیا۔ وہاں سے روشنی کے راؤنڈ فائر ہوئے اور ساتھ ہی ہم پر گولیوں کی بوچھاڑیں آئیں۔ ہم زمین پر بیٹھ گئے۔ پہاڑوں میں روشنی راؤنڈ کے فائر ہونے سے دن نکل آیا تھا۔ میں نے جہانگیر بٹ کو اشارہ کیا۔ وہ دوڑ کر گن پوسٹ کے دروازے پر گیا اور ایک طرف لیٹ کر اس نے اندر پن نکال کر دو گرنیڈ لڑھکا دیئے۔ اس کے ساتھ ہی ہم دونوں پیچھے کی جانب جھاڑیوں میں بھاگنے لگے۔

ہم بمشکل تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ گن پوسٹ میں دو دھماکے ہوئے۔ یہ ہمارے دو گرنیڈوں کے دھماکے تھے مجھے تیسرے خوفناک دھماکے کا انتظار تھا جو بنکر کے اندر توپوں کے ایمونیشن کے پھٹنے سے ہونا تھا۔ بنکر کے دروازے کا پردہ اڑ گیا تھا۔ اندر سے دھواں نکل رہا تھا۔ میں نے جہانگیر سے کہا۔

"دوسری اور پہلی گن پوسٹوں کی طرف ڈبل سے۔۔۔"

مجھے معلوم تھا کہ ابھی گن پوسٹ کے اندر سے ایمونیشن پھٹنے والا ہے۔ ہم دوسری گن پوسٹ کے بنکر کی طرف اندھیرے میں دوڑ پڑے چوتھی گن پوسٹ کی طرف سے برابر فائرنگ ہو رہی تھی۔ گولیاں ہمارے اوپر سے گذر رہی تھیں۔

پھر ایک دھماکہ ہوا۔ یہ ایسا دھماکہ تھا کہ پہاڑ ہل گیا۔ ہم ہوا کے شدید دباؤ سے تین چار گز آگے گر پڑے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ گن پوسٹ کے بنکر میں سے آگ کے شعلے اٹھ رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے دھماکے جاری تھے۔ ہم اٹھ کر دوسری گن پوزیشن

ر آئے۔ یہاں بھی دو گرنیڈ بنکر کے اندر ڈالے اور جتنی تیز دوڑ سکتے تھے پہلی گن پوزیشن ی طرف دوڑنے لگے۔ ہم ابھی آدھے راستے میں تھے کہ ایک بھیانک دھماکے نے ساری ہاڑی علاقے کو لرزا دیا۔ ہم زمین پر لیٹ گئے تھے۔ دوسری گن بھی صاف ہو گئی تھی۔ ب ہم پہلی گن پوزیشن میں آئے۔ اس کا بنکر بھی خالی پڑا تھا۔ روشنی راؤنڈ بار بار آسمان ر زمین کو روشن کر رہے تھے۔ ہمیں پہلی گن پوزیشن صاف نظر آ رہی تھی۔ ہم نے ں بنکر میں گرنیڈ پھینکے اور دوڑ کر ایک جھاڑی کے پاس زمین پر اوندھے ہو کر لیٹ گئے۔ ہاں کوئی دھماکہ نہ ہوا۔ میں نے اٹھتے ہوئے کمانڈو جہانگیر بٹ سے کہا۔

"یہاں سے نکل چلو۔ گرنیڈ نہیں چلے۔"

ہم اٹھے اور پہاڑی بکروں کی طرح ڈھلان کی جھاڑیوں میں چھوٹی چھوٹی چھلانگیں اتے نیچے اترنے لگے۔ ہم جھاڑیوں میں الجھ رہے تھے۔ گر رہے تھے مگر اترائی اترتے لے جا رہے تھے۔ چوتھی گن پوسٹ کی طرف روشنی راؤنڈ چھوڑے جا رہے تھے۔ مشین ن کی فائرنگ بھی برابر ہو رہی تھی۔ اتنے میں اوپر بڑا زبردست دھماکہ ہوا۔ ایک بجلی ا چمک گئی اور بنکر کی اینٹیں اور پتھر ہمارے آگے جا کر گرے۔ ہمارے دونوں گرنیڈوں نے کچھ دیر بعد بلاسٹ ہو کر ایمونیشن کے بکس اڑا دیئے تھے۔ ساتھ ہی گن پوسٹ بھی ڑ گئی تھی۔

اچانک چوتھی توپ گرج اٹھی۔ اس نے گولا باری شروع کر دی۔ مگر اس کے گولے ے اوپر سے گذر کر نیچے وادی اور پہاڑیوں پر گر کر پھٹ رہے تھے۔ ہم راستہ بدل کر ری طرف ہو گئے۔ کمانڈو جہانگیر بٹ آگے آگے تھا۔ پہاڑ کی ڈھلان سے اتر کر ہم ذرا ا لینے کے لئے ایک جگہ بیٹھ کر اوپر دیکھنے لگے۔ روشنی راؤنڈ فائر ہونا بند ہو گئے ۔ چوتھی توپ برابر تھوڑے وقفے کے ساتھ شیلنگ کر رہی تھی۔ اوپر چوٹی کے ے پہاڑی ڈھلان پر تین جگہوں سے جہاں گن پوزیشنیں تھیں وہاں سے ابھی تک ں اور شعلے اٹھ رہے تھے۔ چھوٹے اسلحہ کے پھٹنے کی آوازیں بھی گونج رہی تھیں۔ و جہانگیر بٹ نے کہا۔

"دوست! ایک گن پوزیشن تباہ ہونے سے بچ گئی"

میں نے کہا۔

"یہ گن اب یہاں نہیں رہے گی۔ اسے یہاں سے ہٹا دیا جائے گا۔ فکر نہ کرو"

تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد ہم نے وادی میں واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ جب ہم وادی سے نکل کر کھڈ میں اترنے لگے تو چوتھی توپ کی گولا باری رک گئی تھی۔

جب ہم کھڈ میں سے گزرتے ہوئے باہر نکلے تو پیچھے مڑ کر ایک نگاہ پہاڑ کی طرف ڈالی۔ تباہ شدہ توپوں کی تینوں پوزیشنوں میں موت کی خاموشی طاری تھی۔ ان میں سے دھواں ضرور اٹھ رہا ہو گا جو رات کی تاریکی میں ہمیں دکھائی نہ دیا۔ ہم اب بڑے اطمینان سے رات کی تاریکی میں چنار' چڑھ اور اخروٹ کے درختوں کے درمیان سے ہو کر اپنے چٹانوں والے خفیہ ٹھکانے کی طرف چلے جا رہے تھے۔ جس وقت ہم اپنے اڈے پر پہنچے تو کشمیری کمانڈو لیڈر شیروان نے اور ہمارے دوسرے کمانڈو مجاہدوں نے مسکراتے چہروں سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ ایک کشمیری مجاہد نے نعرہ لگایا۔

"ہم پہلا دھماکہ سن کر ہی باہر نکل آئے تھے دشمن کے روشنی راؤنڈ نے ان کی تباہی کے منظر کو نمایاں کر کے ہمیں دکھایا۔"

میں نے کہا۔

"ہمیں افسوس ہے کہ تیسری گن پوسٹ کو ہم تباہ نہ کر سکے۔ ہم سے ذرا سی غلطی ہو گئی بنکر کے باہر ایک فوجی گارڈ ڈیوٹی پر کھڑا تھا۔ ہم اندھیرے میں اسے دیکھ نہ سکے۔ اس نے برسٹ مارا تو ہمیں پیچھے ہٹنا پڑا۔"

کمانڈو شیروان نے بھی میری بات دہراتے ہوئے کہا۔

"یہ اکیلی گن وہاں سے ہٹالی جائے گی"

ایک کشمیری مجاہد نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہو سکتا ہے تباہ شدہ پوزیشنوں پر پھر سے گنیں نصب کر دی جائیں کمانڈو شیروان نے ہاتھ کا مکا بناتے ہوئے کہا۔

خدا کی قسم دشمن دس بار وہاں گنیں لگائے گا ہم دس بار اپنی جان کی بازی لگا کر انہیں تباہ کر دیں گے۔ تباہ کرتے رہیں گے"

ہم چٹان کے اندر جو قدرتی غار تھا وہاں بیٹھے تھے۔ غار کی فضا اللہ اکبر کے نعروں سے نج اٹھی۔

دوسرے روز ہم نے اپنی یہ کمیں گاہ بدل دی اور دیودار کے جنگل والی پہاڑیوں میں خفیہ ہائیڈ آؤٹ میں آ گئے۔ یہاں ہمارے کچھ کشمیری عسکریت پرست مجاہد پہلے سے د تھے۔ کمانڈو لیڈر شیروان ان کا کمانڈر تھا۔ یہ جگہ مقبوضہ کشمیر میں موجود بھارتی ی فورس کی مین سپلائی لائن والی سڑک سے زیادہ دور نہیں تھی۔ سری نگر شہر کے ان کشمیریوں پر بھارتی فوجی بے پناہ ظلم و ستم ڈھا رہے تھے۔ ذرا سے شک پر کشمیری انوں کے گھروں کو آگ لگا کر جلا دیا جاتا۔ فائرنگ کر کے نہتے شہریوں کو شہید کر دیا ۔ اس کے جواب میں ہمارے کشمیری حریت پرست مجاہد بھی گھات لگا کر بھارتی فوجیوں لے کر کے انہیں جہنم میں پہنچا رہے تھے۔ ہمارا کام اپنے حریت پرست کشمیری مجاہدین ذرا مختلف تھا۔ یہ مجاہد محاذ پر بلکہ میدان میں آکر آزادی کشمیر کی جنگ لڑ رہے تھے ب کہ ہم میدان جنگ کے پیچھے رہ کر دشمن کی فوجی تنصیبات کو تباہ کرتے۔ فوجی ڑیوں پر گھات لگا کر اٹیک کرتے اور ایمونیشن اور سپلائی کے ٹرکوں کو راکٹ لانچروں اڑا دیتے ہمارا ایکشن کمانڈو ایکشن تھا۔ ہمارا ایک کامیاب کمانڈو ایکشن دشمن کی فوج ایک بریگیڈ کی تباہی جتنا نقصان پہنچاتا تھا۔

نئی پناہ گاہ (ہائیڈ آؤٹ) میں آنے کے بعد کشمیری کمانڈو لیڈر اور ہمارا کمانڈو شیروان ، دوپہر کے وقت ایک خفیہ جگہ پر لے گیا۔ یہ جگہ ایک پہاڑی کے شگاف میں زمین د کر زمین کے نیچے تھی۔ یہاں کمانڈو ایکشن میں کام آنے والے نقشے' دور بینیں' اس اور ایک دو انتہائی سیکریٹ فائلیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان سیکرٹ فائلوں میں اپنے سوں کی فراہم کردہ رپورٹیں تھیں جن میں کشمیر میں موجود بھارتی فوجوں کی مختلف ٹوں کے کمانڈروں کے نام حلیے اور بعض کی تصویریں بھی تھیں۔ یہ ایک چھوٹی

سے کوٹھڑی تھی جس کی دیوار کے طاق میں بیٹری سے روشن ہونے والی ایک لالٹین روشن تھی۔ کمانڈو شیروان نے یہ لالٹین لکڑی کے بکس کے اوپر رکھ دی۔ اس بکس کے اردگرد چار سٹول پڑے تھے۔ ہم سٹولوں پر بیٹھ گئے۔ کمانڈو شیروان نے ایک نقشہ کھول کر بکس پر پھیلا دیا۔ یہ درمیانے سائز کا نقشہ تھا جو سفید کاغذ پر ہاتھ سے بنایا گیا تھا۔ اس پر جگہ جگہ نیلے اور سرخ رنگ کے نشان لگے تھے۔ کمانڈو شیروان نے نقشے پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیئے اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"میرے بھائی! یہ ہندوستان کی تین جنوبی ریاستوں کا نقشہ ہے۔ تامل ناڈو، راجستھان اور آندھرا پردیش کیا تمہیں بھارت کے ان صوبوں میں جانے کا کبھی اتفاق ہوا ہے؟"

میں نے کہا۔

"میں نے انکے نام ضرور سن رکھے ہیں مگر یہاں گیا کبھی نہیں"

کمانڈو شیروان نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھ کر کہا۔

"یہ بھارت کے شمال مغربی صوبے راجستھان کا ایک اہم مقام بلارا ہے----"

ابھی کمانڈو شیروان نے اپنا جملہ پورا نہیں کیا تھا کہ اچانک دو کشمیری کمانڈو اندر داخل ہوئے۔ ایک اٹن شن ہو کر رائفل لئے دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ دوسرا کشمیری زبان میں بڑے تیز تیز لہجے میں باتیں کرنے لگا۔ کمانڈو شیروان ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔

"میرے ساتھ آؤ"

ہم زیر زمین تہہ خانے سے جلدی جلدی باہر نکل آئے۔ کمانڈو شیروان نے اپنے باڈی گارڈ سے اردو میں پوچھا۔

"کمانڈو جہانگیر بٹ کہاں ہے؟"

اس نے سینے سے لگائی مشین گن پر زور سے ہاتھ مار کر کہا۔

"کمانڈو! جہانگیر بٹ پڑال کے مجاہدین کے مورچے میں ہی ہے"

میں نے کمانڈو شیروان سے پوچھا۔

"کیا بات ہوئی ہے کمانڈر؟"

اس وقت ہم اپنی ہائیڈ آؤٹ کے باہر چنار کے بہت بڑے درخت کے نیچے کھڑے ۔ کمانڈو شیروان نے غصے میں اس طرح سانس لیا کہ اس کے منہ سے پھنکار کی سی ز نکلی۔ کہنے لگا۔

"پڑال کے پہاڑی گاؤں میں بھارتی فوجیوں نے حملہ کر کے مکانوں کو نذر آتش کر دیا ہے۔ چار مجاہد شہید ہو گئے ہیں۔ بھارتی فوجی ایک کشمیری مجاہد اور گاؤں کی دو مسلمان لڑکیوں کو پکڑ کے لے گئے ہیں"

اتنے میں کمانڈو جہانگیر بٹ بھی آ گیا۔ کمانڈو شیروان نے اس سے پوچھا۔

"بھارتی فوجی ہماری لڑکیوں کو لے کر کہاں گئے ہیں؟"

جہانگیر بٹ کہنے لگا۔

"مجھے جو اطلاع ملی ہے اس کے مطابق سپاہی ہمارے ایک مجاہد اور گاؤں کی دو لڑکیوں کو اچھو ٹیکری والے فوجی کیمپ کی بیرکوں میں لے گئے ہیں"

کمانڈو شیروان کے چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں سے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔ نے اپنے جذبات کو بڑی مشکل سے دباتے ہوئے جہانگیر بٹ سے کہا۔

"اسی وقت اچھو ٹیکری والی بھارتی فوجی کیمپ کی بیرکوں میں جاؤ اور اپنے مجاہد اور دونوں لڑکیوں کو وہاں سے نکال کر لاؤ۔"

اس نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"تم اس کے ساتھ جاؤ گے۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو' جاؤ"

یہ کہہ کر کمانڈو لیڈر شیروان ہائیڈ آؤٹ کے اندر چلا گیا۔ جب میں اور کمانڈو جہانگیر ا تیاری کر کے ہائیڈ آؤٹ کے آگے سے گزرے تو ہمیں کشمیری کمانڈو لیڈر شیروان ندر سے آتی تیز تیز آواز سنائی دی۔ وہ ٹرانسمیٹر پر اپنی زبان میں کسی سے غصے میں بات

کر رہا تھا۔ ہم تقریباً دوڑتے ہوئے ہائیڈ آؤٹ کے آگے سے گذر گئے۔ جہانگیر بٹ نے بھارتی فوجی کیمپ کی بیرکیں دیکھی ہوئی تھیں۔ ہم ایک آسان پہاڑی راستے سے گذر کر آدھے گھنٹے کے اندر اندر اسی ٹیلے کے دامن میں پہنچ گئے جہاں یہ فوجی کیمپ تھا۔ ہم سامنے والے ٹیلے کے نشیب میں آ گئے۔ جہانگیر بٹ کا خیال تھا کہ یہاں نشیب میں کوئی مشین گن کا مورچہ ضرور ہو گا۔ ہم نے اچھی طرح دیکھا کی۔ وہاں کوئی مشین گن پوسٹ نہیں تھی۔ اصل میں یہاں بھارتی فوج کی زیادہ نفری نہیں تھی۔ یہ ایک طرح کا ٹرانزٹ کیمپ تھا۔ آمنے سامنے دو پکی بیرکیں تھیں۔ درمیان میں ایک طرف ایک فوجی ٹرک اور ایک جیپ کھڑی تھی۔ ایک سنتری ان کے قریب ہی پہرہ دے رہا تھا۔ ہمیں کشمیری مجاہد اور کشمیری لڑکیاں کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ میں نے جہانگیر بٹ سے پوچھا۔

"کہیں ہم غلط ٹارگٹ پر تو نہیں آ گئے؟"

جہانگیر بٹ نے کہا۔

"نہیں۔ ہمارے جاسوس نے گرفتار کشمیری مجاہد کی جیب کو اسی کیمپ میں جاتے دیکھا ہے۔ دونوں دیہاتی کشمیری لڑکیاں بھی اسی جیپ میں تھیں۔"

ہم جھاڑیوں کے پیچھے چلتے بیرکوں کے اوپر نشیب میں ایک ایسی جگہ پر آ گئے جہاں سے ہمیں کیمپ کے باہر مشین گن پوسٹ صاف نظر آئی۔ جہانگیر بٹ کہنے لگا۔

"میں بیرک کی دوسری طرف جا کر دیکھتا ہوں"

وہ جانے ہی لگا تھا کہ سامنے والی بیرک سے دو سنتری ایک کشمیری نوجوان اور لڑکیوں کو لے کر باہر نکلے۔ لڑکیوں کے ہاتھ کھلے تھے کشمیری مجاہد کے ہاتھ پیچھے بندھے تھے۔ جہانگیر بٹ نے آہستہ سے کہا

"یہ ہمارا مجاہد وانی ہے۔ لڑکیاں اس کے گاؤں کی ہیں۔ یہ انہیں کہاں لے جا رہے ہیں"

میری نظریں بھارتی فوجیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ قیدیوں کو سامنے والی بیرک لے گئے۔ جہانگیر بٹ نے مجھے اشارہ کیا۔ یہ اشارہ ایکدم سے اٹیک کرنے کا تھا۔ ہم

ہی سکیم بنائی تھی۔ کہ اچانک گرنیڈوں سے حملہ کر کے سٹین گنوں کے فائر کی بوچھاڑ کیمپ میں افراتفری پھیلائی جائے اور اپنے آدمیوں کو نکال کر لے جائیں۔ ہمارے بارہ بارہ گرنیڈ تھے۔ اچانک کیمپ میں دھماکہ ہوا۔ یہ مارٹر گولے کا دھماکہ تھا جو کیمپ عین درمیان میں ان فوجیوں پر گر کر پھٹا تھا جو بیرک سے باہر آ رہے تھے۔ ان کے نچے اڑ گئے۔ اس کے ساتھ ہی کیمپ پر مارٹر گولے برسنے لگے۔ اور پوسٹ تباہ ہو گئی گیر بٹ بولا۔

"ہمارے مجاہد سامنے والی ٹیکری پر پہنچ گئے ہیں یہ اچھا ہوا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے بھی گرنیڈ پھینکنے شروع کر دیئے۔ ہمارے پہلے دو گرنیڈ ن گن پوسٹ پر گر کر پھٹنے اور پوسٹ تباہ ہو گئی۔ بیرکوں میں سے بھارتی فوجی گولیاں رتے اور سٹین گنوں کی بوچھاڑ میں مارتے نکل آئے۔ مگر مجاہدین کی مارٹر گن کا فائر ل آ رہا تھا۔ انڈین فوجی فائرنگ کرتے عقبی بیرک کی طرف دوڑے۔ وہ ہماری زد میں ۔ ہم نے سٹین گن کے برسٹ فائر کر کے انہیں خاک اور خون میں نہلا دیا۔ سامنے لے ٹیلے کی جانب سے مجاہدین کے اللہ اکبر کے نعرے گونج اٹھے۔ اس کے ساتھ ہی ین کو ہم نے ٹیلے کی نشیب سے دوڑ دوڑ کر نیچے کیمپ کی طرف آتے دیکھا۔ اتنی دیر کیمپ کی انڈین فوج کی نفری نے پوزیشنیں سنبھال لیں تھیں۔ جب ہم نے ان پر پیچھے گولیاں برسانی شروع کر دیں تو وہ ایک دوسرے اوپر گرنے لگے۔

اب ہم بھی ڈھلان سے اتر کر کیمپ کی عقبی بیرک کی دیوار کی اوٹ میں آ گئے۔ ے کی جانب سے مجاہدین کی کمپنی بھی اللہ اکبر کے نعرے لگاتی نیچے آ گئی۔ اس کیمپ بھارتی فوج کی بہت تھوڑی نفری تھی۔ جتنے ڈوگرے سامنے آئے انہیں ختم کر دیا گیا۔ ر فرار ہو گئے ہوں تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کشمیری مجاہدین بھی ہم میں آ کر مل گئے۔ ے اپنے مجاہد اور دونوں لڑکیوں کو بیرک سے نکال کر آزاد کرا لیا۔ یہاں ایک بیرک میں کا تھوڑا سا ذخیرہ تھا۔ اسے اڑا دیا گیا۔ فوجی جیپ اور ٹرک میں بھی گرنیڈ رکھ کر تباہ کر دیا۔ کشمیری مجاہدین حریت پرست وانی اور دونوں کشمیری بیٹیوں کو ساتھ لے

کر اپنے محاذ کی طرف واپس چلے گئے۔ میں اور جہانگیر بٹ بھی وہاں سے اپنے ہائیڈ آؤٹ
کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ مشن ہماری توقع کے خلاف بڑی جلدی مکمل ہو گیا تھا۔
ہائیڈ آؤٹ میں جا کر کمانڈو لیڈر شیروان کو پوری رپورٹ دی تو وہ بہت خوش ہوا۔
کہنے لگا۔

"مجھے یقین تھا ہمارے آدمی کیمپ پر ضرور اٹیک کریں گے۔ ایسا ہی ہوا۔
بھارتی حکومت کو پتہ ہی نہیں کہ وہ جس کشمیری قوم کے حق خود ارادیت کو
کچلنا چاہتی ہے وہ اپنے وطن کی آزادی کے لئے پانچ سو سال سے جنگ لڑ رہی
ہے۔ آخر فتح کشمیریوں کی ہوگی۔"

اس رات کشمیری مجاہد لیڈر کمانڈو شیروان نے میرے ساتھ ایک بڑی اہم میٹنگ
کی۔ اسے میں نے اہم اس لئے کہا ہے کہ اس میٹنگ نے میری کمانڈو اور کمانڈو سپائنگ
کارگزاریوں کی ایک ایسی راہ متعین کی جس نے آگے چل کر نہ صرف کشمیریوں
جدوجہد آزادی کی تحریک کو بے پناہ تقویت دی بلکہ بھارتی ہائی کمانڈ کے ایوانوں کو بھی
کر رکھ دیا۔ اور ساری دنیا کے ممالک پر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ ہندوستان کی
حکومت نے کشمیری مسلمانوں کے حق خود ارادیت کو کچل کر اپنی فوج کی مدد سے کشمیر پر
غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے اور کشمیر کا بچہ بچہ اپنی آزادی کے لئے سر پر کفن باندھ کر میدان
جہاد میں نکل آیا ہے۔ اس اہم ترین میٹنگ کے بعد میری کمانڈو سپائینگ کارروائیوں نے
کشمیر میں متعین بھارتی فوجیوں کے مورال کو زبردست دھکا لگا۔ دوسری طرف کشمیری
مجاہدین کا مورال بلند ہوا اور انہیں آزادی کی منزل قریب نظر آنے لگی۔ لکھنے کو تو میں
نے بڑی آسانی سے لکھ دیا ہے مگر اس کے لئے مجھے کیسے کیسے ہمت شکن حالات سے
واسطہ پڑا اور کیسے کیسے نازک ترین مراحل سے گذرنا پڑا اور کشمیری مجاہدین کو کتنی
قربانیاں دینی پڑیں' یہ آپ کو آگے چل کر خود ہی معلوم ہو جائے گا جب میں اپنے کمانڈو
سپائینگ آپریشنز کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کروں گا۔ کشمیری لیڈر کمانڈو شیروان نے
عشاء کی نماز میرے ساتھ ہی پڑھی۔ عشاء کی نماز کے بعد ہم نے کھانا کھایا اور ہائیڈ آؤٹ

کے تہہ خانے میں آ گئے۔ پٹرال ٹیکری کے کمانڈو ایکشن سے پہلے ہم اس تہہ خانے میں
بیٹھے تھے اور کمانڈو شیروان انڈیا کے نقشے پر بھارتی صوبوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ میرا
خیال تھا کہ وہ دوبارا وہی نقشہ کھول کر انڈیا کے مختلف صوبوں کی بابت تفصیلات سے آگاہ
کرے گا۔ لیکن اس نے نقشے کی بجائے جیب سے ایک چھوٹی سے سبز رنگ کی پاکٹ بک
نکالی۔ بڑی احتیاط سے اس کے ورق الٹا کر کچھ پڑھتا رہا۔ پھر پاکٹ بک میز پر رکھ دی اور
آہستہ آہستہ میز پر انگلی بجانے لگا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔ میں اس کے سامنے
خاموش بیٹھا تھا۔ دیوار کے طاق میں بیٹری والی لالٹین روشن تھی۔
کمانڈو شیروان نے میز پر کہنیاں ٹکائیں۔ ذرا سا آگے کو جھکا اور میری طرف دیکھتے
ہوئے بولا۔

"جب دشمن ملک سے جنگ شروع ہو جاتی ہے تو ایک لڑائی تو اگلے
مورچوں پر ہوتی ہے۔ یہ لڑائی دونوں ملکوں کی زمینی فوجیں لڑتی ہیں۔ ایک
لڑائی مورچوں کے پیچھے بھی لڑی جاتی ہے۔ یہ لڑائی مورچوں کے پیچھے کمانڈوز
لڑتے ہیں۔ رات کے وقت تربیت یافتہ کمانڈو پارٹیاں اندھیرے میں دشمن کے
اگلے مورچوں کے بہت پیچھے جان کی بازی لگا کر جاتی ہیں۔ ان کا کام دشمن کے
ایمونیشن کے ذخیروں کو اڑانا' بہت پیچھے لگے ہیوی اور میڈیم توپ خانے کی
توپوں کو تباہ کرنا اور رات کے اندھیرے میں کیمو فلاج کر کے چھپائے ہوئے
ٹینکوں کو ہٹ کرنا اور انہیں برباد کرنا ہوتا ہے۔ ایسے مشن پر گئے ہوئے کمانڈو
اکثر زندہ واپس نہیں آتے۔ وہ اپنے ملک کی آبرو بچانے کے لئے اپنی جانیں
قربان کر دیتے ہیں لیکن دشمن کو اتنا زبردست نقصان پہنچاتے ہیں کہ آمنے
سامنے کی جنگ میں ایک ہزار فوجیوں کی نفری میں اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتی۔
لیکن ایک جنگ اس سے بھی پیچھے لڑی جاتی ہے۔ یہ تیسری جنگ دشمن کے
ملک میں جا کر اس کی ناک کے نیچے بیٹھ کر لڑی جاتی ہے۔ یہ تیسری جنگ سپاہی
یعنی جاسوس لڑتے ہیں۔ وہ دشمن کے گھر میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں اور اپنی

ذہانت اعلیٰ تربیت اور فولادی اعصاب کی مدد سے دشمن کی فوجوں کے ایسے اہم راز اپنے ہیڈ کوارٹر کو پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ جنگ کا نقشہ ہی پلٹ جاتا ہے اور بعض اوقات دشمن کو شکست بھی ہو جاتی ہے------"

چھوٹے سے سماوار میں سے گرم کشمیری قہوہ پیالیوں میں انڈیلتے ہوئے کمانڈو شیروان تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ وہ جو باتیں مجھے بتا رہا تھا مجھے نہ صرف ان باتوں کا بخوبی علم تھا بلکہ کمال شاہ اور گل خان نے مجھے اس کی ٹریننگ بھی دے رکھی تھی۔ کشمیری قہوے کا ایک گھونٹ پینے کے بعد کمانڈو شیروان نے پیالی میز پر رکھی اور بولا۔

"مجھے یقین ہے کہ جو باتیں میں نے بیان کی ہیں ان سے تم بخوبی واقف ہو اور میری اطلاع کے مطابق تم مورچوں کے پیچھے رات کے اندھیرے میں لڑی جانے والی کمانڈوز کی جنگ اور دشمن کے ملک میں اس کے گھر میں بیٹھ کر لڑی جانے والی خاموش جنگ کی ٹریننگ بھی لے چکے ہو۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ کمانڈر شیروان اٹھ کر تہہ خانے کے کچے فرش پر ٹہلنے لگا۔ پھر میز پر آکر بیٹھ گیا اور مجھ سے متوجہ ہو کر کچے فرش پر ٹہلنے لگا۔ پھر میز پر آکر بیٹھ گیا اور مجھ سے متوجہ ہو کر کہنے لگا۔

"کشمیر کا بچہ بچہ جوان بوڑھا اور خواتین بھارتی قابض فوج کے خلاف ایک طرح سے کمانڈو جنگ ہی لڑ رہا ہے۔ کیونکہ ہماری کوئی باقاعدہ فوج نہیں ہے۔ ہمارے کشمیری مجاہد دشمن کو بھی برباد کر رہے رہیں اور خود بھی شہید ہو رہے ہیں یوں ہم اپنے خون سے آزادی کے چراغ کو روشن رکھے ہوئے ہیں۔ اس کا مشاہدہ تم خود بھی کر چکے ہو۔ لیکن ہمارے پاس ایسے تربیت یافتہ کمانڈوز کی تعداد بہت کم ہے جو دشمن کے عقب میں جا کر اس کو کاری ضرب لگا سکیں۔ پھر بھی ہماری کمانڈو پارٹیاں دشمن کے فوجی کیمپوں اور فوجی کانوائیوں پر حملے کر کے انہیں بھاری نقصان پہنچاتی رہتی ہیں۔ لیکن ہمارے

پاس ایسے لوگ نہ ہونے کے برابر ہیں جو دشمن کے گھر میں اس کی ناک کے نیچے بیٹھ کر اس کی شہ رگ پر کاری ضرب لگائیں۔ جیسا کہ تم جانتے ہو یہ کام سپاہی یعنی تربیت یافتہ جاسوس کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی ایسا جاسوس ہو جو ٹرینڈ کمانڈو بھی ہو تو وہ دشمن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ سکتا ہے۔"

کشمیری کمانڈو شیروان ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گیا۔ میں اپنی قہوے کی پیالی خالی چکا تھا۔ کمانڈو شیروان نے اپنی پیالی کے ٹھنڈے قہوے کا ایک گھونٹ بھرا اور میری طرف دیکھ کر بڑے معنی خیز انداز میں مسکرایا اور پیالی میز پر رکھتے ہوئے بولا۔

"میرے دوست! یہ کام تم کر سکتے ہو۔ تم ایک ٹرینڈ کمانڈو بھی ہو اور ایکسپلوسویز اور انٹیلی جینس کے رموز سے بھی آگاہ ہو۔ تم نوجوان ہو۔ پڑھے لکھے ہو۔ انگریزی زبان پر تمہیں عبور حاصل ہے۔ تم جب انگریزی یا اردو میں بات کرتے ہو تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تم کشمیری ہو۔ جبکہ ہمارا کشمیری بھی اپنے لہجے سے صاف پہچان لیا جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے اس خاص صلاحیت سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے دشمن کو اس کے گھر کے اندر جا کر کاری ضرب لگائی جائے۔ اگرچہ یہ ایک انتہائی پر خطر اور نازک مشن ہو گا۔ قدم قدم پر جان کا خطرہ ہو گا۔ لیکن تمہارے جذبہ حریت تمہاری قابلیت اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ تم ناکام نہیں واپس آؤ گے۔"

اب میں نے اپنی زبان کھولی اور کہا۔

"کمانڈر! تم مجھے آڈر دو۔ میں تیار ہوں۔ مجھے حکم دو کہ کس طرح اسلام، پاکستان اور آزادی کشمیر کے جہاد میں کام آسکتا ہوں۔ میں اس مقصد کے لئے ہر قدم پر اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار ہوں"

کمانڈو لیڈر شیروان نے کہا۔

"بس ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ تمہیں ہر قدم پر جان قربان نہیں کرنی۔ تمہیں ہر قدم پر زندہ رہ کر اپنے مشن کو پورا کرنا ہے۔"

میں نے کہا۔

"کمانڈر! مجھے میرے مشن سے آگاہ کیا جائے۔ میں تمہیں اللہ کے فضل و کرم سے یقین دلاتا ہوں کہ تمہاری توقعات پر پورا اتروں گا"

اب کمانڈو لیڈر شیروان نے میز پر الٹی رکھی ہوئی پاکٹ بک اٹھائی اس کے کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر کو غور سے پڑھا اور پاکٹ بک بند کر کے مجھ سے مخاطب ہوا۔

"ہم کشمیری مجاہدین آزادی کشمیر کے محاذ پر بھارتی فوجوں کے ظلم و ستم کا پورے جذبے اور جوش کے ساتھ مقابلہ کر رہے ہیں۔ ہماری کوئی پروفیشنل فوج نہیں ہے۔ ہمارے پاس کہیں سے اسلحہ بھی نہیں آتا۔ ہم دشمن کے ایمونیشن ذخیروں پر شب خون مار کر اسی کا اسلحہ اس کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ہمیں محدود وسائل اور محدود نفری کے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ جبکہ دشمن کے پاس نہ جنگی میٹریل کی کمی ہے نہ فوج کی نفری کی۔ ہم اس کا ایک ایمونیشن ڈپو اڑاتے ہیں تو وہ اس کی جگہ دوسرا ایمونیشن ڈپو بنا لیتا ہے۔ اس کی دو گنیں برباد کرتے ہیں۔ ان کی جگہ وہ فوراً نئی گنیں لا کر کمی پوری کر لیتے ہے۔ ہم گھات لگا کر اس کے دس فوجی ہلاک کرتے ہیں تو ان کی جگہ فوراً دوسرے فوجی آجاتے ہیں۔ بھارتی ہائی کمانڈ کے پاس کشمیر میں مروانے کے لئے فوجوں کی کمی نہیں ہے۔ ہندوستان کی ساری فوج کو نہ تم تباہ کر سکتے ہو نہ میں اکیلا تباہ کر سکتا ہوں۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کے دماغ کے اعصابی مرکز پر ضرب لگائی جائے جو کشمیر کے فوجی معاملات کو کنٹرول کرتا ہے۔ اسے بوکھلا دیا جائے۔ اس کو ہر مومنٹ پر نگاہ رکھتے ہوئے اسے سبوتاژ کیا جائے یوں کشمیر کے محاذ پر جو بھارتی فوج ڈیپلائے ہے اس کا مورال تباہ ہو گا اور آزادی کشمیر کی تحریک کو نئی طاقت ملے

گی۔ اس کا مورال مزید بلند ہو گا"

میں بڑے غور سے کشمیری لیڈر کمانڈو شیروان کا ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔ میں نے

ما۔

"سر! حکم کرو مجھے کیا کرنا ہو گا"

میں اس وقت ایکٹو کمانڈو کی حیثیت سے بول رہا تھا۔ کمانڈو شیروان کہنے لگا۔

"یہ میں نے تمہید باندھی تھی۔ اب میں اصل بات کی طرف آتا ہوں۔ تم نے شاید را کا نام نہیں سنا۔ یا شاید سنا ہو۔"

حقیقت یہ ہے کہ میرے لئے یہ نام بالکل اجنبی تھا۔ ان دنوں ہندوستان میں اندرا ندھی کی حکومت تھی اور بھارت کی خفیہ ایجنسی را (RAW) کا نیا نیا قیام عمل میں آیا تھا راس خفیہ ادارے نے بیرونی ممالک خاص طور پر کشمیر افیئرز اور پاکستان کے بارے میں ں انتہائی خفیہ رپورٹوں کے ذریعے اپنے ملک کے واسطے اہم کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ ں ساری باتوں کا علم مجھے بعد میں ہوا۔ کمانڈو لیڈر شیروان بولا۔

"بھارت کی مرکزی حکومت کے مختلف خفیہ ادارے ہیں۔ مثال کے طور پر انٹیلی جینس بیورو (آئی بی) انٹرنل سیکورٹی اور نیشنل سیکورٹی گارڈ جو وی آئی پی کی حفاظت کا ذمہ دار ہے۔ باڈر سیکورٹی فورس (بی ایس ایف) اور سپیشل برانچ (سی آئی ڈی) یہ محکمے وزارت داخلہ کے ماتحت ہیں۔ ان کے علاوہ وزارت خزانہ کے خفیہ ادارے ڈی آر آئی اور این آئی بی ہیں۔ ملٹری انٹیلی جینس، میری ٹائم انٹیلی جینس اور ایئر فورس انٹیلی جینس وزارت دفاع کے ماتحت ہیں۔ لیکن را کا خفیہ ادارہ براہ راست وزیر اعظم اندرا گاندھی کے ماتحت ہے اور اس کا ہیڈ آفس کیبنٹ سیکرٹریٹ میں ہے۔ را مخفف ہے ریسرچ اینڈ انیلیسز ونگ کا۔ یہ خفیہ ادارہ بھارتی حکومت کا اعصابی مرکز ہے۔ یہ ادارہ حکومت کو ہر قسم کی ملکی اور غیر ملکی سرگرمیوں کی رپورٹیں مہیا کرتا ہے اور ان رپورٹوں کی روشنی میں دشمن ملک کے اندر دہشت گردی اور تخریب

کاری کے پروگرام تیار کئے جاتے ہیں۔ کشمیر میں را کی سرگرمیاں بہت محدود ہیں کیونکہ یہاں بھارت اپنے فوجی یونٹ دھڑا دھڑ جھونک رہا ہے۔ اور دہشت گردی اور تخریب کاری کا سارا کام بھارتی فوج انجام دے رہی ہے۔ جس کا مقابلہ کشمیری مجاہد اپنی جانوں کا نذرانہ دے کر ہر محاذ پر کر رہے ہیں۔ اس وقت کشمیر کے ہر محاذ پر ہم مجاہدین کا غلبہ ہے اور انڈین فوج کو ہماری گوریلا سرگرمیاں زبردست نقصان پہنچا رہی ہیں۔ ہماری اطلاعات کے مطابق بھارتی حکومت نے را (RAW) کے تعاون سے پاکستان میں دہشت گردی اور تخریب کاری کا ایک بڑا لمبا اور خطرناک پروگرام وضع کیا ہے بلکہ پاکستان کئی شہروں میں را کے بھیجے ہوئے خفیہ دہشت گردوں نے اپنی تخریبی کاروائیاں شروع بھی کردی ہیں۔ اس سے بھارتی حکومت کا مقصد پاکستان کے سیاسی اور اقتصادی استحکام کو نقصان پہنچانا ہے۔ دوسرے انڈیا کی حکومت یہ سمجھ رہی ہے کہ پاکستان کشمیری مجاہدین کی مدد کرتا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط بات ہے تم نے خود دیکھ لیا ہے کہ ہم اپنی آزادی کی جنگ اپنے محدود وسائل میں رہ کر خود ہی لڑ رہے ہیں۔ ہمارے پاس جو اسلحہ ہے وہ دشمن کے ایمونیشن کے ذخیروں سے چھینا ہوا اسلحہ ہے۔ ہم دشمن کی گولیاں اس کے سینے میں اتار رہے ہیں۔"

کمانڈو شیروان ایک لمحے کے لئے چپ ہو گیا۔ میں بھی پوری توجہ اور خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا جو میرے لئے انتہائی اہم اور بالکل نئی ہیں۔ شیروان کہنے لگا۔

"کشمیر ایفئرز کے بارے میں بھارتی فوجی ہائی کمانڈ کو بھی یہی خفیہ ادارہ "را" ہی تمام تر خفیہ معلومات مہیا کر رہا ہے اور ان معلومات کو سامنے رکھ کر کشمیر میں بھارتی فوجی یونٹ بھیجے اور ڈیپلائے کئے جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھارتی دارالحکومت دلی میں بیٹھ کر کسی طرح اس خفیہ ادارے تک رسائی حاصل کرو اور کشمیر میں انڈین یونٹوں کی سرگرمیوں کے بارے میں ہمیں پوری پوری معلومات دو۔ یہ معلومات تم ریڈیو ٹرانسمیٹر کے ذریعے خفیہ

کوڈ میں ہم تک پہنچا دو گے۔"

میں نے کمانڈو شیروان سے پوچھا۔

"کیا مجھے دلی پہنچ کر گل خان سے رابطہ قائم کرنا ہو گا؟"

کمانڈو شیروان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ گل خان نے تمہیں جتنا کچھ بتانا تھا بتا چکا ہے۔ اب تم ایک دوسرے آدمی سے ملو گے۔ اس آدمی کا تعلق نہ پاکستان سے ہے اور نہ وہ انڈیا کا کوئی پیشہ ور جاسوس ہے۔ یہ شخص بھارت میں رہنے والا دوسرے مسلمانوں کی طرح ایک مسلمان ہے۔ بھارت میں بسنے والے دوسرے کروڑوں مسلمانوں کی طرح اس کے سینے میں بھی اسلام کی شمع روشن ہے اور وہ مخالف ہواؤں کے تھپیڑوں میں بھی اس چراغ کو روشن رکھے ہوئے ہے۔ تم اس آدمی کو جا کر ملو گے۔"

"یہ مرد مجاہد مجھے کہاں ملے گا؟"

میرے اس سوال کے جواب میں کمانڈو شیروان نے مجھے اس بھارتی مسلمان کا نام ایڈریس بتایا جو میں ظاہر نہیں کروں گا۔ میں اس کا فرضی نام شیر علی رکھ لیتا ہوں۔ نڈو شیروان نے کہا کہ شیر علی انگریزوں کے زمانے کی ہندوستانی فوج کی سگنل کور میں چکا ہے اور سگنلز کے خفیہ کوڈ سائیفر اور ڈی سائیفر کرنے میں ماہر ہے۔ شیروان نے کہ شیر علی علی گڑھ ہندوستان میں ہی پیدا ہوا تھا اور علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی سے نے سائنس کے مضامین کے ساتھ گیارہ بارہ جماعتیں پاس کی تھیں۔ کمانڈو شیروان بتایا کہ شیر علی نے نئی دلی کے بارہ کھمبے کے علاقے میں ایک فیشن ایبل ریستوران ل رکھا ہے۔ اس نے مجھے ریستوران کا نام بھی بتایا جو میں یہاں نہیں لکھوں گا۔

"تم دہلی جا کر شیر علی سے ملو گے۔ وہ تمہیں خود بتائے گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے اور وہ تمہارے لئے کیا کر سکتا ہے۔ جس روز تم یہاں سے دلی کے لئے روانہ ہو گے میں اسے خفیہ کوڈ میں وائرلیس پر تمہارا نام اور تمہاری روانگی کی

اطلاع کر دوں گا۔ تمہیں ایک خاص خفیہ جملہ بھی بتاؤں گا جو تم اس کے آگے جا کر بولو گے جس کے جواب میں وہ بھی ایک خاص جملہ بولے گا۔ بہرحال ابھی تمہیں میر صاحب کے پاس کم از کم تین ماہ رہ کر ہندوستان کے مختلف صوبوں' ان کے کلچر اور خاص طور پر ہندو دیو مالا اور سنسکرت زبان کے بارے میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنی ہو گی۔ میں کل ہی تمہیں میر صاحب کے پاس پہنچا دوں گا"۔

مجھے بڑی ذمے داری کا کام سونپا جا رہا تھا۔ یہ کام ایسا تھا کہ جہاں ہر قدم پر خطرات کا سامنا تھا۔ کمانڈو ایکشن میں تو ایک خاص مشن پر جانا ہوتا ہے جو زیادہ سے زیادہ چار چھ گھنٹوں میں مکمل ہو جاتا ہے۔ آدمی یا کامیاب لوٹتا ہے یا وہیں شہید ہو جاتا ہے لیکن جو مشن کمانڈو شیروان میرے سپرد کر رہا تھا وہ ایک مسلسل کمانڈو سپائینگ کا مشن تھا۔ اس مشن میں دشمن کے گھر میں جا کر بیٹھ جانا تھا اور واپس نہیں آنا تھا اور وہاں اپنے آپ کو زندہ رکھ کر دشمن کے ناپاک عزائم کے بارے میں مکمل خفیہ رپورٹیں حاصل کر کے انہیں مجاہدین تک پہنچانا تھا۔ یہ کمانڈو سپائینگ کا مشن حقیقت میں میرے مزاج کے عین مطابق تھا۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ اسلام اور جہاد کشمیر کے لئے کوئی ایسا کام کروں جو پہلے کسی نے نہ کیا ہو اور جس میں مجھے جان کی بازی لگانی پڑے۔ میں خوش تھا کہ آخر مجھے میری مرضی کا ایک مشن مل گیا ہے۔ اس طرح میں اسلام پاکستان اور جہاد کشمیر کو تقویت پہنچانے کے لئے حیرت انگیز کارنامے سرانجام دے سکتا تھا۔

دوسرے دن کمانڈو شیروان نے مجھے کشمیر کے دور دراز ایک پہاڑی مقام پر پہنچا دیا۔ یہاں لکڑی کے ایک جھونپڑے میں میر صاحب سادہ اور عبادت گزاری کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کا رنگ سرخ و سفید تھا۔ سفید داڑھی تھی۔ سادہ سے کشمیری فرن میں ملبوس تھے۔ جس وقت میں اپنے گائیڈ کے ہمراہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ نماز پڑھنے کے بعد تسبیح پڑھ رہے تھے۔ گائیڈ نے مجھے دوسرے کمرے میں بٹھا دیا اور خود میر صاحب کے پاس جا کر انہیں سب کچھ گوش گذار کر دیا۔

قصہ مختصر میر صاحب نے میری تعلیمی ٹریننگ شروع کر دی۔ میر صاحب سنسکرت اور فارسی کے عالم فاضل تھے۔ انہیں ہندو کلچر ہندو دیو مالا اور ہندو مذہب کے مختلف فرقوں کی تاریخ پر پورا عبور حاصل تھا۔ انہوں نے مجھے سب سے پہلے سنسکرت زبان کی ابتدائی تاریخ سے آگاہ کیا اور بتایا کہ یہ زبان ہندوستان کے ہندوؤں کی زبان نہیں ہے بلکہ وسطی ایشیاء سے جو آریا لوگ یہاں آئے تھے اور پھر یہاں سے مختلف شاخوں میں تقسیم ہو کر ایران یورپ کی طرف چلے گئے تھے سنسکرت ان کی زبان تھی۔ انہوں نے مجھے سنسکرت کے وہ الفاظ بتائے جو ہماری پنجابی زبان' ایران والوں کی فارسی زبان اور یورپ کی دوسری زبانوں میں کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔ میر صاحب نے مجھے بتایا کہ جب آریا قبیلے کے لوگ جو چوڑے قد کاٹھ کے اور سرخ و سفید تھے وسط ایشیا کے میدانوں سے اتر کر ہندوستان کے شمال میں آئے تو یہاں دراوڑ قوم کے لوگوں کی حکومت تھی جو چھوٹے قد کے تھے اور جن کا رنگ سیاہ تھا۔ آریاؤں نے انہیں شکست دی اور وہ لوگ ہندوستان کے جنوب کی طرف بھاگ گئے۔ جو شمالی علاقوں میں رہ گئے انہوں نے گورے چٹے آریاؤں کی اطاعت قبول کر لی۔ میر صاحب نے فرمایا۔

"دراوڑ قوم کی اپنی زبان تھی۔ آج کل جو ہندی زبان ہندوستان کے برہمن ہندو بولتے ہیں وہ سنسکرت اور دراوڑی زبان کی ملی جلی زبان ہے۔"

میر صاحب نے مجھے ہندو دیوی دیوتاؤں کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ یہ وہ علم تھا جو آگے چل کر میرے بڑے کام آنے والا تھا۔ کیونکہ مجھے ایک پڑھا لکھا اور ہندو بن کر ہندو معاشرے میں رہنا تھا۔ میر صاحب نے مجھے ہندوستان کے صوبوں آندھرا پردیش' تامل ناڈو' مہاراشٹر' گجرات کاٹھیاوار' مدھیہ پردیش' کرناٹک وغیرہ کے بارے میں بھی بہت کچھ معلومات بتائیں۔ انہوں نے مجھے بدھ مت جین مت کبیر پنتھ اور برہمن ازم کے بارے میں بھی بتایا کہ ہندوؤں کے یہ مذہبی فرقے کن کن صوبوں میں زیادہ آباد ہیں۔ کس صوبے میں کس ہندو دیوتا کی پوجا ہوتی ہے۔ ویدوں کی کتابوں کے بارے میں میر صاحب نے فرمایا۔

"ہندوؤں کے بلکہ آریا ہندوؤں کے چار وید ہیں رگ وید' یجروید' سام وید' اتھرو وید آگے ان کی چار شاخیں ہیں اور شرحیں ہیں جو اپنشد کہلاتی ہیں۔ ان میں کائنات کی ابتدا کیسے ہوئی۔ انسان کہاں سے آیا۔ اسے کہاں جانا ہے اور دیوی دیوتاؤں کے تعریفی اشعار' عقل وشعور کی باتوں کے علاوہ جادو ٹونے اور منتر وغیرہ کی بھرمار ہے۔ ہندوستان میں اب ویدوں کو کوئی نہیں پڑھتا۔ صرف گیتا پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے جو مہا بھارت کی جنگ میں کرشن کی ایک چھوٹی سی تقریر ہے۔ اسے تم خود پڑھ لینا۔ دلی میں تمہیں اس کا انگریزی ترجمہ مل جائے گا۔ ہندو تہذیب اس وقت مختلف فرقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ہزاروں دیوی دیوتاؤں بتوں' جانوروں' سانپوں' بندروں اور پہاڑوں' درختوں دریاؤں کی پوجا ہوتی ہے۔ ہندو ازم کوئی خاص ایک مذہب نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک کلچر ہے۔ دیو مالا ہے۔ ہندو دیوی اور دیوتاؤں کے معاملے میں ایک دوسرے سے ہزاروں اختلاف رکھتے ہوں مگر مسلمان اور اسلام دشمنی میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ ایک بات ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھنا کہ ہندو نے پاکستان کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ جس روز پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا ہندو قوم اسی روز سے پاکستان کو ختم کرنے کی ناپاک کوششوں میں لگی ہوئی ہے------"

میں تین ماہ میر صاحب کے پاس رہا۔ جب واپس کمانڈر شیروان کے پاس آیا تو ہندو ازم اور ہندو قوم کی ذہنیت اور اس کی دیوی دیوتاؤں کی دیومالا کے بارے میں اتنی معلومات حاصل کر چکا تھا کہ خود کمانڈر شیروان کو بھی معلوم نہیں تھا۔

اب میں اپنے سیکرٹ اور خطرناک اور طویل مشن پر روانہ ہونے کے لئے بالکل تیار تھا۔ شیروان نے مجھے وہ کوڈ الفاظ بتائے اور یاد کرائے جو مجھے نئی دلی میں شیر علی کے فیشن ایبل ریستوران میں اس کے سامنے بولنے تھے اور ان کے جواب میں اس سے کوڈ الفاظ معلوم کرنے تھے۔ پندرہ کے پندرہ اسپرو کی ٹکیاں والے ٹیبلٹ بم' ان بموں کا کوڈ ورڈ میں لکھا ہوا نسخہ اور سیکرٹ پولیس خفیہ نمبر والا کارڈ میرے پاس ہی تھا۔ شیروان نے سر

ر کی دوائی اسپرو کی گولیوں کا نیا پتا منگوا کر اس میں سے اسپرو کی گولیاں نکال کر ان کی ۔ اسپرو بم والی گولیاں بڑی مہارت کے ساتھ لگا دیں۔ اسپرو کے پلاسٹک کے پتے یعنی ے کو تہہ کر کے مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"اسے عام اسپرو کی گولیوں کے پتے کی طرح اپنی جیب میں رکھنا۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ میرے آدھے سر میں کبھی کبھی درد ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ میں اسپرو کی ایک گولی کھا لیا کروں۔ ان ٹیبلٹ بموں کے تیار کرنے کا جو نسخہ ہے اس کو تہہ کر کے اپنی جیکٹ کی اندر والی جیب میں خفیہ پولیس کے خاص نمبر والے کارڈ کے ساتھ ہی رکھ لو۔ تمہیں اب کسی کمانڈو چاقو اور پستول وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا آدمی تمہیں بس سٹینڈ تک چھوڑنے تمہارے ساتھ جائے گا۔ آگے تم خود سفر کرو گے۔ ہاں ایک بات کا خاص خیال رکھنا۔ دلی پہنچنے کے بعد خود گل خان سے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ ہاں کسی مشکل میں پھنس جاؤ تو اس سے مدد حاصل کر سکتے ہو۔ کیونکہ اب تم جس مشن پر جا رہے ہو اس کی راہ نمائی شیر علی کرے گا۔"

اس کے بعد کمانڈو شیروان نے مجھے اپنے بٹوے میں سے شیر علی کی ایک تصویر نکال دکھائی جو پاسپورٹ سائز کی تھی۔ یہ ایک ادھیڑ عمر آدمی کی تصویر تھی جس کے نقش کھے اور آنکھیں بڑی چمک دار تھیں۔ داڑھی مونچھ غائب تھی۔ سر کے بال سفید ہو ہے تھے۔

"یہ ہمارے مرد مجاہد شیر علی کی تصویر ہے۔ یہ حیرت انگیز خوبیوں والا آدمی ہے۔ یہ تمہیں وہاں جا کر معلوم ہو جائے گا۔ اس کی شکل اپنے ذہن میں بٹھا لو۔"

پھر شیروان نے مجھے شیر علی کے نئی دلی والے فیشن ایبل ریستوران کا نام بتایا اور ہاں سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میں آج رات شیر علی کو وائرلیس پر تمہارے بارے میں پیغام پہنچا دوں

گا۔ تمہاری روانگی کی تاریخ کل طے ہو گی۔"

اس کے ساتھ ہی ہم تہہ خانے سے باہر آگئے۔ باہر آئے تو پتہ چلا کہ برف گر رہی
تھی۔ معلوم ہوا کہ برف آدھی رات کے بعد گرنا شروع ہوئی تھی۔ ہم سو گئے۔ صبح اٹھے
برف گرنا بند ہو گئی تھی۔ سردی بہت شدید تھی۔ کیونکہ سرد ہوا چلنے لگی تھی۔ میں نے
ناشتہ کمانڈو شیروان کے ساتھ غار میں ہی کیا۔ وہ کہنے لگا۔

"نیچے میدانوں میں اتنی سردی نہیں ہو گی جتنی یہاں کشمیر کی وادی میں
ہے۔ پھر بھی جیکٹ کے نیچے بند گلے والا سویٹر پہن لینا۔"

اس وقت دن کے نو بج رہے تھے۔ اتنے میں میرا گائیڈ آگیا۔ وہ بھی کشمیری مجاہد تھا
مگر عام کپڑوں میں تھا۔ میں چلنے لگا تو کمانڈو شیروان مجھے گلے لگا کر ملا۔

"اب تمہیں اللہ کے سپرد کیا۔ تمہارے دلی پہنچنے کی خبر مجھے مل جائے
گی۔ تم ایک ایسی جنگ لڑنے جا رہے ہو جو تمہیں دشمن کے مورچے میں بیٹھ
کر لڑنی ہو گی۔ خدا تمہیں کامیاب کرے۔ لیکن یاد رکھو خدا بھی ان کی مدد کرتا
ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ خدا حافظ!"

اتنا کہہ کر کمانڈو شیروان غار کے اندر چلا گیا۔

میں اپنے گائیڈ کے ساتھ بس سٹینڈ کی طرف چل پڑا۔ پہاڑی راستے برف میں چھپ
گئے تھے۔ یخ بستہ ہوا چل رہی تھی۔ ہم کافی لمبا پہاڑی سفر طے کر کے شہر کے لاری اڈے
پر آگئے۔ یہاں گائیڈ مجھ سے جدا ہو گیا۔ ایک بس جموں جانے کے لئے تیار کھڑی تھی
میں اس میں سوار ہو گیا۔ دس سوا دس بجے بس اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔

میرا لباس ایک عام پڑھے لکھے ہندو نوجوان جیسا تھا۔ گرم پتلون' جوگر کے شوز بند
گلے کے سویٹر کے اوپر گرم جیکٹ۔ سامان کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی بریف کیس تک نہیں
تھا۔ کمانڈو کبھی سامان کے ساتھ سفر نہیں کرتے۔ کیونکہ جب وہ اپنے مشن پر روانہ ہوتے
ہیں تو کچھ پتہ نہیں ہوتا سفر کے کس موڑ پر حالات کیا رخ اختیار کر لیں او میں اچانک
کس طرف بھاگنا پڑے۔ ایک دن اور ایک رات کے سفر کے بعد میں اگلے روز صبح

شہر پہنچ گیا۔ راستے میں کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ ایک پڑھے لکھے ہندو نوجوان سے
میں بات چیت جاری رہی۔ راشٹریہ سیوک سنگ پارٹی کا ان دنوں انڈیا میں بڑا زور
میں بڑھ چڑھ کر اس متعصب ہندو جماعت کے حق میں اور مسلمانوں کے خلاف بولتا
جموں توی کے سٹیشن پر آیا تو گاڑی ابھی تیار نہیں ہوئی تھی ایک گھنٹہ ویٹنگ روم
بیٹھا اخبار وغیرہ دیکھتا اور چائے پیتا رہا۔ آخری گاڑی پلیٹ فارم پر آکر لگ گئی۔ میرے
انٹر کلاس کا دلی تک کا ٹکٹ تھا۔ ابھی انڈیا کی ریل گاڑیوں میں انٹر کلاس موجود تھی۔
میں یہ کلاس ختم کر دی گئی۔ ٹھیک وقت پر گاڑی دلی کی طرف چل پڑی۔

ٹرین مشرقی پنجاب کے میدانی علاقوں میں آئی تو سردی کی وہ شدت ختم ہو گئی جو اور
کشمیر کی پہاڑیوں میں تھی۔ کشمیر کی پہاڑیوں میں تو برفباری ہو رہی تھی۔ مگر نیچے میدانوں
میں سردی کم از کم مجھے خوشگوار لگ رہی تھی۔ جالندھر پہنچ کر معلوم ہوا کہ مجھے دلی کے
لئے گاڑی بدلنی پڑے گی۔ یہاں مجھے ایک گھنٹہ رکنا پڑا۔ یہ عرصہ میں نے پوری طرح
چوکس رہ کر گذارا۔ کیونکہ یہاں خفیہ پولیس میرا پیچھا کر چکی تھی۔ اگرچہ میرے پاس
ترپ کا پتا یعنی سنٹرل سیکرٹ پولیس کا خفیہ نمبروالا کارڈ موجود تھا۔ پھر بھی مجھے کافی ہوشیار
رہنا پڑا۔ کیونکہ یہ خفیہ کارڈ میں کسی خاص موقع پر کام میں لانا چاہتا تھا۔ دوسری بات یہ
تھی کہ یہ خفیہ نمبروالا کارڈ اگر مجھے کسی بھاری مصیبت سے بچا سکتا تھا تو کسی اس سے بھی
زیادہ بھاری مصیبت میں پھنسا بھی سکتا تھا۔ مثال کے طور پر اگر اس بات پر کوئی پولیس
اہل کار ذرا سی بھی تفتیش کرتا کہ یہ کارڈ میرے پاس کہاں سے آگیا ہے تو میرا بھانڈا
پھوٹ سکتا تھا۔ یہ کارڈ تو رواں روی میں میرے کام آسکتا تھا کہ میں گاڑی میں بیٹھا ہوا
گاڑی کو پولیس کی ناکہ بندی نے روک لیا ہے۔ میں کارڈ دکھاؤں اور گذر جاؤں۔ لیکن
اگر کسی جگہ میں پکڑا جاتا ہوں اور یہ کارڈ دکھاتا ہوں تو مجھ سے پوچھ گچھ ہو سکتی تھی کہ
کارڈ میرے پاس کیسے آگیا ہے؟

بہرحال ایک گھنٹہ گذر گیا۔

میں دوسری گاڑی میں بیٹھ گیا اور گاڑی دلی کی طرف روانہ ہو گئی۔ دلی تک کوئی

خوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ یہ کوئی رات کے آٹھ سوا آٹھ بجے کا وقت ہو گا جب گاڑی
بھارت کے دارالحکومت دلی کے سٹیشن میں داخل ہوئی۔ اس شہر میں پہلے بھی آچکا
تھا۔ مرد مجاہد گل خاں نے مجھے اسی شہر میں دھماکہ خیز یعنی ایکسپلوزیو کی تربیت دی تھی۔
کمانڈو ٹریننگ کے جو سبق باقی رہ گئے تھے وہ بھی گل خان کی زیر ہدایت میں نے پورے
کر لئے تھے۔ مگر کشمیری کمانڈو شیروان نے مجھے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ میں سوائے
انتہائی اہم ضرورت کے گل خان سے ملنے سے گریز کروں۔ شیر علی کے ریستوران کا نام
اور اس کا ایڈریس میرے پاس موجود تھا۔ میں نے دلی سٹیشن سے نکلتے ہی ٹیکسی لی اور
اسے نئی دلی کے علاقے بارہ کھمبے چلنے کا کہا۔ دلی شہر روشنیوں میں نہا رہا تھا۔ سڑکوں پر
بہت زیادہ ٹریفک تھی۔ نئی دلی کے علاقہ شہر کا ماڈرن اور فیشن ایبل علاقہ ہے۔ یہاں ایک
جگہ دائرے کی شکل میں بہت سی دکانیں اور سٹور ہیں۔ ان دکانوں کے آگے دائرے کی
شکل میں چھت والا فٹ پاتھ بنا ہوا ہے جہاں کتنے ہی ستون لگے ہیں۔ یہی بارہ کھمبے کا علاقہ
تھا۔ یہاں میں پہلے بھی گل خان کے ساتھ ایک دوبار آچکا تھا۔

ٹیکسی میں نے چھوڑ دی اور شیر علی کے ریستوران کی تلاش شروع کر دی۔ ایک
جگہ نیون سائن میں لکھے ہوئے کافی شاپ کے انگریزی الفاظ جگ مگ کر رہے تھے۔ یہی
شیر علی کے ریستوران کا نام تھا۔ یعنی کافی شاپ۔ اس ریستوران کا اصلی نام میں نے چھپا
لیا ہے۔ اصلی نام کچھ اور تھا۔ مگر اب اگر میں اصلی نام بھی لکھ دوں تو کوئی فرق نہیں
پڑے گا کیونکہ اب وہاں نہ شیر علی ہے اور نہ اس کا ریستوران ہی باقی ہے۔

ریستوران کے باہر دروازے میں دلی کی مشہور قطب صاحب کی لاٹھ کا چھوٹا ماڈل
شیشے کے بکس میں میں سجا ہوا تھا۔ اندر ٹیوب لائٹ روشن تھی۔ دروازہ شیشے کا تھا۔ میں
ریستوران میں داخل ہو گیا فرش پر سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ جا بجا رات کے کھانے کی
میزیں لگی تھیں جہاں عورتیں مرد بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ فضا میں بانسری کے دھیمے
سر موسیقی کا جادو جگا رہے تھے۔ عورتیں ساڑھیوں میں ملبوس تھیں۔ نوجوان لڑکیوں نے
بھرپور میک اپ کیا ہوا تھا اور بالوں میں پھولوں کے گجرے لگائے ہوئے تھے۔ کئی لڑکیوں

نے گھٹنوں سے پھٹی ہوئی جینز پہن رکھی تھیں۔ باہر سردی تھی مگر ریستوران کی فضا
پھولوں اور مختلف قیمتی پرفیومز کی مہک کے ساتھ ہلکی ہلکی گرماہش بھی تھی۔ جس نے
بڑا خوشگوار اثر ڈالا۔

ایک باوردی نوجوان ویٹر میری طرف بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کے مینو کا
تھا۔ اس نے مجھ سے میرے ٹیبل کا نمبر پوچھا۔ میں نے اسے انگریزی میں کہا کہ
ریستوران کے مالک سے ملنا ہے۔ کمانڈو ٹریننگ اور کمانڈ سپائینگ کی بریفنگ کے دو
یہ بات خاص طور پر میرے ذہن نشین کر دی گئی تھی کہ میں انڈیا کے اپر کلاس یا اپر
کلاس کے لوگوں میں خاص طور پر انگریزی میں بات کروں۔ کیونکہ انڈیا میں انگریزی
ورسوخ زیادہ ہے۔ چنانچہ میرے انگریزی بات کرنے پر ویٹر نے سر کو ذرا سا جھکا کر
سر کہا اور مجھے اپنے ساتھ ایک راہ داری میں لے گیا۔ راہ داری میں بھی سرخ قالین
ہوا تھا۔ وہ ایک دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس دروازے کے باہر مائیکرو فون
باکس لگا تھا۔ اس نے بٹن دبا کر انگریزی میں ہی کہا کہ سر ایک صاحب آپ سے ملنا چا
ہیں۔ سپیکر پر دھیمی سی آواز آئی۔

"کون ہیں یہ صاحب؟ کہاں سے آئے ہیں؟"

میں نے ویٹر کو جواب دینے کی بجائے مائیک کے قریب منہ لے جا کر کہا۔

"سر! میں آندھرا پردیش سے آیا ہوں۔ مجھے کاروباری سلسلے میں شیر علی
صاحب سے ملنا ہے"

"انہیں اندر بھیج دو"

سپیکر پر ایک لمحے کے لئے آواز بلند ہوئی اور پھر سپیکر خاموش ہو گیا۔ ویٹر
دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"سر! اندر تشریف لے جائیں"

وہ چلا گیا۔ میں نے دروازے کی پیتل کی ہتھی کو ذرا سا بائیں جانب گھما کر د
کھولا۔ کمرے میں اعلیٰ قسم کے غیر ملکی پرفیوم اور سگار کی تیز خوشبو میرے قریب۔

نکل گئی۔ کمرہ زیادہ بڑا نہیں تھا مگر بڑے سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ سنہری باڈر والا صوفہ
بڑا قیمتی تھا۔ گلدان میں ولائتی گلابوں کا گل دستہ سجا ہوا تھا۔ دیوار پر صرف تین فریم
ہوئی تصویریں لگی تھیں۔ درمیان میں مہاتما گاندھی کی تصویر تھی اور دائیں بائیں
نہرو اور اندرا گاندھی کی تصویریں تھیں۔ ان تصویروں کے نیچے بڑے صوفے پر
لی کھدر کے کرتے کے اوپر بھورے رنگ کی گرم نہرو واسکٹ پہنے بڑے اطمینان سے
ایک سوٹ بوٹ والے آدمی سے باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ اس کی
ر مجھے کمانڈو شیروان نے کشمیر سے چلتے وقت دکھا دی تھی۔

شیر علی نے مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر بھنوئیں اٹھا کر میری طرف دیکھا
خالص کاروباری انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"فرمائیے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

میں نے کھڑے کھڑے اردو میں کہا۔

"میں دلی کا ہوں مگر والد صاحب کے ساتھ حیدر آباد میں بزنس کرتا
ہوں۔ اسی سلسلے میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں"

شیر علی نے بڑی بے نیازی سے ہاتھ کے اشارے سے مجھے صوفے پر بیٹھنے کے لئے
اور سوٹ بوٹ والے آدمی سے باتوں کو سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا۔ سوٹ بوٹ والا
ی بریف کیس میں سے کچھ کاغذات نکال کر اسے دکھانے لگا اور انگریزی میں کہا۔

"سر! منتری صاحب کے پی اے آپ کے دوست ہیں۔ اگر آپ منتری
جی کو نہیں کہنا چاہتے تو ان کے پی اے سے کہہ کر یہاں دستخط کروا دیجئے۔ میرا
دو کروڑ کا بل چھ ماہ سے رکا ہوا ہے۔

شیر علی نے اس آدمی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"آپ یہ کاغذات اپنے پاس ہی رکھیں۔ میں منتری جی کے پی اے سے
بات کرتا ہوں آپ ایسا کریں کل مجھے کسی وقت فون کر کے معلوم کر لیں"

سوٹ بوٹ والا آدمی بریف کیس میں کاغذ رکھنے کے بعد اٹھا ہندوؤں کی طرح ہاتھ

جوڑ کر شیر علی کو پرنام کیا اس کا شکریہ ادا کیا اور سر جھکائے دروازے کی طرف بڑھا۔ ش
علی اب میری طرف متوجہ ہوا۔ وہ سگار پی رہا تھا۔ میری نگاہیں سوٹ بوٹ والے آد
لگی ہوئی تھیں۔ جب وہ کمرے سے نکل گیا اور دروازہ بند ہو گیا تو میں خاموشی سے ش
علی کو دیکھنے لگا۔ شیر علی نے سگار کا ہلکا سا کش لیا۔ اس کی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی
بجلی کی روشنی میں ہلکا سا لشکارا مارا۔ یہ شخص واقعی بڑے ٹھاٹھ سے یہاں رہ رہا تھا۔

"فرمائیے۔ آپ کیسے تشریف لائے ہیں"

کمانڈو سپاہی کا ایک سنہری اصول یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ فضول گفتگو کبھی نہیں کر
وہ وقت کی قیمت پہچانتا ہے۔ چنانچہ میں نے فضول باتوں میں وقت ضائع کرنے کی بجا
وہ خفیہ کوڈ جملہ بول دیا جو مجھے کمانڈو شیروان نے بتایا تھا۔ میری زبان سے یہ جملہ سنتے
شیر علی نے پہلا کام یہ کیا کہ ساتھ ہی تپائی پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کا ریسور اٹھا کر کسی
کہا۔

"مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ میں بڑی ضروری کاروباری میٹنگ میں ہوں"

ریسور رکھتے ہوئے شیر علی میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اگرچہ شکل صورت سے
بات ثابت ہو چکی تھی کہ یہی مرد مجاہد شیر علی ہے مگر ضابطے کے مطابق ضروری تھا کہ
میرے کوڈ والے خفیہ جملے کا جواب خاص کوڈ میں دے۔ میں ٹکٹکی باندھے شیر علی کو تک
رہا تھا۔ میں نے کوڈ الفاظ ایک بار پھر دہرائے۔ اب شیر علی کو یاد آگیا کہ اسے بھی کوڈ
جواب دینا ہے۔ چنانچہ اس نے جواب میں ایک خفیہ جملہ بولا۔ یہ وہی جملہ تھا جو کمانڈ
شیروان نے مجھے بتایا تھا۔ شیر علی صوفے سے اٹھ کر دروازے کے پاس گیا۔ اسے لاک
اور میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"آیئے اندر چل کر بزنس پر بات کرتے ہیں"

اس کمرے کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا بیڈ روم تھا۔ یہاں سنگل بیڈ لگا تھا۔ چھ
صوفہ سیٹ بچھا تھا۔ درمیان میں کافی ٹیبل پر کرناٹک کی ڈانسنگ گرل کا کانسی کا مجسمہ ر
تھا۔ کونے میں چھوٹی میز پر رام اور سیتا کی دو مورتیاں سجی ہوئی تھیں۔ شیر علی کے بڑ

ے اور بیڈ روم کا سارا ماحول ہندووانہ تھا۔ بیڈ روم میں آکر شیر علی نے مجھے بیٹھنے کا
ہ کیا۔ پھر خود بھی میرے سامنے بیٹھ گیا۔ سگار اس نے ایش ٹرے میں مسل کر بجھا دیا۔
ے لگا۔

"بیڈ روم میں میں تم سے زیادہ آزادی سے بات کر سکتا ہوں۔ اگرچہ
ایسی کوئی بات نہیں ہے پھر بھی میں بے حد احتیاط سے کام لیتا ہوں۔ میرے
ہاں سرکاری درباری ہر قسم کے آدمیوں کا آنا جانا رہتا ہے۔ خاص طور پر میں تم
سے یہاں بیڈ روم میں ہی بات کرنی مناسب سمجھتا ہوں۔ مجھے شیروان کا پیغام
مل گیا تھا۔ میں تمہارا انتظار ہی کر رہا تھا۔ میں تمہیں کوئی ادھیڑ عمر کا آدمی سمجھتا
تھا مگر تم تو بالکل نوجوان ہو۔ بہرحال تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ تم نے کھانا
کھایا؟"

میں نے کہا۔

"نہیں۔ سٹیشن سے سیدھا آپ کے پاس ہی آ رہا ہوں"

"تو پھر ایسا کرو کہ نیچے چل کر پہلے کھانا کھا لو اس کے بعد تم سے باتیں
ہوں گی۔ آؤ میرے ساتھ"

شیر علی مجھے اپنے ساتھ نیچے ڈائننگ ہال میں لے گیا۔ ایک کونے میں اس کے خاص
مہانوں کے لئے میز لگی ہوئی تھی۔ وہاں ہم بیٹھ گئے۔ کھانا بڑا پر تکلف تھا۔ اس دوران
مجھ سے دلی کے موسم اور پلوشن کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ بیرا کوئی ڈش لے کر آتا
ہ آندھرا پردیش کے موسم کی باتیں شروع کر دیتا۔ ریستوران کا مینجر بھی وہاں آگیا۔
منے آتے ہی جھک کر شیر علی سے کہا۔

"سر! میں خدمت کے لئے حاضر ہوں سر!"

شیر علی نے اس سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"ان سے ملو کرم جی۔ یہ میرا بھانجہ ارسلان ہے۔ سات برس لندن میں
رہ کر واپس بھارت آیا ہے۔ اب حیدر آباد میں کیٹرنگ کا کام شروع کیا ہے"

مینجر کا نام وکرم کمار تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر مجھے نمستے کہا اور انگریزی میں کہا۔

"سر! کسی چیز کی ضرورت ہو۔ میں حاضر ہوں"

مینجر چلا گیا تو شیر علی کہنے لگا۔

"یہاں میں تمہیں اپنا بھانجہ ہی ظاہر کروں گا۔ یاد رکھنا تمہارا نام ارسلان ہے۔ تم صرف آج کی رات میرے پاس ہی رہو گے۔ اس کے بعد تمہاری رہائش کا الگ بندوبست کر دیا جائے گا۔ لیکن تم اس دوران میرے ریستوران سے باہر نہیں جاؤ گے۔ میرے بیڈ روم میں ہی رہو گے میں نہیں چاہتا کہ آج رات کے بعد یہاں کے آدمی تمہیں دوبارا دیکھیں۔"

میں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ سمجھ گیا کہ یہ میرے اس مشن کا ایک حصہ ہی ہو گا جس کو لے کر میں کشمیر سے چلا تھا اور اس شخص شیر علی کے پاس آیا تھا جو انڈیا کے دارالحکومت میں بیٹھا تھا اور جس کی زیر ہدایت مجھے اپنے انتہائی اہم اور خفیہ مشن کو شروع کرنا تھا۔ جہاں ہماری میز لگی تھی وہاں بڑی مدھم روشنی تھی اور ہماری شکلیں پانچ چھ گز کے فاصلے سے شاید ہی کسی کو نظر آتی ہوں۔

کھانا کھانے کے بعد میں شیر علی کے ساتھ اس کے بیڈ روم میں آگیا۔ اس نے کہا۔

"اب تم یہاں آرام کرو۔ میں رات کے پچھلے پہر آؤں گا۔ دروازہ اندر سے لاک کر لینا"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ میں نے دروازہ اندر سے لاک کر لیا اور بستر پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ شیر علی کے ذہن میں ضرور کوئی خاص سکیم ہے۔ میرے لئے کوئی خاص پروگرام ہے۔ مجھے کسی قسم کی پریشانی نہیں تھی۔ میں نے سمندر میں چھلانگ لگا دی تھی۔ اب چاہے کتنے ہی طوفان آئیں مجھے ہر حالت میں ہر طوفان کا مقابلہ کرنا تھا اور اسلام' پاکستان اور جہاد کشمیر کے عظیم مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے ضرورت پڑنے پر اپنی جان بھی قربان کر دینی تھی۔

میں بمشکل تین چار گھنٹے ہی سویا ہوں گا کہ شیر علی نے آکر مجھے جگا دیا۔ اس نے اپنی

چابی سے دروازہ کھول لیا تھا۔ کہنے لگا۔

"تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا"

وہ مجھے پچھلے دروازے والی گلی میں سے نکال کر سڑک پر لے آیا۔ سردیوں کی رات کا پچھلا پہر تھا۔ سخت سردی تھی۔ ہلکی ہلکی دھند پھیلی تھی۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ شیر علی کی سیاہ رنگ کی چھوٹی انڈین گاڑی ایک طرف کھڑی تھی۔ اس نے مجھے اپنی ساتھ والی سیٹ پر بٹھایا اور گاڑی سٹارٹ کر دی۔ نہ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ مجھے کہاں لے جا رہا ہے اور نہ اس نے ہی کوئی بات کی۔ گاڑی نئی دلی کی کشادہ اور پچھلے پہر کے اندھیرے میں ویران سڑکوں پر سے ہوتی ہوئی شہر کے جنوب کی طرف چلی جا رہی تھی۔ دلی میں نے کافی گھوم پھر کر دیکھی تھی مگر یہ علاقہ بالکل اجنبی لگ رہا تھا۔

میں نے یونہی پوچھ لیا کہ یہ علاقہ کونسا ہے۔ شیر علی نے اپنے سیاہ اوور کوٹ کے کالر کھڑے کر رکھے تھے اور اس کی آنکھیں سامنے سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ آہستہ سے بولا۔

"بے معنی سوال کیوں پوچھتے ہو؟ معلوم ہوتا ہے تمہاری تربیت میں کچھ کمی باقی رہ گئی ہے"

میں شرمسار سا ہو کر چپ ہو گیا۔ گاڑی اب شہر کے ایسے علاقے میں سے گزر رہی تھی جہاں دور دور کوٹھیوں کی روشنی نظر آتی تھی۔ سڑک پکی تھی اور لگتا تھا کہ کسی دوسرے شہر کو جاتی ہے۔ کافی دور جانے کے بعد ایک جگہ شیر علی نے گاڑی بائیں جانب ہوتی سڑک پر نکال دی۔ یہ سڑک شکستہ سی تھی اور دونوں جانب اونچی اونچی جھاڑیاں تھیں۔ یہاں سڑک پر بجلی کا کوئی کھمبا بھی نہیں لگا تھا۔ بڑا اندھیرا تھا۔ شیر علی نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس بند کر کے چھوٹی بتیاں روشن کر رکھی تھیں اور گاڑی کی رفتار آہستہ کر دی تھی۔ سڑک دو تین جگہوں سے دائیں بائیں گھومی۔ پھر اندھیرے میں ایک مکان کی دیوار کے ساتھ جا کر رک گئی۔

ہم گاڑی سے باہر نکل آئے۔ یہ مکان نہیں کوئی مال گودام لگتا تھا۔ ایک طرف بوریوں کا ڈھیر لگا تھا۔ شیر علی گودام کے دروازے کا تالا کھول کر مجھے اندر لے گیا۔ گودام

کے اندر سلین اور سردی تھی۔ میں نے ہاتھ گرم پتلون کی جیبوں میں دے لئے۔ شیر علی نے جیب سے ٹارچ نکال لی تھی۔ اس کی روشنی میں ہم ایک جگہ سیڑھیاں اترنے کے بعد ایک ڈیوڑھی میں آگئے۔ ڈیوڑھی میں بھی آگے ایک دروازہ تھا۔ اس دروازے کے آگے لکڑی کی الماری رکھی ہوئی تھی۔ شیر علی نے ٹارچ زمین پر رکھ کر کہا۔

"ہاتھ ڈال کر میرے ساتھ الماری ایک طرف کرو"

ہم نے الماری کو ایک طرف کھسکا دیا۔ پیچھے دروازہ تھا جو بند تھا۔ شیر علی نے دروازے کا تالا کھول دیا۔ اندر سے ٹھنڈی مرطوب ہوا کا جھونکا میرے شانوں کو چھو کر گذر گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ بلکہ کوٹھڑی تھی شیر علی نے کسی جگہ دیوار پر لگا ہوا بٹن دبایا۔ کوٹھڑی میں روشنی ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ وہاں دیوار کے ساتھ ایک میز پر دو تین وائرلیس سیٹ فوٹو گرافی کا سامان' ایک انلارجنگ آپریٹس مائیکرو فلم بنانے والا کیمرہ پڑا تھا۔ یہاں فلم ڈیولپنگ کا پروسس بھی موجود تھا۔ شیر علی نے سٹول میز کے قریب کر دیا اور مجھے بیٹھنے کو کہا۔ وہ خود اوور کوٹ اتار کر دوسرے سٹول پر بیٹھ گیا۔ کوٹھڑی میں مرطوب ٹھنڈک تھی۔ قریب ہی ایک مائیکرو سکوپ پڑی تھی۔ شیر علی کہنے لگا۔

"تمہیں یہاں رہ کر مائیکرو فلم پروسیسنگ' خفیہ کوڈ' فوٹو گرافی اور سگنل کے خفیہ اشاروں کی ٹریننگ حاصل کرنی ہوگی۔۔۔"

میں نے بیزاری کے ساتھ پوچھا۔

"یہ ٹریننگ کتنے دنوں کی ہوگی؟؟"

"تین ماہ لگیں گے"

میں ٹریننگیں لے لے کر تنگ آگیا تھا۔ اب میں میدان عمل میں چھلانگ لگانا چاہتا تھا۔ لیکن بعد میں مجھے پتا چلا بلکہ ثابت ہو گیا کہ یہ ٹریننگ کورس کس قدر ضروری تھے۔ ان کے بغیر کوئی بھی کمانڈو جاسوس ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ بلکہ الٹا اس کا دشمن کے ہاتھوں پکڑے جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ میرا مطلب ہے بہت جلدی پکڑے جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔

یہ آخری ٹریننگ کا مرحلہ بھی بے حد ہمت طلب اور مشکل نکلا۔ مجھے اس کوٹھڑی اور اس کے ساتھ والے نسبتاً کشادہ ہال کمرے میں تین ماہ کے لئے بند کر دیا گیا۔ مجھے گودام کی خستہ حال متروکہ عمارت سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ شیر علی صبح منہ اندھیرے آجاتا تھا۔ وہ ناشتہ اور کھانا ساتھ لاتا تھا۔ دوپہر تک وہ مجھے فوٹو گرافی اور سگنل کے خفیہ اشاروں اور مائیکرو سکوپ پر مائیکرو فلم پروسیسنگ کی مشکل ترین ٹریننگ دیتا۔ میرے یہ تین مہینے انتہائی مشقت کے مہینے تھے۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے میں قید میں رہ کر کوئی چلہ کاٹ رہا ہوں۔ لیکن شیر علی نے ان تین مہینوں میں مجھے وائرلیس اور ریڈیو ٹرانسمیٹر کے ذریعے خفیہ یعنی کوڈ اشاروں سے پیغام رسانی اور مائیکرو فلم پروسیسنگ کا ماہر بنا دیا۔ مائیکرو فلم کی ایک نئی ٹکنیک شیر علی نے مجھے سمجھائی اور اس کی پوری پوری تربیت دی۔ جاسوسی اور خفیہ پیغام رسانی کے اس طریقے کو پکڑنا بہت مشکل تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کے جاسوسوں نے یہ طریقہ ایجاد کیا تھا۔ انڈیا میں یہ بالکل نیا تھا۔ اور اس کی کامیابی کے سو فیصد چانس تھے۔ طریقہ یہ تھا کہ ایک عام خیر خیریت کے خط میں ہر جملے کے بعد جو نقطہ ڈالا جاتا یعنی فل سٹاپ کا نقطہ۔ یہ انٹیلی جینس کا نقطہ ہوتا تھا۔ یہ کسی بھی فقرے کے آخر میں کاغذ پر جملے کے بعد چپکا دیا جاتا تھا۔ اس نقطے میں وہ پورا خفیہ پیغام ہوتا تھا جسے الگ کاغذ پر لکھ کے مائیکرو سکوپ سے چھوٹے سے چھوٹا کرتے ہوئے ایک نقطے میں مرکوز کر دیا جاتا تھا اور پھر یہ نقطہ سوئی سے اٹھا کر کاغذ پر فقرے کے آخر میں بطور فل سٹاپ چپکا دیا جاتا تھا۔ جس کو یہ پیغام بھیجنا ہوتا تھا وہ شخص اس نقطے کو اٹھا کر مائیکرو سکوپ یا کسی دوسرے آلات کے ذریعے انلارج کرتا اور سارا مضمون اس کے سامنے آجاتا تھا۔

شیر علی نے مجھے ریڈیو ٹرانسمیٹر پر خفیہ سگنلز کے اشارے بھی زبانی یاد کروا دیئے۔ ان اشاروں کی مدد سے میں کوڈ الفاظ میں اپنے ساتھی کو انڈیا میں کسی بھی جگہ پیغام پہنچا سکتا تھا اور اس کا پیغام وصول بھی کر سکتا تھا۔ جب میری ٹریننگ ختم ہو گئی تو شیر علی مجھے رات کے وقت اس مال گودام کے قید خانے سے نکال کر اپنے ریستوران والے بیڈ روم میں

لے گیا۔ کہنے لگا۔

"اب تم سو جاؤ۔ کل کا دن بھی تم اسی بیڈ روم میں رہو گے اور آرام کرو گے۔ کل رات کو میں تمہیں کچھ باتیں زبانی بتاؤں گا جو انتہائی ضروری ہیں۔ اس کے بعد اپنے سیکرٹ مگر خطرناک مشن پر روانہ ہو جاؤ گے"

وہ رات اور اگلا دن میں نے شیر علی کے بیڈ روم میں قید تنہائی میں گذارا۔ دوسرے دن رات کے آٹھ بجے شیر علی نے اپنا کھانا بیڈ روم میں ہی منگوالیا۔ نوکر کھانا لے کر آیا تو اس نے مجھے باتھ روم میں چھپا دیا۔ کہنے لگا۔

"میں نہیں چاہتا کہ یہ لوگ اب تمہیں میرے ہاں دیکھیں۔"

کھانے کے بعد اس نے سگار سلگا لیا۔ الماری میں سے کالے رنگ کی ایک پاکٹ بک نکال کر میرے پاس صوفے پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"کمانڈو شیروان نے تمہیں را (RAW) کے بارے میں جو بریفنگ دی ہے اس سے اس نے مجھے پوری طرح آگاہ کر دیا ہے۔ تمہارا مشن بڑا نازک ہے لیکن مجھے امید ہے کہ جیسی تمہیں تربیت دی گئی ہے اور اسلام، پاکستان اور کشمیر کی جنگ آزادی کے بارے میں تمہارے دل میں جو جذبہ موجود ہے اگر تم نے عقل مندی اور ہوشیاری سے کام لیا تو تم اپنے مشن میں ضرور کامیاب ہو گے اور جہاد کشمیر، پاکستان کے استحکام اور اسلام کی بہت بڑی خدمت انجام دو گے اور ہندو سامراج کی اسلام دشمن سازشوں کو کاری ضرب لگاؤ گے --- اب تمہیں وہ سکیم بتاتا ہوں جس پر عمل کرتے ہوئے تمہیں اپنے مشن کو کامیاب بنانا ہے۔ اس وقت کشمیر میں مجاہدین کی سرگرمیاں اپنے عروج پر ہیں اور انڈین فوجی یونٹوں کو ہر محاذ پر شدید نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ بھارتی حکومت کشمیر میں دھڑا دھڑ فوجیں بھیج رہی ہے اور ان کو اسلحہ کی سپلائی دن رات جاری ہے۔ اندار حکومت کی منسٹری آف کشمیر افیئرز کی فوجی شاخ کو خفیہ ادارے را کے ماتحت کر دیا گیا ہے را کا ہیڈ کوارٹر تو دلی میں کیبنٹ

سیکرٹریٹ میں ہی ہے لیکن کشمیر میں فوجی سرگرمیوں کے تمام امور کشمیر افیئرز والی شاخ کے ہیڈ آفس میں طے پاتے ہیں دلی سے احمد آباد منتقل کر دیا گیا ہے تاکہ غیر ملکی انٹیلی جنیس کی نظریں اس پر نہ پڑ سکیں۔ اس راز کو انتہائی خفیہ رکھا گیا ہے۔ اس محکمے کا انچارج گجرات کا کاٹھیاوار کا رہنے والا ایک تجربہ کار سول آفیسر ہے جس کا نام جی ڈی پانڈے یعنی گوکل داس پانڈے ہے۔ اس کے محکمے کو سپیشل سیکورٹی ڈیپارٹمنٹ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں کشمیر میں جتنی نئی فوجی یونٹیں جاتی ہیں اور ان کے لئے جہاں جہاں سے اسلحہ سے بھری ہوئی سپیشل ملٹری ٹرینیں جموں کی طرف روانہ ہوتی ہیں وہ سب اس محکمے کے اشاروں پر چلتی ہیں۔ اس محکمے کا براہ راست بھارتی فوجی ہائی کمانڈ سے سلسلہ جڑا ہوا ہے۔ انڈین فوجی ہائی کمانڈ کشمیر میں فوجوں کی نقل و حرکت کی جو سکیم تیار کر کے اس محکمے کے سربراہ جی ڈی پانڈے کو بھیج دیتا ہے اور پھر مسٹر پانڈے کا محکمہ اس سکیم پر عمل کرتے ہوئے فوجوں کو بھارت کی مختلف چھاؤنیوں سے روانگی اور اسلحہ کی ترسیل کا سارا کام خفیہ طور اپنی نگرانی میں کراتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کشمیری مسلمانوں نے قیام پاکستان کے وقت پاکستان میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا تھا لیکن بھارتی حکومت نے فوراً وہاں اپنی فوجیں داخل کر کے کشمیر پر زبردستی اپنا قبضہ جما لیا تھا اب کشمیری مسلمان جن کی ریاست کشمیر میں واضح اکثریت ہے اپنے حق خود اختیاری کے لئے لڑ رہے تو انڈین حکومت یہ سمجھتی ہے کہ پاکستان ان کشمیری مسلمانوں کی اپنے کمانڈو بھیج کر مدد کر رہا ہے جو بالکل غلط بات ہے۔ کیونکہ کشمیری مسلمانوں کا تو بچہ بچہ کمانڈو بن کر اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے انہیں باہر کی مدد کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ پاکستان کی طرف سے کشمیری مسلمانوں کو اسلام کے ناطے اخلاقی مدد ضرور مل رہی ہے لیکن فوجی مدد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن چونکہ بھارتی حکومت نے اپنے طور پر یہ طے کر لیا ہے کہ پاکستان کشمیری مسلمانوں کی مدد کر

رہا ہے اس لئے اندارا گاندھی کی حکومت پاکستان میں تخریب کاری کا ایک
بہت خطرناک اور وسیع منصوبہ بنا رہی ہے۔ یہ منصوبہ اندرا گاندھی کے تیار
کردہ اسی بدنام خفیہ ادارے را کی کشمیر افیئرز والی شاخ کے ذریعے تیار کیا جا
رہا ہے اور اس کا انچارج بھی یہی ڈی جی پانڈے ہے۔ اس ناپاک منصوبے کے
ذریعے پاکستان میں تخریب کاری کی جائے گی۔ بم کے دھماکے کئے جائیں گے۔
مساجد میں بم پھینک کر مسلمانوں کو مسلمانوں کے خلاف لڑایا جائے گا۔ مذہبی
منافرت پھیلائی جائے گی۔"

میں بڑی توجہ سے شیر علی کی باتیں سن رہا تھا۔ میرا ذہن اس کی باتوں کے ساتھ ساتھ
چل رہا تھا۔ ایک پل کے لئے وہ خاموش ہو کر میری طرف غور سے دیکھنے اور سگار کے
کش لگانے لگا۔ پھر اسی طرح میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بولا۔

"تمہیں احمد آباد جا کر را کی کشمیر افیئرز کے ہیڈ آفس کے انچارج جی
ڈی پانڈے یعنی گوکل داس پانڈے تک رسائی حاصل کرنی ہے رسائی بھی اس
طریقے کی حاصل کرنی ہے کہ وہ تم پر بے حد اعتماد کرنے لگے۔ اس کے بعد تم
نے احمد آباد میں ہی اپنا ایک خفیہ ہیڈ کوارٹر بنانا ہو گا۔ تم کشمیر میں تازہ انڈین
فوجی یونٹوں کی نقل و حرکت اور اسلحہ کی سپلائی کے بارے میں مکمل معلومات
حاصل کر کے ان معلومات کی رپورٹ کوڈ الفاظ میں مجھے یہاں پہنچاؤ گے۔ میں
نے تمہیں اپنے ریڈیو ٹرانسمیٹر کے خفیہ سگنل بتا دیئے ہیں بلکہ تمہیں یاد کرا
دیئے ہیں۔ ایک بات یاد رکھنا۔ تم مجھے ہمیشہ رات کے بارہ باجے سے ایک بجے
کے درمیان ریڈیو ٹرانسمیٹر پر پیغام دیا کرو گے۔"

میں نے شیر علی کو سوال کیا۔

"میں اس سے پہلے احمد آباد کبھی نہیں گیا۔ اس شہر کے بارے میں اتنا
ضرور جانتا ہوں کہ یہاں ایک عرصہ تک مسلمانوں بادشاہ حکومت کرتے رہے
ہیں اور سلطان رضیہ سلطانہ اسی صوبے کی ملکہ تھی اور دوسرے یہ کہ ہندوؤں

کا مشہور مندر سومنات اسی صوبے میں کسی جگہ پر واقع ہے جس کے بت محمود
غزنوی نے پاش پاش کئے تھے اور ہندو راجاؤں کے بے پناہ لشکر کو سومنات کے
میدان میں شکست فاش دی تھی؟"

شیر علی مسکراتے ہوئے بولا۔

"تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ یہ اسی صوبے گجرات کاٹھیاواڑ کا دارالحکومت
ہے اور اس کا اسلامی نام احمد آباد ہے یہ کپڑے کے کارخانوں کا شہر ہے اور
بہت بڑی تجارتی منڈی ہے اور یہاں قطب شاہی خاندان کے کئی شاہی محلات
اور تاریخی عمارتیں اب تک موجود ہیں۔ بہر حال وہاں ہمارا ایک گجراتی
مسلمان مجاہد تمہاری ابتدائی امداد کے لئے موجود ہو گا۔ وہ تمہاری کچھ دور تک
راہ نمائی کرے گا۔ آگے سارا کام تم اکیلے ہی کرو گے۔ اب میری بات توجہ
سے سنو۔ یہ جو مسٹر جی ڈی پانڈے ہے میں تمہیں اس کی تصویر بھی دکھا دوں
گا۔ یہ شخص ویسے تو انڈین بیورو کریسی کا پرانا آئی سی ایس افسر ہے۔ بڑا پڑھا
لکھا ہے۔ مگر دوسرے ہندوؤں کی طرح یہ بھی بے حد توہم پرست آدمی ہے۔
یہ جینی ہے۔ یعنی جین مت کا پیرو کار ہے اور جین دھرم کو ہی نجات کا واحد
ذریعہ سمجھتا ہے۔ اس لئے تم اسے جین مت کے ایک وروان سادھو کے
روپ میں ملو گے۔ کمانڈو شیروان کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ کشمیر
میں تمہیں ہندو ازم کے تمام فرقوں کی مکمل تعلیم دی گئی ہے۔ یقیناً تم جین
مذہب کے بارے میں پوری معلومات رکھتے ہو گے۔ ویسے میں تمہیں انگریزی
میں لکھا ہوا ایک کتابچہ بھی دوں گا جس میں جین مذہب کے بانی مہاویر کی
زندگی کے حالات اور ہندو دھرم کے اس فرقے کے بارے میں مکمل معلومات
درج ہیں۔ مہاتما گاندھی بھی جین مت کے ماننے والوں میں سے تھا۔ مگر جی
ڈی پانڈے تو جین دھرم کا دیوانہ ہے اور اس دھرم کے بانی مہاویر کا عاشق ہے
تم اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کا اعتماد حاصل کرو گے۔

اب یہ تمہاری موقع شناسی اور عقل پر منحصر ہے کہ تم جی ڈی پانڈے کو کس حد تک اپنے قابو میں کرتے ہو۔ ویسے ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے پورے قابو کیا جائے۔ تھوڑی بہت رسائی حاصل کر لینے سے ہمارا کام نہیں چلے گا۔"

میں خاموشی سے بیٹھا شیر علی کی زبان سے ادا ہونے والے ایک ایک لفظ کو بڑ غور سے سن رہا تھا اور اسے اپنے دماغ میں بٹھاتا جا رہا تھا۔ کیونکہ ان باتوں نے آگے چ کر میرے کام آنا تھا۔

شیر علی کہنے لگا۔

"ہمارا احمد آباد والا آدمی اس سلسلہ میں بھی تمہاری مدد کرے گا۔ جیسا کہ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں یہ آدمی کوئی جاسوس نہیں ہے۔ اس کا پاکستان سے بھی کوئی واسطہ تعلق نہیں ہے۔ وہ بھارت میں رہنے والے ہزاروں مسلمانوں کی طرح کا ایک عام مسلمان ہے جس کو ہندو اپنا زر خرید غلام سمجھتا ہے اور جس کی ترقی کے تمام راستے ہندو نے مسدود کر رکھے ہیں۔"

شیر علی نے مجھے اس آدمی کا نام بتایا۔ میں اصلی نام کی جگہ آپ کو اس کا فرضی نام بتائے دیتا ہوں۔ میں نے اس کا فرضی نام کریم بھائی رکھا ہے۔ یہ نام گجرات کاٹھیاواڑ کے مسلمانوں میں بڑا عام نام ہے۔ شیر علی نے کہا۔

"ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں کی طرح کریم بھائی کو بھی اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ ہندو اسلام کا دشمن ہے اور وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی پوری نسل کو یا تو ہندو بنا دینا چاہتا ہے یا پھر اسے معاشی اور اقتصادی اعتبار سے اتنا تباہ حال کر دینا چاہتا ہے کہ بھارت کے مسلمان کی حیثیت ایک بھکاری سے زیادہ نہ ہو۔ چنانچہ کریم بھائی نے اپنے اور اسلام کے دشمن کے خلاف مرتے دم تک جہاد کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔ اس کا دشمن اور میرا دشمن اور ہمارے دین اسلام کا دشمن صرف ہندو اور ہندو ہی ہے سکھ تو جدھر مندر جاتا ہے اسی

طرف جاتے ہیں ان کی انڈیا میں اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ایک طرح سے وہ بھی مسلمانوں کے دشمن ہی ہیں۔"

پھر شیر علی نے مجھے بتایا کہ کریم بھائی مجھے احمد آباد کے ریلوے سٹیشن پر لینے آیا ہو ا۔

"میں اسے تمہارے جانے کے بعد اپنے خفیہ ذرائع سے اطلاع کر دوں گا۔ میں تمہیں اس کی تصویر دکھاتا ہوں"۔

شیر علی نے مجھے پاکٹ بک میں سے کریم بھائی کی پاسپورٹ سائز کی تصویر دکھائی۔ نے اس شکل کو اچھی طرح سے ذہن نشین کر لیا۔

"تم احمد آباد کے ریلوے سٹیشن پر اسے پہچان کر اس کے پاس جاؤ گے۔ وہ تمہیں سٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ایک کے بک سٹال پر کھڑا ملے گا۔ تم السلام علیکم کہہ کر اس سے مصافحہ کرو گے۔ وہ کوڈ الفاظ میں تم سے پوچھے گا۔ آپ نے تو پچھلے سٹیشن پر اترنا تھا۔ تم اس کے جواب میں کہو گے۔ مجھے شیر کے شکار کا شوق ہے۔ کیا تم مجھے شیر کے شکار پر لے چلو گے۔ بس تمہاری شناخت مکمل ہو جائے گی۔ اس کے بعد کریم بھائی تمہیں اپنے ہاں لے جائے گا۔ اب میں تمہیں را کے کشمیر افیئرز کے ہیڈ کوارٹر کے انچارج مسٹر جی ڈی پانڈے کی تصویر دکھاتا ہوں۔"

شیر علی نے اسی پاکٹ بک میں سے مجھے جی ڈی پانڈے کی تصویر بھی نکال کر دکھائی۔ ایک بھاری چہرے اور موٹی توند والے بیمار سے ہندو کی تصویر تھی جس کے سر کے بال ب تھے۔ کانوں کے اوپر تھوڑے تھوڑے سفید بالوں کی جھالر سی لگی تھی۔ مونچھوں ، بال بھی سفید ہو چکے تھے۔ اس نے سفید ململ کا کرتہ پہنا ہوا تھا جیسا اس زمانے کے رسی لیڈر پہنا کرتے تھے اور اب بھی پہنتے ہیں۔ نیچے اس نے ململ کی دہری دھوتی پہنی ئی تھی اور باغ میں ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ شیر علی نے کہا۔

"یہ پانڈے کی کوٹھی کے لان میں اتری ہوئی تصویر ہے۔ یوں سمجھ لو کہ

تم نے اس شخص پر فتح حاصل کرنی ہے اور اس کے دل ودماغ پر قبضہ کرنا ہے اور یہ کام تم دولت مند بن کر' ملک کے لیڈر بن کر' ملک کے ہیرو بن کر نہیں کر سکتے۔ صرف اس شخص کے عقیدے کی نازک رگ کو اپنے ہاتھوں میں کر سکتے ہو اور اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ تم جین مت کے ودوان اور شاستری بن کر اس کے سامنے جاؤ۔ اگر تم نے اپنی باتوں سے اس کو متاثر کر لیا تو پھر سمجھ لو کہ تمہارا آدھے سے زیادہ کمانڈو مشن اسی وقت مکمل ہو گیا۔ کیونکہ کشمیر کے محاذ پر انڈین فوجی ہائی کمانڈ کی ساری حکمت عملی اسی شخص جی ڈی پانڈے کے آفس میں تیار ہوتی ہے۔"

باتیں کرتے کرتے رات کے ساڑھے نو بج گئے۔ شیر علی نے اپنے ملازم کو جو کھانا لے کر آیا تھا کہہ دیا تھا کہ میں اب سو جاؤں گا۔ مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ چنانچہ اس دوران وہاں کوئی بھی نہ آیا۔ شیر علی نے خود بجلی کی کیتلی میں پانی گرم کر کے کافی تیار کی۔ شیر علی کہنے لگا۔

"جینی وروان یا سادھو بننے کے لئے تمہارے لئے ضروری ہو گا کہ تم جینی اوتار ساوردھن کی مڑھی پر جا کر وہاں سے چار گانٹھوں والا منگل سوتر لے کر اسے اپنی دائیں کلائی میں باندھو۔"

میں نے پوچھا۔

"یہ جینی اوتار کون تھا اور اس کی مڑھی کہاں پر ہے؟"

شیر علی نے کہا۔

"ہندو دھرم خود بھی چوں چوں کا مربہ ہے اور اس کے آگے جو فرقے ہیں ان کی باتیں بھی عقل سے کوسوں دور ہیں۔ جین مت والوں کا عقیدہ ہے کہ جین مت کے بانی مہاویر جے وردھن نے تیسری بار بیکانیر کے ایک راجہ کے گھر اوتار بنکر جنم لیا تھا اور اس کا نام ساوردھن تھا۔ ساوردھن بھی مہاویر کی طرح راج پاٹ چھوڑ کر جنگلوں میں ساری عمر رہا اور مرنے کے بعد لوگ

اسے نندی کنڈ لے گئے جو بیکانیر سے 8 میل کے فاصلے پر ہے اور جہاں اس زمانے کے راجہ کی داشتاؤں کی مڑھیاں ہیں جن کے اوپر سنگ مرمر کی چھتریاں بنی ہوئی ہیں۔ ان کے قریب ہی جینی اوتار ساوردھن کی مڑھی ہے جہاں ایک چھوٹا سا مندر بنا ہے۔ وہاں ایک گیانی پنڈت بیٹھتا ہے۔ یہ منگل سوتر تمہیں وہی پنڈت دے گا مگر اس سے پہلے اس بات کی پوری تسلی کرے گا کہ تم جین مت کے بارے میں پوری معلومات رکھتے ہو اور مہاویر سوامی کے سچے پرستار ہو۔"

میں نے مسکر کر کہا۔

"اس بات کی فکر نہ کریں۔ میں اس پنڈت کو قائل کر لوں گا۔"

اس کے بعد مجھے شیر علی نے انگریزی کی چھوٹی سی کتاب نکال کر دی جو جین مت کے بانی مہاویر جے وردھن کے بارے میں تھی۔

"اسے تم پوری طرح پڑھ لینا۔ یہ تمہاری معلومات میں مزید اضافہ کرے گی۔"

سگار کی راکھ آتش دان میں جھاڑتے ہوئے شیر علی نے کہا۔

"باقی تمہارے پاس جو ٹیبلٹ بم اسپرو کی گولیوں کی شکل میں ہیں وہ تم اپنے پاس ہی سنبھال کر رکھنا۔ یہ دھماکہ خیز خفیہ بم تمہارے بڑے کام آسکتے ہیں مگر انہیں خاص خاص موقع پر استعمال کرنا۔ اس کوڈ زبان میں لکھا ہوا فارمولا بھی تم اپنے پاس ہی رکھنا۔ میں نے اگر تمہیں کوئی معمولی خیریت کا کوئی خط لکھا تو خط کی آخری سطر کے آخری فل سٹاپ والے نقطے کو اٹھا کر انلارج کر لینا۔ اسی میں تمہارے نام میرا خاص پیغام ہو گا۔ تم بھی اگر کوئی پیغام مجھے ریڈیو سگنل کے ذریعے نہ پہنچانا چاہو تو خط لکھ دینا اور اپنا پیغام خط کے آخری فقرے کے آخر میں فل سٹاپ میں بند کر دینا۔ میں اس نقطے کو انلارج کر کے تمہارا خفیہ پیغام پڑھ لوں گا۔ باقی تمہیں اگر کوئی خفیہ پیغام ریڈیو سگنل کے ذریعے

کمانڈو شیروان کو دینا ہو تو تمہیں شیروان نے اپنے ٹرانسمیٹر کے خفیہ اشارے ضرور سمجھا دیئے ہوں گے۔"

"جی ہاں۔ وہ سگنل اشارے مجھے یاد ہو چکے ہیں اور آپ کے ٹرانسمیٹر سیٹ کے خفیہ سگنل بھی میں نے ذہن نشین کر لئے ہیں۔"

شیر علی بولا۔

"اور یہ بات بھی یاد رکھنا کہ مجھے ریڈیو سگنل کے ذریعے جب بھی کوئی پیغام بھیجنا ہو تو ہمیشہ رات کے بارہ بجے اور ایک بجے کے درمیان بھیجنا۔ اس وقت میرا خفیہ چھوٹا ریڈیو ٹرانسمیٹر سیٹ میرے اسی بیڈ روم میں میرے پاس ہی ہوتا ہے۔ کمانڈو شیروان بھی مجھے اسی وقت پیغام کے سگنل بھیجتا ہے۔"

رات کے دس بج چکے تھے۔ میں شیر علی سے پوچھنے ہی والا تھا کہ مجھے احمد آباد اپنے مشن پر کسی وقت روانہ ہونا ہے کہ اس نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم اپنا تھوڑا سا حلیہ تبدیل کر لو۔ تمہاری مونچھیں نہیں ہیں۔ تم چھوٹی چھوٹی مونچھیں رکھ لو اور بالوں کا سٹائل بھی تبدیل کر لو اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے ریستوران کے آدمیوں نے تمہیں میرے ساتھ دیکھ لیا ہے۔ یہ میری مجبوری تھی کیونکہ احمد آباد میں تم ایک ہندو بن کر جاؤ گے جو جین مت کا ماننے والا ودوان اور شاستری ہے۔ تم اپنا کوئی ہندوانہ نام ابھی مت رکھنا۔ کریم بھائی تمہیں گجرات کاٹھیاواڑ کا کوئی ہندوانہ نام بتا دے گا۔ دوسرے ماڈرن سادھو بن کر جی ڈی پانڈے کے پاس جاؤ۔ آگے وہاں جیسے حالات ہوں ویسے ہی کرنا۔ کریم بھائی اس سلسلے میں تمہیں صحیح مشورہ دے گا۔ جین مت کا سادھو بننے کے لئے تمہیں لمبے بال لمبی داڑھی رکھنے کی ضرورت نہیں پڑے گا۔ بس سفید کرتا سفید دھوتی اور چپل ہی کافی رہے گی۔ جین مت کے سادھو صفاچٹ بھی ہوتے ہیں۔ صرف ماتھے پر تمہیں جینی تلک لگانا ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں آج ہی سے مونچھیں بڑھانی شروع کر دیتا ہوں۔ بالوں کا اسٹائیل بھی تبدیل کر لیتا ہوں۔ اگر جٹا دھاری سادھو بننا پڑا تو وہ بھی بن جاؤں گا اگر کریم بھائی نے کہا کہ انگریزی کپڑوں والا ماڈرن سوامی ہی بنا رہوں تو یہی کپڑے ٹھیک رہیں گے۔ صرف ماتھے پر تلک لگا لوں گا"

شیر علی نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ وہ میرے لباس کا جائزہ لے رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"احمد آباد میں اتنی سردی نہیں ہوتی۔ وہاں تمہیں سویٹر کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ صرف ایک کوٹ ہی کافی رہے گا۔ یا یہ جیکٹ جو تم نے پہن رکھی ہے ٹھیک رہے گی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ لباس کا فیصلہ بھی تم کریم بھائی سے مل کر ہی کرنا۔ ہو سکتا ہے وہ تمہیں سفید کھدر کا کرتہ پاجامہ اور کھدر کی جیکٹ پہننے کا مشورہ دے۔ کیونکہ آج کل کے ماڈرن جینی سادھو عام طور پر ایسا ہی لباس پہنتے ہیں۔ صرف کٹر قسم کے جینی سادھو یا تو ننگے رہتے ہیں اور یا پھر سفید کھدر کا کرتہ اور دھوتی پہنتے ہیں۔ اچھا اب تم آرام کرو"

میں نے پوچھا۔

"مجھے احمد آباد کس وقت روانہ ہونا ہوگا؟"

شیر علی نے ماتھے پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

"یہ بتانا تو میں تمہیں بھول ہی گیا تھا۔ وہ ایسا ہے کہ میں نے بروڑہ ایکسپریس میں تمہاری سیکنڈ کلاس کی سیٹ ریزرو کروا دی ہے۔ تمہیں سب سے پہلے احمد آباد جا کر کریم بھائی سے ملاقات کرنی ہوگی۔ میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ وہ تمہیں پلیٹ فارم نمبر ایک کے بک سٹال پر ملے گا۔ تمہیں اس کی فوٹو بھی دکھا دی ہے۔ اس سے ملنے کے بعد تم بیکانیر سادوردھن اوتار کی مڑھی پر جاؤ گے اور وہاں کے جینی پنڈت سے چار گانٹھوں والا کلائی پر باندھنے

کے لئے منگل سوتر حاصل کرو گے۔ اس کے بعد تم را کے احمد آباد والے ہیڈ کوارٹر کے چیف گوگل داس پانڈے سے رابطہ پیدا کرنے کے بارے میں کوئی حکمت عملی تیار کرو گے۔ تمہاری گاڑی صبح سوا چھ بجے نئی دلی کے سٹیشن سے چلے گی۔ اب تم سو جاؤ۔ صبح ملاقات ہو گی۔"

شیر علی دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ میں بستر پر لیٹ گیا اور جین مت کے بانی کے بارے میں اس نے مجھے جو انگریزی کتابچہ دیا تھا اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ یہ کوئی ڈیڑھ سو صفحے کی کتاب تھی۔ میں نے بستر پر لیٹے لیٹے ساری کتاب پڑھ لی۔ اس کتاب سے جین مت کے بانی اور جین دھرم کے متعلق میری معلومات میں بڑا اہم اضافہ ہوا اور ان معلومات نے آگے چل کر مجھے بے حد فائدہ پہنچایا۔

صبح ساڑھے پانچ بجے شیر علی نے مجھے جگا دیا۔ پچھلی گلی والی سڑک پر اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ ہم گاڑی میں خاموشی سے بیٹھ گئے۔ سردیوں کے موسم میں صبح پانچ بجے تک ہلکا ہلکا رات کا اندھیرا باقی رہتا ہے۔ نئی دلی کی سڑکوں پر بتیاں جل رہی تھیں۔ گاڑیوں کی ٹریفک ابھی سے شروع ہو گئی تھی۔ شیر علی نے نئی دلی کے سٹیشن سے کچھ فاصلے پر ہی گاڑی روک دی اور میری طرف دیکھ کر کہا۔

"خدا پر بھروسہ رکھنا۔ تمہارے سامنے بڑا اہم مگر خطرناک مشن ہے۔ ایک بات میں تمہیں ضرور کہوں گا۔ کمانڈو جاسوس کے ہر وقت پکڑے جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اگر کبھی پکڑے گئے اور دشمن کے تشدد کی اذیت برداشت نہ کر سکے اور موت سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تو ہم میں سے کسی کا نام زبان پر نہ لانا۔"

میں نے شیر علی کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا۔

"اس سے پہلے کہ آپ لوگوں کا نام میری زبان پر آئے میری زبان ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکی ہو گی۔"

شیر علی نے گاڑی سے باہر نکل کر مجھے گلے لگایا اور مجھ سے مزید کوئی بات نہ کی۔ خدا

حافظ بھی نہ کہا اور گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔

نئی دلی کا ریلوے سٹیشن اب بہت شاندار ہو گیا ہے۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں یہ چھوٹا سا سٹیشن ہوا کرتا تھا۔ باہر گاڑیاں پارکنگ میں کھڑی تھیں۔ صبح ہو رہی تھی۔ ٹکٹ میرے پاس ہی تھا۔ میں گیٹ پر ٹکٹ چیکر کو ٹکٹ دکھا کر پلیٹ فارم پر آ گیا اور سیکنڈ کلاس کے ریفرشمنٹ روم میں جا کر بیٹھ گیا۔ بروڑہ ایکسپریس نئی دلی سے آنا تھا۔ وہ کچھ لیٹ آئی۔ میری سیٹ سیکنڈ کلاس میں ریزرو تھی۔ یہ چار سیٹوں والا ڈبہ تھا۔ تین اور مسافر پہلے سے بیٹھے تھے۔ میں نے ان کی طرف زیادہ دھیان نہ دیا اور اپنی سیٹ پر آرام سے بیٹھ گیا۔ نئی دلی سے احمد آباد تک کافی لمبا سفر تھا۔ ٹرین پورے راجستھان میں سے ہو کر گذری۔ راستے میں جو بڑے بڑے شہر آئے ان کے نام مجھے آج بھی یاد ہیں۔ پہلے الور کا سٹیشن آیا۔ پھر جے پور اور اجمیر شریف آئے۔ اس کے بعد بیوار اور اودھے پور کے سٹیشن بھی گذر گئے۔ اس کے بعد احمد آباد تک کوئی بڑا شہر نہ آیا ٹرین کافی دیر تک چلتی رہی۔ میں دوسرے دن صبح نو بجے کے قریب احمد آباد پہنچا۔ راستے میں ایک جگہ ٹرین کو لائن زیر تعمیر ہونے کی وجہ سے کافی دیر رکنا پڑا۔

احمد آباد کا ریلوے سٹیشن میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ ٹرین پلیٹ فارم نمبر سات پر کھڑی ہوئی تھی۔ میں ایک قلی سے پوچھ کر پلیٹ فارم نمبر ایک پر آ گیا۔ میں بک سٹال تلاش کرنے لگا۔ آخر ایک جگہ مجھے کاؤنٹر کے اوپر رسالے اور کتابیں وغیرہ نظر آئیں۔ میں بک سٹال کی طرف بڑھا۔ بک سٹال کے کونے میں ایک شخص کاؤنٹر پر کہنی ٹکائے بڑے سکون سے کھڑا بیڑی پی رہا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ کریم بھائی تھا۔ میں آگے بڑھ کر اسے السلام علیکم کہا اور اس سے مصافحہ کیا۔

کریم بھائی نے کوڈ الفاظ استعمال کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"آپ نے تو پچھلے سٹیشن پر اترنا تھا۔"

میں نے اس کے جواب میں خفیہ زبان میں کہا۔

"مجھے شیر کے شکار کا شوق ہے۔ کیا تم مجھے شیر کے شکار پر لے چلو

گے؟"

کریم بھائی نے بیڑی پھینک دی اور ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

"میرے ساتھ آؤ"

وہ مجھے لے کر سٹیشن سے باہر آگیا۔ یہاں واقعی موسم بڑا خوشگوار تھا۔ سردی نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں نے جیکٹ کے بٹن کھول دیئے۔ سٹیشن کے باہر بڑی رونق تھی۔ گجراتی لوگ دھوتی کرتہ، پینٹ قمیض پہنے سڑک پر آجا رہے تھے۔ ان کے رنگ زرد تھے۔ گجراتی عورتیں رنگ برنگی ساڑھیوں میں ملبوس تھیں۔ کچھ شلوار قمیض والی عورتیں بھی نظر آئیں۔ سڑک پر خوب ٹریفک تھی۔ سامنے ایک دیوار پر فلموں کے گجراتی اور ہندی زبانوں میں لکھے ہوئے بڑے بڑے پوسٹر لگے تھے۔ ایک طرف رکشا اور ٹیکسی سٹینڈ تھا۔ کئی مردوں نے کاندھوں پر چھتریاں لٹکا رکھی تھیں۔

کریم بھائی مجھ سے دو تین قدم آگے چل رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میرے اور اپنے درمیان فاصلہ رکھنا چاہتا ہے۔ میں نے اس کے قریب ہونے کی کوشش نہ کی۔ ایک طرف پارکنگ سٹینڈ پر کچھ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کریم بھائی نے ایک پرانی بوسیدہ سی نسواری رنگ کی چھوٹی مورس گاڑی کا دروازہ کھولا اور مجھے پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی سٹیشن کے احاطے سے نکل کر احمد آباد کے بازاروں میں سے گذرنے لگی اس وقت تک احمد آباد میرے لئے بالکل اجنبی شہر تھا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد میں شہر کی تمام سڑکوں، محلوں اور ماڈرن بستیوں اور کالونیوں سے واقف ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں یہاں یہ نہیں ظاہر کروں گا کہ کریم بھائی مجھے شہر سے باہر کونسی بستی اور علاقے میں لے گیا۔ اس نے گاڑی ایک جگہ درختوں کے پاس کھڑی کر دی۔ یہاں آس پاس آبادی کافی فاصلے پر تھی۔ دور ریلوے لائن تھی جہاں ایک مال گاڑی گذر رہی تھی۔ کریم بھائی مجھے ساتھ لے کر ایک طرف چل پڑا۔ یہ غیر آباد علاقہ تھا۔ ایک جانب کافی دور فیکٹریوں کی چمنیاں دھواں اگل رہی تھیں۔ ایک کوارٹر نما کھپریل کی ڈھلواں چھت والا شکستہ سا مکان آگیا جس کے احاطے میں لکڑی کے پرانے کھوکھے اور

ریفریجریٹروں کے خالی خول اور ادھر ادھر پڑے تھے۔ ان پر زنگ لگ رہا تھا۔ کوارٹر کے آگے چھوٹا سا ورانڈہ تھا۔ کریم بھائی نے چابی لگا کر کمرے کا دروازہ کھولا۔ ہم اندر چلے گئے۔ یہ چھوٹا سا معمولی سامان والا کمرہ تھا۔ ایک پرانا پلنگ، دو بید کی کرسیاں، ایک سٹول، ایک تپائی تھی۔ دیواریں بالکل خالی تھیں۔ ایک کھڑکی تھی جو پچھلی طرف نکلتی تھی۔ کریم بھائی نے کھڑکی کھولی اور دوسری طرف تاڑ کے درخت نظر پڑے اور تازہ ہوا اندر آئی۔

"تم بیٹھو میں چائے بنا کر لاتا ہوں"

کچن برآمدے میں ایک طرف بنا ہوا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا اور کریم بھائی کے بارے میں سوچنے لگا کہ یہ کس قسم کا آدمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس شخص نے مجھے ذرا متاثر نہ کیا تھا۔ شیر علی کے بیان کے مطابق اس شخص کو میرے انتہائی اہم مشن میں بڑا خاص رول ادا کرنا تھا۔ مگر مجھے نہیں لگتا تھا کہ یہ شخص کریم بھائی اتنے ذمے دار فرائض کو ادا کر سکے گا۔ لیکن بعد میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ یہ شخص واقعی کمال کی خوبیوں کا مالک تھا۔ اس نے شہر کے ایک بازار میں ٹی وی اور ریفریجریٹروں کی مرمت کی دکان کھول رکھی تھی۔ عمر چالیس کے قریب تھی۔ شادی نہیں کی تھی۔ اپنی دکان کے اوپر چوبارے میں اکیلا رہتا تھا۔ محلے کی مسجد اور جین مندر کو ہر ماہ باقاعدگی سے چندہ دیتا تھا۔ جینی ہندوؤں پر اثر ڈالنے کے لئے اس نے اپنی دکان کے آگے پلاسٹک کا ٹب رکھا ہوا تھا جس میں ہر روز وہ پسا ہوا نمک ڈال دیتا تھا۔ گائیاں وہاں سے گذرتے ہوئے نمک چاٹا کرتی تھیں۔ احمد آباد میں یہ بات میں نے خاص طور پر دیکھی تھی کہ جینی ہندو جن کی احمد آباد میں اکثریت تھی گائیوں کو نمک چٹاتے تھے۔ آوارہ گائیاں اور بیل گلی محلوں میں عام پھرتے تھے۔ ہندو عورتیں ان کے آگے نمک اور چارہ ڈالتی تھیں۔ جین مت کے دو بڑے اہم فرقے ہیں۔ ایک فرقے کا نام ڈگمبر ہے۔ دوسرے فرقے کا نام سوتمبر ہے۔ ڈگمبر فرقے کے جینی سادھو ننگے ہوتے ہیں۔ یعنی وہ کوئی لباس نہیں پہنتے۔ گلیوں، بازاروں میں الف ننگے چلتے پھرتے ہیں۔ ہندو عورتیں گھروں سے نکل کر ان ننگے ڈگمبر سادھوؤں کو دہی، کھیر، آلو بھاجی اور پوڑیوں سے تواضع کرتی ہیں۔ دوسرے فرقے سوتمبر

کے سادھو سفید لباس پہنتے ہیں اور اپنے منہ پر ایک سفید رومال باندھے رکھتے ہیں تاکہ کوئی جراثیم ان کے منہ میں داخل ہو کر ہلاک نہ ہو جائے۔ کیونکہ جین دھرم اہنسا یعنی عدم تشدد ایک اہم ترین عقیدہ ہے۔ یہ لوگ کسی جانور کیڑے مکوڑے مکھی تک کو نہیں مارتے۔ چارپائیوں میں اگر کھٹمل پڑ جائیں تو یہ لوگ انہیں بھی نہیں مارتے۔ اس کا علاج یہ کرتے ہیں کہ دن کے وقت کھٹملوں والی چارپائی پر کسی مزدور کو پیسے دے کے سلا دیتے ہیں۔ کھٹمل جی بھر کر اس مزدور کا خون پی لیتے ہیں۔ پھر یہ جینی رات کو جب اس چارپائی پر سوتے ہیں تو کھٹمل انہیں کچھ نہیں کہتے۔ آگے چل کر میں جین دھرم کے بارے میں بہت سی دلچسپ باتیں آپ کو بتاؤں گا۔

بہرحال کریم بھائی میرے بڑے کام کے آدمی نکلے۔ شیر علی نے یونہی مجھے اس آدمی کے پاس نہیں بھیجا تھا۔ اس شخص میں بنیادی بات یہ تھی کہ وہ سچا مسلمان اور اسلام اور پاکستان کا شیدائی تھا۔ اس کا ایمان تھا کہ مضبوط پاکستان کے ساتھ ہی ہندوستان کے بارہ کروڑ غلام مسلمانوں کی نجات وابستہ ہے۔ بعد میں جب میں نے کریم بھائی سے پوچھا کہ اس نے شادی کیوں نہیں کی تو اس نے جواب دیا۔

”میں ایسی اولاد نہیں پیدا کرنا چاہتا جو ہندوستان میں ہندوؤں کی غلام بن کر زندگی بسر کرے“

کریم بھائی کچن میں سے دو پیالیاں چائے کی بنا کر لے آیا۔ کہنے لگا۔

”اس کوارٹر کو خرید کر میں نے اپنا گودام بنایا ہوا ہے۔ بظاہر یہ ایک گودام ہے مگر اس کے نیچے ایک خفیہ تہہ خانہ ہے جہاں میں نے بہت سی ایسی چیزیں رکھی ہیں جن کی تمہیں اور مجھے ضرورت پڑے گی۔“

ہم چائے پینے لگے۔ کریم بھائی نے بیڑی سلگالی۔ کہنے لگا۔

”تمہیں سب سے پہلے ہندوستان میں عام بولی اور لکھی جانے والی ہندی زبان سیکھنی ہو گی۔ یہ میں تمہیں چار مہینوں میں سکھا دوں گا۔ یہ کوئی مشکل زبان نہیں ہے ہندی بولنا لکھنا اور سمجھنا تمہارے مشن کے لئے انتہائی ضروری

ہے۔ میں یہاں کبھی کبھی آتا ہوں۔ مگر تمہیں غیر معینہ مدت تک اس کوارٹر میں رہنا ہو گا“

میں نے کہا۔

”مجھے تو منگل سوتر لینے کے لئے ساور دھن او تار کی مڑھی پر بیکانیر بھی جانا ہے۔“

کریم بھائی نے بیڑی کا کش لگانے کے بعد کہا۔

”وہ مجھے سب معلوم ہے۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔ وہاں تم کسی بھی وقت جا سکتے ہو۔ لیکن فی الحال تمہیں مستقل طور پر اس کوارٹر میں رہ کر مجھ سے ہندی زبان سیکھنی ہو گی۔ ہندی زبان جانے بغیر اپنے مقصد کی طرف ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے۔ یہاں کچن میں تمہیں ضرورت کی ہر شے موجود ملے گی۔ میں رات کو تمہیں ہندی پڑھایا کروں گا۔ ساتھ والے کمرے میں' میں نے تمہارے لئے دھوتی کرتے کے دو جوڑے رکھ دیئے ہیں۔ یہ لباس اتار کر انہیں پہن لینا۔ یہاں کبھی کوئی نہیں آتا۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا آدمی آجائے تو تم جینی ہندو بن کر اس سے بات کرنا۔ جین مت کے بارے میں تم بہت علم رکھتے ہو۔ یہ بات مجھے شیر علی نے اپنے خفیہ پیغام میں بتا دی تھی۔ اب میں جاتا ہوں۔ رات کو کسی وقت آؤں گا۔ کچن میں تمہارے لئے کافی راشن موجود ہے۔ کھانا وغیرہ تم خود تیار کرو گے۔ اب میں رات کو آؤں گا“

کریم بھائی چلا گیا۔

میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا کیونکہ میں جلدی آپ کو اس مقام پر لے جانا ہتا ہوں جہاں سے میرے اصل مشن کا آغاز ہوتا ہے۔ مختصراً ایسا ہے کہ میں تین مہینے یم بھائی کے اس ویران کوارٹر میں رہا۔ اس دوران کریم بھائی نے مجھے اس طریقے سے ری زبان پڑھائی کہ میں اس زبان کو بولنے سمجھنے اور اسے لکھنے کے قابل ہو گیا۔

اس دوران کریم بھائی دو تین بار کوارٹر کے پچھلے کمرے کے نیچے جو تہہ خانہ تھا وہاں

اکیلا ہی گیا۔ مجھے اس نے تہہ خانے میں جانے کی اجازت نہ دی۔ میں نے اس کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ میری ساری توجہ ہندی زبان سیکھنے کی طرف تھی۔ جب مجھے ہندی زبان میں کافی شد بد ہو گئی اور میں یہ زبان پڑھنے کے قابل ہو گیا تو کریم بھائی نے ایک رات مجھے اپنے سامنے بٹھالیا اور بیڑی سلگاتے ہوئے بولا۔

"تم نے جو اپنا نام داس ورتھنا رکھا ہے یہ بالکل موزوں نام ہے۔ اب تم اسی نام سے یہاں کے اونچے طبقے کی سوسائٹی میں اپنا تعارف کراؤ گے۔ تم نے مونچھیں بھی بڑھالی ہیں۔ ان کو زیادہ نہ بڑھانا۔ بس اسی طرح چھوٹی ہی رکھنا بالوں کو ذرا اور بڑھا کر ان کے پٹے بنالو اور جب بیکانیر جانے لگو تو ماتھے پر جین مت کا سرخ تلک ضرور لگالینا۔"

میں نے کریم بھائی سے کہا۔

"کریم بھائی! مجھے یہ بتاؤ کہ یہاں را کے کشمیر افیئرز والے ہیڈ آفس کے انچارج گوکل داس پانڈے سے روابط پیدا کرنے کے لئے کس راستے سے ہو کر جانا ہو گا؟"

کریم بھائی مسکرایا۔

"انڈیا کی اونچی سوسائٹی خاص طور پر ہندو سوسائٹی میں راہ و رسم بڑھانے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ شراب اور عورت ہے۔ شراب تم نہیں پیو گے کیونکہ تم ایک جینی ودوان اور جین دھرم کے کٹر پیروکار کی حیثیت سے گوکل داس پانڈے تک پہنچنا چاہتے ہو۔ اس کے لئے بھی کسی عورت کا سہارا بہت ضروری ہے۔ تم نے سنا ہو گا بلکہ اخباروں میں چھپی ہوئی تصویروں میں بھی دیکھا ہو گا کہ انڈیا کا سب سے بڑا لیڈر گاندھی بھی دو نوجوان لڑکیوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر جلسے جلوسوں میں آیا کرتا تھا۔ یہاں اس قسم کی باتوں کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ اونچے طبقے کی ہندو سوسائٹی کس قدر مادر پدر آزاد ہے اس کا اندازہ تمہیں خود آگے چل کر ہو جائے گا۔ میں تمہیں اپنی معلومات

کے حوالے سے اتنا ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ را ہیڈ آفس کے انچارج اور اسلام دشمن پاکستان دشمن کٹر جینی گوکل داس پانڈے کی صرف ایک ہی اولاد ہے اور وہ ایک جوان لڑکی ہے جس کا نام میناکشی ہے۔ وہ بڑی تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ اس نے شادی نہیں کی۔ وہ شادی کے خلاف ہے۔ آزاد خیال اور پوری فیشن ایبل لڑکی ہے۔ یہاں احمد آباد میں ایک پکی عمر کی خوش شکل ہندو عورت رینالینی سارا بائی نے اپنا ایک ڈانس سنٹر کھول رکھا ہے۔ گوکل داس پانڈے کی اکلوتی بیٹی میناکشی اسی ڈانس سنٹر میں میوزک اور ڈانس کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ تمہیں میناکشی تک رسائی حاصل کرنی ہو گی۔ اس کام میں میں تمہاری مدد کروں گا۔ میناکشی کے ذریعے تم بڑی آسانی سے را کے احمد آباد والے ہیڈ آفس کے انچارج جی ڈی پانڈے تک پہنچ سکو گے۔ لیکن سب سے پہلے اب تمہیں بیکانیر ساوردھن کی مڑھی پر جا کر منگل سوتر حاصل کرنا ہو گا۔"

میں نے اس سے پوچھا کہ بیکانیز وہاں سے کتنی دور ہے اور مجھے کس روز وہاں جانا ہے۔ کریم بھائی نے جواب دیا۔

"تم اسلام کے کمانڈو سپائی ہو اور کمانڈو سپائی کے پاس ضائع کرنے کے لئے وقت نہیں ہوتا۔ تم کل صبح بیکانیر کی طرف روانہ ہو جاؤ گے۔ میں تمہیں یہاں سے اٹھا کر ریلوے سٹیشن تک چھوڑ آؤں گا۔ بیکانیر کے لئے احمد آباد سے صبح صبح ایک ٹرین روانہ ہوتی ہے۔ تم اس ٹرین کے ذریعے بیکانیر پہنچو گے۔ آگے تمہیں معلوم ہے کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔"

میں غور کرنے لگا۔ بہت ہی باتوں پر مجھے غور کرنا تھا۔ میں کانٹوں سے بھرے ہوئے سا میں داخل ہو رہا تھا۔ اس میں داخل ہونے سے پہلے مجھے کئی باتیں سوچنی تھیں۔ کئی سا پر غور کرنا تھا۔ کریم بھائی کہنے لگا۔

"تمہارے اسپرو ٹیبلٹ بم کی پندرہ ٹکیاں میں نے نیچے تہہ

خانے میں سنبھال کر رکھ لی ہیں۔ ان بموں کا فارمولا بھی ان کے ساتھ ہی
میرے پاس محفوظ ہے۔ جس وقت ان چیزوں کے استعمال کا وقت آئے گا تم
یہاں سے لے جا سکتے ہو۔ تہہ خانے کی ایک فالتو چابی میں نے پچھلے کمرے میں
لکڑی کی جو الماری ہے اس کے اوپر رکھ دی ہے۔ میرے ساتھ آؤ میں تمہیں
دکھاتا ہوں"

کریم بھائی مجھے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ یہاں فرش ایک میلی کچیلی سی دری سے
ڈھکا ہوا تھا۔ کونے میں لکڑی کی بڑی الماری تھی۔ کریم بھائی نے اوپر ہاتھ ڈال کر چابی لی
پھر کونے میں ایک جگہ دری کو فرش پر سے ہٹایا۔ نیچے لکڑی کے فرش میں ایک جگہ سے
چوکھٹا ہٹایا۔ نیچے لکڑی کا زینہ اترتا تھا۔ آگے چھوٹا سا دروازہ تھا۔ یہاں تالا لگا تھا۔ کریم
بھائی نے چابی لگا کر تالا کھولا۔ دروازہ کھول کر اندر بٹن دبایا۔ تہہ خانے میں دھندلی سی
روشنی ہو گئی۔ یہاں چھوٹی میز کے آمنے سامنے دو سٹول پڑے تھے دیوار کے ساتھ
الماری تھی۔ کریم بھائی نے الماری کا نچلا خانہ کھولا اس کے اندر دو ٹرانسمیٹر رکھے تھے
ایک ریڈیو ٹرانسمیٹر تھا جس کے ذریعے پیغام بول کر دیا بھی جا سکتا تھا اور پیغام سنا بھی جا سکتا
تھا۔ دوسرا چھوٹا ٹرانسمیٹر تھا جس کے ذریعے صرف پیغام کے سگنل ہی دیئے جا سکتے تھے۔

کریم بھائی نے مجھے دونوں ٹرانسمیٹر دکھاتے ہوئے کہا۔

"ان پر دلی میں شیر علی اور کشمیر میں کمانڈو شیروان کے ساتھ ہمارا رابطہ
قائم رہے گا۔ شیر علی نے دلی میں تمہیں وہ خفیہ سگنل بتا دیئے ہوں گے جن
کے ذریعے تم اس سے اور کمانڈو شیروان سے رابطہ کر سکتے ہو۔"

میں نے کہا۔

"ہاں۔ وہ خفیہ کوڈ سگنل مجھے یاد ہیں"

کریم کہنے لگا۔

"اب میں تمہیں وہ خفیہ اشارے سمجھاتا ہوں جن کے ذریعے تم یہاں
میرے ساتھ اس ٹرانسمیٹر پر مجھ سے بات کر سکتے ہو۔"

اس نے ایک ریڈیو ٹرانسمیٹر اون کر دیا۔ سیٹیوں کی آوازیں ابھریں۔ پھر یہ آوازیں
بند ہو گئیں۔ کریم بھائی نے ایک ناب پر تین بار خاص انداز میں خاص خاص وقفوں کے
ساتھ انگلی بجائی۔ تین بار مختلف ویو۔ستم کے سگنل کی ٹون سنائی دی۔ اس نے کہا۔

"یہ مجھ سے رابطہ قائم کرنے کا خفیہ اشارہ ہے"

اس کے بعد کریم بھائی نے مجھے اپنے دونوں ٹرانسمیٹروں کی فریکو۔نسی بتائی۔ بلکہ مجھے
زبانی یاد کرا دی۔ کہنے لگا۔

"اس فریکو۔نسی پر خفیہ سگنل کا اشارہ دے کر تم مجھ سے بات کر سکتے
ہو۔ میں ہر رات کو بارہ بجے سے ایک بجے تک اس تہہ خانے میں موجود ہوتا
ہوں۔ اس وقت تم مجھ سے ریڈیو ٹرانسمیٹر پر بات کر سکتے ہو۔ جو پیغام دینا ہو
مجھے دے سکتے ہو"

میں نے کہا۔

"شیر علی نے بھی یہی ٹائم دیا ہے۔ یعنی رات کے بارہ بجے سے لے کر
ایک بجے تک"

کریم بھائی کہنے لگا۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ رات کو فضا میں ریڈیو ٹیلی ویژن اور ٹیلی فون اور
فوجی وائرلیس کے سگنلز اتنے زیادہ نہیں ہوتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرے
دونوں ٹرانسمیٹر میں ایک اضافی ٹیپ لگی ہوئی ہے اس ٹیپ پر دن کے وقت
میری عدم موجودگی میں بھی تمہارا پیغام اس پر ریکارڈ ہو جائے گا جو مجھ تک پہنچ
جائے گا۔"

اس نے الماری کا خانہ بند کر دیا اور تہہ خانے کا دروازہ لاک کر کے ہم سیڑھیاں
چڑھ کر اوپر والے کمرے میں آ گئے۔

اس نے تہہ خانے کی چابی الماری کے اوپر کونے میں رکھ دی

"یہاں یہ چابی محفوظ رہتی ہے۔"

میں نے کمرے میں آکر پوچھا۔

"کریم بھائی! یہ سگنلز تو پکڑے بھی جا سکتے ہیں۔ کیا کبھی اس قسم کا کوئی واقعہ تو نہیں ہوا؟"

کریم بھائی نے مسکراتے ہوئے ہو کہا۔

"میرے کمانڈو دوست! یاد رکھو۔ کمانڈو سپائی کی سب سے بڑی کمزوری اس کے ریڈیو ٹرانسمیٹر کے خفیہ سگنلز ہوتے ہیں۔ یہ سگنلز اگر دشمن کے ریڈار پر یا اس کے وائرلیس ریسوینگ سیٹ پر پکڑے جائیں تو دشمن ان کی مدد سے کمانڈو سپائی کو پکڑ سکتا ہے۔ یہ سگنلز دشمن کو کمانڈو سپائی کے گھر تک لے آئیں گے۔ اس اعتبار سے یہ سگنلز اگر کمانڈو کے دوست ہیں۔ مددگار ہیں تو اس کے سب سے بڑے دشمن بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان سے کسی حد تک بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ٹرانسمیٹر پر اشد ترین ضرورت کے وقت پیغام نشر کرو۔ دوسرے یہ کہ دو تین دفعہ پیغام نشر کرنے کے بعد فریکوئنسی تبدیل کر دو۔ میں نے تمہیں ایک ہی فریکوئنسی بتائی ہے۔ اس فریکوئنسی کے شروع اور آخر میں ویونتھ کو تھوڑا آگے پیچھے کرو گے یعنی اس کی رفتار میں

ایک سیکنڈ کے وقف سے کمی بیشی کرتے رہو گے تو دشمن کو یہ شک نہیں پڑے گا کہ یہ ہر بار ایک ہی فریکوئنسی پر ایک ہی طرح کے سگنل کہاں سے نشر ہو رہے ہیں۔ میرا خیال ہے تم اچھی طرح سمجھ گئے ہو گے"

میں ریڈیو سگنلز میں کافی ٹریننگ لے چکا تھا۔ کریم بھائی کی باتیں اگرچہ ٹیکنیکل تھیں مگر میں انہیں پوری طرح سمجھ گیا تھا۔ میں نے کریم بھائی سے کہا کہ میرے پاس کوئی ایسا چھوٹے چھوٹے سے سائز کا ریڈیو ٹرانسمیٹر ضرور ہونا چاہئے جس کے ذریعے ہنگامی حالات میں میں کم از کم احمد آباد کی فضا کے اندر رہ کر آپ تک کوئی ضروری پیغام پہنچا سکوں۔ کیونکہ ہنگامی حالات میں اس جگہ آنے میں دیر بھی ہو سکتی ہے۔

اس پر کریم بھائی نے جواب دیا۔

"اس مشکل کا حل میں نے پہلے ہی سے تیار کر رکھا ہے۔ میں تمہیں ایک سگریٹ کیس دوں گا جس کے ساتھ ہی چھوٹا سا سگریٹ لائٹر لگا ہو گا۔ یہ لائٹر اصل میں ریڈیو ٹرانسمیٹر ہو گا۔ ایک منٹ ٹھہرو۔"

یہ کہہ کر کریم بھائی اٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا۔ جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا پلاسٹک کا چھوٹا لفافہ تھا۔ میرے پاس بیٹھ کر اس نے لفافے میں سے سیاہ رنگ کی کسی دھات سے تیار کیا ہوا عام قسم کا سگریٹ کیس نکال کر مجھے دکھایا۔ اسے کھولا۔ اس کے اندر سگریٹ بھرے ہوئے تھے۔ پھر اس نے سگریٹ کیس بند کیا۔ سگریٹ کیس کے کونے میں سگریٹ لائٹر تھا جس میں ایک بٹن لگا تھا۔ اس نے بٹن بار بار دبایا۔ بار بار شعلہ نکل کر بجھ جاتا۔ اس نے اس بٹن کو انگلی کے دباؤ سے ذرا سا نیچے کر دیا۔ پھر بٹن دبایا کہ لائٹر میں سے شعلہ نہ نکلا۔ اس کی جگہ سگنل کی ہلکی ہلکی ٹون سنائی دی۔ کریم بھائی مجھے سمجھاتے ہوئے بولا۔

"اب یہ سگریٹ لائٹر ریڈیو ٹرانسمیٹر کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس پر تم میرے ٹرانسمیٹر سیٹ کی فریکوئنسی مقرر کر کے جہاں سے چاہو مجھے سگنل کے ذریعے پیغام پہنچا سکتے ہو۔ مگر تم صرف خفیہ کوڈ سگنل ہی میں پیغام پہنچا سکو گے۔ مجھ

سے بات نہ کر سکو گے۔ یہ یہاں میرے پاس ہی پڑا رہے گا۔ جب تم بیکانیر ساور دھن او تار کا منگل سوتر حاصل کر کے واپس آؤ گے تو میں یہ تمہارے حوالے کر دوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا۔ سگریٹ کیس کو دوسرے کمرے میں لے جا کر کسی جگہ چھپا کر رکھ دیا۔ جس کا مجھے بھی علم نہیں تھا۔ واپس میرے پاس آ کر کہنے لگا۔

"اب میں جاتا ہوں۔ کل صبح تیار رہنا۔ اور کپڑے بھی بدل لینا۔ اس پتلون جیکٹ کی بجائے سفید کھدر کا کرتہ' سفید پاجامہ چپل اور بادامی رنگ کی کھدر کی نہرو جیکٹ پہن لینا۔ یہ سارے کپڑے دوسرے کمرے میں چارپائی پر پڑے ہیں۔

اتنا کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ بند کیا اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کچن میں جا کر انڈوں کا آملیٹ بنایا اور اسے ڈبل روٹی کے ساتھ کھا کر سو گیا۔

صبح اس وقت اٹھا جب کریم بھائی مجھے جگا رہا تھا۔

"سٹیشن چلنا ہے۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ"

میں جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر تیار ہو گیا۔ میں نے کھدر کا پاجامہ کرتہ اور کھدر صدری پہن لی تھی۔ کریم بھائی نے جیب سے چھوٹی سی شیشی نکالی۔ اس میں تلک لگ والا سرخ رنگ تھا۔ اس نے میرے ماتھے پر جینی دھرم کے طریقوں کے مطابق میرے ماتھے پر تلک لگا دیا اور کہنے لگا۔

"اب تم پورے داس وردھنا جینی ہندو بن گئے ہو۔ اپنا نام یاد رکھنا۔ داس وردھنا یعنی جین مت کے بانی مہاویر وردھنا کا نوکر۔ اپنے ماضی کے بارے میں تم نے مجھے جو کچھ بتایا تھا وہی بیان یاد رکھنا۔ یعنی تمہاری پیدائش دلی میں ایک جینی ہندو گھرانے میں ہوئی۔ تمہارے ماں باپ تمہیں چار پانچ سال کا چھوڑ کر ٹرین کے حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ تمہارے ایک رشتے دار نے تمہیں اناتھ آشرم یعنی دلی کے یتیم خانے میں داخل کروا دیا۔ دلی کا یہ جینی اناتھ آشرم بڑا

مشہور ہے۔ وہاں تم میٹرک تک پڑھے۔ پھر ایک بوڑھا جینی اور اس کی بیوی تمہیں بیٹا بنا کر امریکہ لے گئے۔ وہاں تم ایک کالج میں دو سال تک پڑھتے رہے۔ جب دونوں بوڑھا بوڑھی مر گئے تو تم واپس ہندوستان آ گئے۔ تم پر جین دھرم کا بڑا اثر تھا۔ چنانچہ تم مہاویر کی طرح ہندوستان کے جنگلوں میں نکل گئے اور چھ سال تک تپسیا کرتے اور رشی منی جوگیوں کی خدمت کرتے اور ان سے جین دھرم کے بارے میں گیان حاصل کرتے رہے۔ اب احمد آباد آ گئے ہو اور یہاں جین دھرم کی خدمت کر کے باقی زندگی بسر کرنا چاہتے ہو۔ تمہیں دنیا کا کوئی لالچ نہیں ہے اور تم نے شادی بھی اس لئے نہیں کی۔ بس اس کہانی کو پوری طرح یاد کر رکھنا۔ اب چلو سٹیشن پر چلتے ہیں۔ تمہیں پیسوں کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے لو۔"

میں نے کہا۔

"میرے پاس شیر علی کے دیئے ہوئے کافی روپے ہیں اگر ضرورت پڑی تو واپس آ کر لے لوں گا"

کریم بھائی اور میں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اس نے گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"یہاں تمہیں میں کبھی دقت یا کمی محسوس نہیں ہو گی۔ ہندوستان کے مسلمان پاکستان کو طاقت ور دیکھنے اور اسلام کے نام کو سربلند کرنے کی خاطر اپنی جانیں بھی قربان کر سکتے ہیں۔ ہماری ایک ایسی خفیہ تنظیم یہاں احمد آباد میں موجود ہے۔ جو اس مقصد کے لئے ہر قسم کا مالی تعاون کرے گی۔"

احمد آباد کے ریلوے اسٹیشن تک پہنچتے پہنچتے دن نکل آیا تھا۔ کریم بھائی نے اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر ایک جگہ گاڑی روک لی۔ کہنے لگا۔

"میں نے تمہیں اپنی دکان نہیں دکھائی۔ میں اپنے ساتھ تمہیں دکان پر لے جانا بھی نہیں چاہتا۔ تم اگر کبھی آئے بھی تو ایک عام ہندو گاہک داس وردھنا کے

روپ میں آؤ گے۔ ابھی تم بیکانیر جا رہے ہو۔ ہو سکتا ہے وہاں تمہیں دو تین دن لگ جائیں۔ جب واپس آؤ تو یہاں ریلوے اسٹیشن ہی سے مجھے اس نمبر پر ٹیلی فون کر دینا۔ میں تمہیں لینے یہاں آجاؤں گا۔ خدا حافظ!" اس نے مجھے ٹیلی فون نمبر لکھ کر دے دیا۔ اور مجھے اتار کر چلا گیا۔ میں اسٹیشن کی عمارت کی طرف چل پڑا۔

معلوم ہوا بیکانیر کو کوئی گاڑی سیدھی نہیں جاتی۔ جودھ پور سے گاڑی بدلنی پڑتی۔ جودھپور جانے والی گاڑی کے چلنے میں ابھی گھنٹہ سوا گھنٹہ رہتا تھا۔ یہ وقت میں نے بک سٹال پر ہندی اردو انگریزی کے رسالے دیکھتے اور کاؤنٹر پر آکر چائے پیتے گذار دیا۔ پلیٹ فارم پر کافی رونق تھی۔ یہاں آکر مجھے پہلی بار اپنی ایک شدید غلطی کا احساس ہوا۔ وہ غلطی یہ تھی کہ میں گجراتی جینی خاندان میں پیدا ہوا تھا اور مجھے گجراتی زبان بالکل نہیں آتی تھی۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ اپنی فرضی کہانی میں اپنے ماں باپ کو گجراتی نہیں بلکہ اتر پردیش کے جین بت کو ماننے والے ہندو ظاہر کروں گا۔ کیونکہ یہ ایک ایسی فاش غلطی تھی کہ میں کہیں بھی پکڑا جا سکتا تھا۔ یہ بات میں نے اپنے ذہن میں پکی کر لی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ عین وقت پر میں نے اپنی خطرناک غلطی درست کر لی۔

جودھپور جانے والی گاڑی آگئی۔ یہ پسنجر قسم کی گاڑی تھی۔ راجستھان کے دیہاتی مسافروں سے پہلے ہی بھری ہوئی تھی۔ مجھے بھی ایک ڈبے میں تھوڑی سی جگہ مل گئی۔ یہ سفر بھی کافی لمبا تھا۔ اور ریگستانی علاقے کا سفر تھا۔ گاڑی تقریباً ہر اسٹیشن پر رکتی تھی۔ بڑا شہر میہنا آیا۔ صحرائی میدان شروع ہو گئے تھے۔ کہیں کہیں سرسبز کھیت کا ٹکڑا نظر آجاتا تھا۔ سردوہی شہر آیا۔ پھر گڈوار۔ یہاں پہنچتے پہنچتے دوپہر ہو گئی۔ شام کے وقت ٹرین مارواڑ پہنچی۔ گجرات کاٹھیاواڑ کے لوگوں کے مقابلے میں یہاں کے لوگ اونچے لمبے تھے۔ بوڑھوں نے بڑی بڑی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ داڑھیاں درمیان سے مانگ نکال کر اوپر کو باندھی ہوئی تھیں۔ سر پر بڑے بڑے پڑی دار پگڑ تھے۔ دیہاتی عورتوں نے چاندی کے زیور اور کہنیوں تک کانچ کی چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ کافی انتظار کے بعد گاڑی راجستھان

کے بڑے شہر جودھپور پہنچی۔ یہاں سے میں نے بیکانیر کے لئے گاڑی بدلی۔ دوسری گاڑی رات کے دس بجے چلی۔ میں نے جگہ بنا لی تھی۔ دو تین گھنٹے سویا رہا۔ آنکھ کھلی تو ناگور کے اسٹیشن پر گاڑی رکی ہوئی تھی۔ ناگور شہر راجستھان کا بڑا مشہور شہر ہے۔ اس شہر نے بڑے عالم فاضل مسلمان شاعر علماء اور دانشور پیدا کئے ہیں۔

صبح ہو رہی تھی کہ ٹرین بیکانیر پہنچ گئی۔

خدا کا شکر ادا کیا۔ بڑا تھکا دینے والا بلکہ بور کر دینے والا سفر تھا۔ سفر میں دو ایک مسافروں سے باتیں بھی ہوتی رہیں۔ میں نے انہیں اپنا نام داس وردھن ہی بتایا اور کہا کہ بیکانیر میں اپنی ماسی کے ہاں ان سے ملنے جا رہا ہوں۔ بیکانیر ایک بارونق شہر تھا۔ یہ میں آج سے تقریباً پچیس سال پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ یہاں کافی تاریخی قلعے اور محلات تھے۔ مگر میرا ٹارگٹ اوتار ساوردھن کی مڑھی تھی جو بیکانیر شہر سے آٹھ میل شمال مشرق کی طرف واقع تھی۔ اس جگہ کا نام نندی کندہ ہے۔ یہاں سنگ مرمر کی چھتریوں والی کتنی ہی مڑھیاں ہیں۔ یہ ایک طرح کا قبرستان ہے جہاں روایت کے مطابق کسی راجہ کی چہیتی داشتاؤں کی ہڈیاں دفن ہیں۔

بیکانیر کے اسٹیشن سے میں سیدھا ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں گیا۔ ایک کمرہ کرائے پر لے کر غسل کیا۔ ناشتہ کیا اور پھر ایک ٹیکسی لے کر نندی کنڈ کی چھتریوں والی مڑھیوں کی طرف روانہ ہو گیا۔ سارا راستہ صحرائی تھا اور ریت کے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں میں سے ہو کر جاتا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو راستہ اور منزل معلوم تھی۔ آٹھ میل کا فاصلہ ایک گھنٹے ہی طے ہوا۔ میں سنگ مرمر کی مڑھیوں میں پہنچ گیا۔ ٹیکسی نے اپنے پاس ہی رکھی۔ ایک جگہ چھوٹا سا جین مندر بنا ہوا تھا۔ یہی اس گیانی پنڈت کا گھر تھا۔ جس سے میں جین مت کا اہم ترین نشان چار گانٹھوں والا منگل سوتر لینے آیا تھا۔ جینی پنڈت ایک کوٹھری میں اوتار ساوردھن کی مڑھی کے قریب بیٹھے تھے۔ دو ملازم ان کی خدمت کر رہے تھے۔ میں نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو بڑی بے نیازی سے فرمایا۔

"تم ابھی نوجوان ہو۔ پہلے جین دھرم کا پورا گیان حاصل کرو تب میرے پاس

منگل سوتر لینے آنا"

میں نے انہیں سمجھایا کہ میں بچپن ہی سے جین مت کا پرستار ہوں۔ خود بھی جینی ماتا پتا کا بیٹا ہوں۔ آپ میرا امتحان لے لیں اگر کامیاب ہو گیا تو منگل سوتر دے دیجئے گا۔ پنڈت نے سفید رومال سر پر باندھ رکھا تھا۔ وہ سفید لباس میں تھا۔ کہنے لگا۔ "تم کس لئے منگل سوتر کی خواہش کر رہے ہو؟" میں نے سب کچھ پہلے ہی سے طے کر رکھا تھا کہ مجھے پنڈت کے اس قسم کے سوالات کے کیا جواب دینے ہیں۔ میں نے کہا۔

"گورو دیو! میں اناتھ ہوں۔ میں برہم چاری بھی ہوں۔ میں اپنا جیون جین مت کے پرچار میں گذار دینا چاہتا ہوں۔ اس سنسار کا مجھے کوئی لالچ نہیں ہے"

پنڈت نے مجھے غور سے دیکھا اور کہا۔

"جیسی تمہاری اچھیا۔ مگر منگل سوتر ہم اسی کو دیتے ہیں جو جین دھرم کا وردان ہوتا ہے۔ تمہیں میرے کچھ سوالوں کے جواب دینے ہوں گے کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟"

میں نے کہا "میں تیار ہوں گورو جی!"

پنڈت مجھ سے جین مت کے بارے میں بہت ہی ابتدائی معلومات کے متعلق پوچھتا رہا۔ میں نے جین دھرم کی ساری تاریخ پڑھ رکھی تھی۔ ہر سوال کا جواب دیتا گیا۔ آخر میں پنڈت نے ایک ایسا سوال کیا جس کا جواب ایک عام جینی شاید نہیں دے سکتا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

"یہ بتاؤ کہ جین مت اور بدھ مت میں کیا فرق ہے"

اگر گوتم بدھ اور مہاویر وردھن کی زندگی کے حالات اور تعلیمات کو دیکھا جائے تو ان دونوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ دونوں راج کمار تھے۔ دونوں جوانی میں راج محل چھوڑ کر نروان کی تلاش میں جنگلوں میں نکل گئے۔ دونوں نے محبت اور رحم کا پرچار کیا۔ دونوں آواگون کے قائم تھے۔ دونوں ذات پات کی تقسیم کے خلاف تھے۔ دونوں مورتیوں کی پوجا کے خلاف تھے۔ مگر ان دونوں کی تعلیمات میں ایک بڑا باریک مگر بڑا بنیادی فرق

تھا۔ فرق یہ تھا کہ گوتم بدھ اس بات کا قائل تھا کہ انسان بھوکا رہ کر اور اپنے جسم کو تکلیف پہنچا کر ٹارچر کر کے نروان حاصل نہیں کر سکتا۔ ضروری ہے کہ انسان غذا بھی کھائے اور جسم کو تکلیف نہ پہنچائے اور فاقہ کشی نہ کرے۔ جب کہ جین مت کا بانی مہاویر کہتا ہے کہ صرف فاقہ کشی اور جسم کو ٹارچر کرنے ہی سے نروان مل سکتا ہے۔ یہ جین مت کے بنیادی عقیدے میں شامل ہے۔ چنانچہ جین دھرم کے ماننے والوں میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے تو وہ کھانا پینا بند کر دیتا ہے اور فاقے کی وجہ سے ایک روز خاموشی سے مرجاتا ہے۔ جینی اسے نروان اور نجات کی موت کہتے ہیں۔

جب میں نے پوری تفصیل کے ساتھ پنڈت کو جین مت اور بدھ مت کا بنیادی فرق سمجھایا تو وہ بڑا خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

"دھن ہو دھن ہو۔ تم واقعی جینی دھرم کے وردان ہو۔ میں اپنے ہاتھ سے تمہیں جینی منگل سوتر پہناؤں گا۔"

اس نے صندوق میں سے کیسری رنگ کا منگل سوتر نکالا۔ یہ دس بارہ دھاگوں کو جوڑ کر انہیں بٹ دے کرائی کی طرح بنایا ہوا تھا۔ اس میں یکساں فاصلے پر چار گانٹھیں تھیں۔ پنڈت نے میرے بائیں ہاتھ کی کلائی میں منگل سوتر باندھا اور بولا۔

"اب تمہیں ایک سو روپے رکھشا دینی ہوگی"

میں نے اسی وقت سو روپے کا نوٹ نکال کر پنڈت کو دے دیا۔ نوٹ اپنی واسکٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے بولا۔

"مگر ابھی ایک رسم باقی ہے"

"وہ کیا؟ وہ بھی بتا دیجئے گورو دیو!"

پنڈت کہنے لگا۔

"تم بڑے خوش قسمت ہو کہ اتنی چھوٹی عمر میں منگل سوتر حاصل کر لیا ہے۔ لیکن تمہیں اوتار ساوردھن کی مڑھی پر ایک رات بیٹھ کر ہری اوم کا جاپ کرنا ہوگا۔ تم ایک لاکھ مرتبہ ہری اوم کا جاپ کرو گے۔ رات کے پچھلے پہر

جب تم ایک لاکھ مرتبہ ہری اوم کا جاپ کر چکو گے تو ساوردھن اوتار کی مڑھی کے سرہانے والے سوراخ میں سے سفید روشنی نکلے گی۔ پھر یہ روشنی سرخ ہو جائے گی۔ اس کا مطلب ہو گا کہ اوتار ساوردھن نے تمہارا منگل سوتر سوئیکار (قبول) کر لیا ہے۔ اگر روشنی سرخ نہ ہوئی اور سفید ہی رہی اور تھوڑی دیر بعد غائب ہو گئی تو اس کا مطلب ہو گا کہ اوتار ساوردھن نے تمہارے منگل سوتر کو قبول نہیں کیا۔ پھر تمہیں یہ سوتر مجھے واپس کرنا ہو گا۔ اگر تم نے منگل سوتر مجھے واپس نہ کیا اور بھاگ گئے تو تم ایک لاکھ چوراسی ہزار مرتبہ چوہے کی شکل میں جنم لو گے اور تمہیں کبھی نروان نہ مل سکے گا۔"

میں سمجھ گیا کہ پنڈت نے یہ محض پیسہ کمانے کا ڈھکوسلہ بنایا ہوا ہے۔ کیونکہ اس نے مجھے یہ بھی کہا تھا کہ اگر روشنی سرخ ہو گئی تو تم مزید دو سو روپے روشنی والے سوراخ میں ڈالو گے۔ یہ تمہاری رکھشا ہو گی۔ میں نے کہا۔

"میں اس امتحان کے لئے بھی تیار ہوں گورو دیو" مجھے اس امتحان کے لئے ساوردن اوتار کی مڑھی پر کس وقت جانا ہو گا؟"

پنڈت نے بتایا کہ رات جب آدھی گذر جائے گی تب میں اوتار ساوردھن کی مڑھی پر جا کر بیٹھ جاؤں گا اور ایک لاکھ مرتبہ ہری اوم کا جاپ کروں گا۔ یہ پنڈت بھی جانتا تھا کہ کوئی انسان اتنے تھوڑے وقت میں ایک لاکھ بار ہری اوم کا جاپ نہیں کر سکتا۔ مگر اس نے یہ فراڈ ایسے ہی چلا رکھا تھا۔ میں نے کہا۔

"میں آج ہی آدھی رات کو مڑھی پر بیٹھ جاؤں گا"

میں نے پنڈت سے اجازت لی اور ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے ہوٹل میں آ گیا۔ دوپہر کو ہوٹل میں کھانا کھایا اور یونہی بیکانیر شہر کی سیر کرنے نکل پڑا۔ یہاں گرمی بہت تھی۔ بازاروں میں قسم قسم کی چیزیں بک رہی تھیں۔ کئی غیر ملکی سیاح بازار میں گھوم رہے تھے۔ مجھے ایک بازار کے کونے پر ایک مسجد کا گنبد اور مینار نظر آئے۔ دل پر ایک دم خوشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ ابھی تک میں ہندو بن کر کفر بک رہا تھا۔ میرے

لئے اب لازم ہے کہ اس مسجد میں جاؤں اور اگر دو نفل نہیں پڑھ سکتا تو مسجد کے امام صاحب سے ہی یونہی دو چار باتیں کر لوں۔ چنانچہ میں مسجد میں آ گیا۔ چھوٹی سی مسجد تھی۔ امام صاحب بوڑھے آدمی تھے۔ صحن میں ایک طرف محراب پر چڑھی ہوئی بیل کی چھاؤں میں بیٹھے کوئی کتاب گھٹنوں پر رکھے پڑھ رہے تھے۔ میرے ماتھے پر تلک لگا تھا۔ میرا پہناوا بھی ہندوؤں ایسا تھا۔ اسی لئے مسجد کے اندر صحن میں نہ گیا۔ وہیں کھڑا رہا۔ امام صاحب کی نگاہ مجھ پر پڑی تو دور ہی سے پوچھا کہ کیا بات ہے بھائی۔ تم شکل و صورت سے مسلمان نہیں لگتے۔ یہاں کیسے آئے ہو؟ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"مندر مسجد کو میں بھگوان کا گھر ہی سمجھتا ہوں۔ بس ادھر سے گذرا تو من میں خیال آیا کہ بھگوان کے گھر کو پرنام کرتا چلوں"

امام صاحب ذرا سا مسکرائے۔ انہوں نے مجھے مسجد میں آنے کے لئے بالکل نہ کہا۔ بس اتنا کہہ کر مطالعے میں مشغول ہو گئے

"اچھا اچھا"

میں نے مسجد کے محراب پر لکھے ہوئے کلمہ طیبہ کو دو تین بار دل میں پڑھا۔ خدا سے اپنی کفر کی باتوں کی معافی مانگی اور امام صاحب کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کر کے واپس چل دیا۔ مسجد کے دروازے سے نکل کر میں اپنے ہوٹل کی طرف چلنے لگا۔ سوچا تھوڑا سا آرام کر لینا چاہئے۔ ساری رات جاگنا ہے۔ مجھے کچھ ایسے لگا تھا کہ جب میں مسجد سے نکلا تھا تو بازار کی دوسری طرف دکان کے باہر ایک آدمی کرسی پر بیٹھا تھا اور اس نے مجھے گھور کر دیکھا تھا۔ اور جب میں بازار میں چلنے لگا تھا تو وہ بھی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ میں چلتے چلتے محتاط ہو گیا۔ آخر میں نہ تو ہندو تھا اور نہ کوئی عام مسلمان شہری تھا۔ میں دشمن ملک میں کمانڈو سپائی کی حیثیت سے ایک انتہائی اہم مشن پر آیا ہوا تھا۔ اس آدمی کی دھندلی سی شکل میں نے دیکھ لی تھی۔ میں بظاہر بڑی بے نیازی سے بازار میں ایک طرف ہو کر چل رہا تھا لیکن میری چھٹی بلکہ ساتویں حس بھی بیدار ہو چکی تھی۔ یہ سوچ کر ایک لمحے کے لئے میں واقعی پریشان ہو گیا کہ میرے پاس سنٹرل سیکرٹ پولیس کے خفیہ نمبر والا کارڈ نہیں

تھا۔ وہ میں کریم بھائی کے تہہ خانے کی الماری میں ہی دوسری چیزوں کے ساتھ چھوڑ آیا تھا۔ چلتے چلتے میں رک گیا۔ میں تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ جس شخص کو میں نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے دیکھا تھا وہ میرا تعاقب کر رہا ہے یا نہیں۔

میں رک کر دکانوں کے بورڈ پڑھنے لگا۔ یہ ظاہر کیا جیسے مجھے کسی خاص دکان کی تلاش ہے۔ پھر اپنی نگاہیں دکانوں کے باہر لگے بورڈوں پر ڈالتے ہوئے میں نے گردن گھما کر پیچھے نگاہ ڈالی۔ بازار میں کوئی رش بالکل نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ جو آدمی مجھے مسجد سے باہر نکلتے دیکھ کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا وہ مجھ سے کوئی پندرہ بیس قدموں کے فاصلے پر ایک دکان کے باہر کھڑا دکاندار سے باتیں کر رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اس نے بھی گردن موڑ کر میری طرف دیکھا اور پھر دکاندار سے باتیں کرنے لگا۔

یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ یہ شخص خفیہ پولیس کا آدمی ہے اور میرا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ میرا پیچھا کرنے میں حق بجانب تھا۔ کیونکہ میرا حلیہ ہندوؤں والا تھا اور میں مسجد سے باہر نکلا تھا۔ اسی بات پر اسے شک ہوا ہو گا کہ اگر میں ہندو ہوں تو مسجد میں کیا لینے گیا تھا۔ اگر مسلمان ہوں تو میں نے ہندوؤں والا حلیہ کیوں بنا رکھا ہے۔ یہ پاکستان کا سرحدی شہر تھا۔ بیکانیر سے آگے مغرب کی جانب بارڈر کا صحرا تھا۔ یہاں بڑی سخت سکیورٹی تھی۔ چنانچہ وہ یہ معلوم کرنے کے لئے میرا خاموشی سے پیچھا کرنے لگا تھا کہ اصل میں' میں کون ہوں؟ کہیں پاکستان کا جاسوس تو نہیں ہوں؟ وہ وہیں مجھے روک کر مجھ سے پوچھ گچھ شروع کر سکتا تھا۔ مجھے تھانے بھی لے جا سکتا تھا۔ میں انڈیا کے بارڈر شہر میں تھا اور سکیورٹی یہاں سخت تھی اور پولیس کی انٹیلی جینس کو بڑے اختیارات حاصل تھے۔ اگر اس شخص نے مجھ پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا تو اس کی وجہ محض یہ تھی کہ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کس کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں اور میرے ساتھ اور کون کون ہے۔ یہ میری سوچ تھی۔

اب میرا ذہن بھی الرٹ ہو گیا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ واپس اپنے ہوٹل نہ جاؤں اور خفیہ پولیس والے کو جل دے کر کسی طرف غائب ہو جاؤں اور آدھی رات تک وہیں بیٹھا رہوں۔ اس کے بعد ٹیکسی لے کر چھتریوں والی مڑھیوں کی طرف چل لوں۔ پھر سوچا

کہ ایسا کرنے سے خفیہ پولیس کا شک یقین میں بدل جائے گا کہ میں واقعی پاکستانی جاسوس ہوں۔

ہوٹل وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں ہوٹل میں آ گیا۔ یہاں میں نے اپنا نام داس وردھن ہی لکھوایا تھا اور یہ بھی لکھوایا تھا کہ میں احمد آباد میں رہتا ہوں اور یہاں اوتار سادردھن کی مڑھی کی یاترا کرنے آیا ہوں۔ میں نے ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا کہ وہ شخص برابر میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ اس وقت مجھے سیکرٹ پولیس کے جادو اثر نمبر والا خفیہ کارڈ بہت یاد آیا۔ اگر وہ میرے پاس ہوتا تو اس انٹیلی جینس کے آدمی سے ایک سیکنڈ میں نجات حاصل کر سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا مشن اتنا بڑا تھا کہ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں میں خاطر میں نہیں لانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ بعض اوقات یہ چھوٹی چھوٹی پریشانیاں اور کسی معمولی سی آئی ڈی کے آدمی کی پوچھ گچھ بڑے سے بڑے کمانڈو سپائی کے بڑے سے بڑے مشن کو خاک میں ملا دیتی ہیں۔ مجھے بیکانیر کے اس معمولی سے خفیہ پولیس افسر سے الجھن ہونے لگی تھی۔

میں اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ شام کو میں نے کھانا بھی کمرے میں ہی منگوایا۔ اسی دوران کوئی ناخوشگوار واقعہ نہ ہوا۔ میں ایک تربیت یافتہ تجربہ کار کمانڈو تھا۔ میں اس خوش فہمی میں کبھی مبتلا نہیں ہو سکتا تھا کہ خفیہ پولیس کا آدمی میری جان چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ یہ لوگ اتنی آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑا کرتے۔ خاص طور پر جب انہیں کچھ شک پڑ جائے تو پھر تو یہ اگلے کو حوالات میں پہنچا کر ہی دم لیتے ہیں۔ بلکہ اس دوران اس شخص نے اپنے متعلقہ افسروں کو بھی میرے بارے میں بتا دیا ہو گا کہ ایک مشکوک آدمی کا پیچھا کر رہا ہوں۔

مجھے رات کے بارہ بجے سنگ مرمر کی چھتریوں والی مڑھیوں میں پہنچنا تھا۔ گیارہ بجے ہوٹل سے نکل کر میں نے ٹیکسی لی اور نندی کنڈ کی طرف چل پڑا۔ یہی اس علاقے کا نام تھا۔ بیکانیر کے رہنے والے حضرات اس نام سے ضرور واقف ہوں گے۔ ٹیکسی میں سوار ہونے سے پہلے میں نے اردگرد ایک سرسری سی نگاہ ضرور ڈالی۔ مجھے خفیہ پولیس والا

کہیں نظر نہیں آیا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ وہاں موجود ہے اور میرے پیچھے آئے گا۔ بہرحال مجھے اپنا کام ہر حالت میں پورا کرنا تھا۔ میں وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے پنڈت جی کے آشرم میں پہنچ گیا۔ میں اس چھوٹی سی کوٹھڑی کو آشرم ہی کہوں گا۔ پنڈت جی نے مجھے خالی ہاتھ آتے دیکھا تو ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اوتار ساوردھن کے چیلوں کے لئے کچھ نہیں لائے؟"

میں نے پشیمان ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"گوروجی! غلطی ہوگئی"

"یہ بہت ضروری تھا۔ اچھا تم ایسا کرو۔ ایک سو روپیہ بھنڈار خانے میں جمع کرادو۔ مجھے دے دو۔ میں خود سب میں بانٹ دوں گا"

میں نے مزید ایک سو روپے کا نوٹ پنڈت جی کے حوالے کر دیا۔ پنڈت جی نے مجھے اپنے قریب بٹھالیا اور کہنے لگے۔

"اوتار ساوردھن کی مڑھی کے اردگرد راجہ کی داشتاؤں کی مڑھیاں ہیں۔ ہمارے گوروجی کہا کرتے تھے ان داشتاؤں کی روحیں لومڑیاں بن کر رات کو بین کرتی ہیں۔ ان سے ڈرنا مت۔ کچھ داشتاؤں کی بدروحیں خوبصورت عورتوں کا روپ بدل کر برہنہ ہو کر اچانک سامنے آجاتی ہیں۔ ان کے قریب میں مت آنا۔ اور دھیان لگا کر ہری اوم کا جاپ جاری رکھنا۔ بھگوان مہاویر سے میری پرارتھنا ہے کہ وہ تمہارا منگل سوتر قبول کرلے۔ اب وقت ہو گیا ہے جاؤ اور مڑھی پر بیٹھ کر جاپ شروع کر دو۔ میں نے تمہیں مڑھی دکھا دی ہوئی ہے"

میں اوتار ساوردھن کی مڑھی پر جا کر بیٹھ گیا جو وہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر سنگ مرمر کی چھتریوں اور بارہ دریوں والی مڑھیوں کے درمیان واقع تھی۔ چونکہ یہ ایک اوتار کی مڑھی تھی۔ اس لئے اس کا چبوترہ ذرا اونچا تھا اور اوپر سنگ مرمر کی چھتری کے چاروں طرف کپڑے کی چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ صحرائی علاقہ ہونے کی وجہ

سے رات کو یہاں ٹھنڈ ہوگئی تھی۔ مگر مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ کمانڈو ٹریننگ نے میرا جسم لوہے کا بنا دیا تھا۔ چبوترے کے درمیان میں سنگ مرمر کا چوکور پتھر رکھا ہوا تھا۔ اس کے نیچے بقول پنڈت کے جین مت کے اوتار ساوردھن کی ہڈیاں دفن تھیں۔ پتھر کے اوپر گیندے کے پھولوں کے باسی اور کچھ تازہ ہار پڑے تھے۔ میں چبوترے کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ مجھے کوئی جاپ وغیرہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں را کے احمد آباد والے ہیڈ آفس کے انچارج گوکل داس پانڈے کی اکلوتی اور فیشن ایبل ماڈرن لڑکی میناکشی کو اپنے دام میں پھنسانے کی تدبیروں پر غور کرنے لگا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد مڑھی کے پتھر پر بھی نگاہ ڈال لیتا کہ کب وہاں جو سوراخ تھا اس میں سفید روشنی ہوتی ہے۔ یہ سوراخ میں نے دن کے وقت بھی دیکھ لیا تھا۔ یقیناً پاکھنڈی پنڈت نے زمین کے نیچے سے بجلی کی تار لے جا کر اس کے اندر سفید اور سرخ روشنی والے دو بلب لگا دیئے ہوئے تھے۔ ان کو وہ اپنی کوٹھڑی سے بٹن دبا کر روشن کر دیتا تھا۔ اور لوگوں کو بے وقوف بنا کر ان سے پیسے بٹورتا تھا۔ چار گانٹھوں والا زعفرانی رنگ کا منگل سوتر میری بائیں کلائی کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ میرے نزدیک نہ اس منگل سوتر کی کوئی روحانی اہمیت تھی نہ میں کسی اوتار وغیرہ کی روح کا قائل تھا۔ یہ میری اور میرے مشن کی ضرورت تھی جس کو مجھے ہر حالت میں پورا کرنا تھا۔ رات ٹھنڈی ہوگئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد آسمان پر ریت کے ٹیلوں کے پیچھے سے چاند نکل کر اوپر آگیا۔ اس کی زرد سرخی مائل چاندنی میں صحرائی رات ہلکی ہلکی روشن ہو کر اور زیادہ پر اسرار لگنے لگی۔ میری بائیں اور دائیں جانب راجہ کی داشتاؤں کی قبروں والی سنگ مرمر کی چھتریاں ساکت کھڑی تھیں۔ پنڈت نے مجھے مزید اپنے جال میں پھنسانے کے لئے کہا تھا کہ کبھی کبھی جاپ کرتے ہوئے بعض داشتاؤں کی بدروحیں لومڑیوں کی شکل میں وہاں آکر رونے لگتی ہیں۔ اور کبھی کبھی کسی داشتہ کی بد روح عورت کا روپ دھار کر برہنہ حالت میں سامنے آن کھڑی ہوتی ہے۔ ان سے ڈرنا مت۔ میں خوب سمجھتا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ویسے بھی مجھے ان باتوں سے کبھی ڈر نہیں لگا تھا۔

مجھے وہاں بیٹھے ہوئے تقریباً ایک گھنٹہ گذر گیا۔ مڑھی کے پتھر کے سوراخ میں روشنی نہ ہوئی۔ زرد بڑا سا چاند مشرق میں ریت کے ٹیلوں کے کافی اوپر آکر دوبار نیچے جا شروع ہو گیا تھا اور چاندنی سمٹنے لگی تھی۔ لیکن چاند کی روشنی میں مجھے آس پاس کی چیزیں برابر دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے پولیس انٹیلی جنیس والے آدمی کا بھی خیال لگا ہوا تھا۔ یہ کبھی ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ میرے پیچھے پیچھے نندی کنڈ تک نہ آیا ہو۔ ضرور وہ بھی یہیں کہیں چھپ کر میری حرکات کا جائزہ لے رہا ہو گا۔ اگرچہ وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا تھا۔

دو ڈھائی گھنٹے گذر گئے۔ چاند غروب ہوتے ہوتے مشرق میں ریت کے ٹیلوں کے اوپر آگیا۔ مجھ پر کچھ غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ مگر میں نے فوراً اپنے اوپر کنٹرول کر لیا لیکن کوئی ایک منٹ بعد پھر غنودگی سی ہونے لگی۔ اسی غنودگی کے عالم میں مجھے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے جلدی سے آنکھیں کھول کر پیچھے دیکھا پیچھے کوئی نہیں تھا۔ سنگ مرمر کی بارہ دریاں اور چھتریوں والی قبریں خاموش تھیں۔ تب مجھے فضا میں ایک دہشت کا احساس ہوا۔ میں نے دل میں کلمہ شریف پڑھنا شروع کر دیا تھوڑی دیر میں دہشت کا احساس ختم ہو گیا۔ میں بڑی بے چینی سے پتھر کے سوراخ میں ہونے والی روشنی کا انتظار کر رہا تھا۔ کم بخت پنڈت کہیں سو تو نہیں گیا؟ وہ بٹن سوراخ کے اندر والا بلب روشن کیوں نہیں کرتا۔ میں نے دکھشا دینے کے لئے سو روپے کے دو نوٹ پہلے ہی سے صدری کی جیب میں ڈال رکھے تھے۔

اتنے میں مجھے پھر وہی قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اب اس آہٹ کے ساتھ ہلکی جھنکار بھی سنائی دی تھی۔ جیسے کسی نے پاؤں میں چاندی کی پائل باندھ رکھی ہو۔ میں جلدی سے پلٹ کر دائیں جانب دیکھا۔ اس بار یہ آواز دائیں جانب سے آئی تھی دائیں جانب مجھ سے کوئی پندرہ قدموں کے فاصلے پر سنگ مرمر کی بارہ دری تھی۔ غروب ہوتی پھیکی چاندنی میں مجھے بارہ دری میں ایک عورت نظر آئی جس نے زعفرانی رنگ ساڑھی پہن رکھی تھی۔ مجھے اس کی شکل پوری طرح سے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ بارہ دری کے ستون کے گرد بازو ڈالے کھڑی میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی

میں سمجھ گیا کہ یہ اسی پاکھنڈی پنڈت کی بھیجی ہوئی عورت ہے جو اسی قسم کی حرکتوں سے لوگوں پر اپنی جعلی روحانی طاقت کا رعب جما کر انہیں اپنا مطیع بنائے رکھتا ہے۔ اب میں اسی انتظار میں تھا کہ یہ عورت کب برہنہ ہو کر میرے سامنے آتی ہے۔ کیونکہ پنڈت نے مجھے یہی کہا تھا۔ میں بغیر کسی ڈر خوف کے پندرہ قدموں کے فاصلے پر بارہ دری کے ستون سے لگ کر کھڑی عورت کو دیکھ رہا تھا۔ عورت بالکل ایک مورتی کی طرح بے حس وحرکت کھڑی تھی۔ پھر وہ آہستہ سے ستون سے الگ ہوئی۔ اس نے دور سے دونوں ہاتھ جوڑ کر اور سر کو جھکا کر مجھے سلام کیا اور پھر آہستہ آہستہ چلتی میری طرف آنے لگی۔

میں نے دل میں سوچ لیا تھا کہ پاکھنڈی پنڈت کی بھیجی ہوئی اس عورت کو میں آتے ہی پنجابی زبان میں دو چار گالیاں دے کر بھگا دوں گا۔ جیسے جیسے یہ عورت میرے قریب آرہی تھی ایک خاص قسم کی خوشبو بھی میرے قریب ہوتی جاتی تھی۔ میں دل میں ہنس دیا کہ کم بخت پنڈت نے اسے اپنے جسم پر لگانے کے لئے کوئی غیر ملکی اعلیٰ قسم کا پرفیوم بھی دیا ہے۔ عورت مجھ سے کوئی پانچ قدموں کے فاصلے پر آکر کھڑی ہو گئی۔ اس نے ہاتھ ابھی تک جوڑ رکھے تھے۔ جس طرح ہندو عورتیں مورتی کی پوجا کرتے وقت جوڑے رکھتی ہیں۔ چاند آدھا ریت کے ٹیلے کے پیچھے چلا گیا تھا۔ اس عورت کا آدھا رخ چاند کی طرف تھا۔ اسی طرف اس کے کان میں پڑا ہوا سرخ پتھر چمک رہا تھا۔ وہ ایک چھریرے قد کی دبلی پتلی لڑکی تھی۔ عمر اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہیں لگتی تھی۔ بالوں کی مانگ درمیان سے نکلی ہوئی تھی۔ ماتھے پر بھی سونے کی لڑی میں پرویا ہوا سرخ پتھر چمک رہا تھا۔ زعفرانی ساڑھی میں وہ غروب ہوتے چاند کی دھیمی روشنی میں ایک شعلے کی طرح لگ رہی تھی۔

میں اس عورت کو دو چار گالیاں دے کر بھگانے ہی والا تھا کہ اس نے بڑے درد بھرے لہجے میں کہا۔

"راناجی! مجھے پہچانا نہیں۔ میں آپ کی داسی آپ کی پتنی چندریکا ہوں"

اس عورت کی آواز میں ایک عجیب سا طلسم تھا جس سے میں بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ لیکن فوراً ہی میں نے اسے اپنا وہم سمجھ کر دل سے نکال دیا اور عورت کی طرف

متوجہ ہو کر کہا۔

"میں سب کچھ سمجھتا ہوں۔ تمہارا اور تمہارے پاکھنڈی پنڈت کے فراڈ کو بھی خوب سمجھتا ہوں۔ میں ویسا آدمی نہیں ہوں جیسا تم مجھے سمجھتی ہو۔ اسی لئے فوراً یہاں سے دفع ہو جاؤ"

عورت اسی طرح ہاتھ جوڑے کھڑی میری طرف دیکھتی رہی۔ جب میں نے دوسری بار اسے زیادہ سختی سے ڈانٹا تو مجھے اس کی آنکھوں میں آنسو چمکتے نظر آئے۔ گہرا سانس بھر کر بولی۔

"پتی دیو! مجھے میرے برے کرموں کی سزا ملی ہے۔ کہ مجھے میرا پتی بھی نہیں پہچانتا۔ میں تمہاری پتنی چندریکا ہوں میرے سوامی۔ مجھے اپنے گلے لگا لو۔ میرا پنر جنم سپھل ہو جائے گا"

وہ ذرا آگے بڑھی تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے غصے سے کہا۔

"بھاگ جاؤ بیسوا عورت۔ میں تمہارے فریب میں آنے والا نہیں ہوں"

عورت وہیں رک گئی۔ اس نے اداس نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ اور سر جھکا کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی واپس بارہ دری والی مڑھی کی طرف چلنے لگی۔ اس وقت چاند ریت کے ٹیلے کے پیچھے چھپ گیا تھا اور صحرا میں اندھیرا ہو گیا تھا۔ وہ عورت مجھے بارہ دری کے اندر تک جاتی دکھائی دی پھر وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں دل میں ڈرامہ باز پنڈت اور اس کی بھیجی ہوئی عورت کو برا بھلا کہتا بیٹھ گیا۔ اتنے میں سوراخ میں روشنی ہو گئی۔ کم بخت پنڈت نے بجلی کا بٹن دبا دیا تھا۔ روشنی تین چار سیکنڈ تک سفید ہی رہی۔ یعنی سوراخ کے اندر کہیں لگا ہوا چھوٹا سفید بلب ہی جلتا رہا۔ اس کے بعد روشنی سرخ ہو گئی۔ اسے سرخ ہونا ہی تھا۔ پنڈت نے مجھ سے دو سو روپے بھی تو وصول کرنے تھے۔ میں نے اس وقت دل میں پنڈت کو دو چار گالیاں دیں اور صدری کی جیب میں سے سو سو روپے کے دو نوٹ نکال کر سوراخ کے اندر ڈال دیئے۔ تھوڑی دیر بعد سرخ روشنی بھی بجھ گئی۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔

صحرا میں بڑی خوشگوار خنک ہوا چل رہی تھی۔ اسی ہوا میں ابھی تک مجھے وہ خوشبو محسوس ہو رہی تھی جو اس عورت کی زعفرانی ساڑھی میں سے آ رہی تھی۔ پھر یہ خوشبو ہلکی ہوتے ہوتے غائب ہو گئی۔ اس وقت رات کے ڈھائی تین بجے کا عمل ہو گا۔ اب وہاں میرا بیٹھنا بیکار تھا۔ میرا اور پنڈت دونوں کا کام ہو چکا تھا۔ میں نے سوچا یہاں بیٹھ کر کیا کروں گا۔ واپس پنڈت کے پاس ہی چلتا ہوں۔ میں اٹھا اور پنڈت کی کوٹھڑی کی طرف چلنے لگا۔ ریت کے ٹیلوں پر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہاں کوئی درخت بھی نہیں تھا۔ ریت ٹھنڈی اور نرم تھی۔ اوس گر رہی تھی۔ خنکی بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ صحرائی علاقے میں دن تو گرم ہوتا ہے مگر رات بڑی ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ چاند کے ڈوب جانے کے بعد ستاروں کی ٹمٹماہٹ زیادہ ہو گئی تھی۔ میں ریت کے چھوٹے ٹیلوں کے درمیان سے ہو کر جا رہا تھا۔ ٹیلوں کے نشیب میں اندھیرا تھا۔ ایک دو بار مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی چند قدم میرے ساتھ چل کر الگ ہو جاتا ہے۔ ایک جگہ رک کر میں نے چاروں طرف دیکھا وہاں سوائے میرے دوسرا کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے اسے اپنا وہم سمجھا اور آگے چل پڑا۔

پنڈت کی کوٹھڑی کا دروازہ بند تھا۔ میں نے سوراخ میں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ کوٹھڑی میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ پنڈت مڑھی والے سوراخ کی بتی بجھانے کے بعد اپنی کوٹھڑی کی بتی بھی بجھا کر سو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں اوتار ساوردھن کی مڑھی پر ایک لاکھ ہری اوم کا جاپ کر کے صبح ہی واپس آؤں گا۔ کوٹھڑی کے باہر ایک طرف لکڑی کا پرانا بنچ بچھا گر وَ نتی تی یو لیٹ گیا۔ نیند سے میری آنکھیں بند ہونے لگیں میں نے منگل سوتر والا ہاتھ اپنے سینے پر رکھا ہوا تھا۔ ابھی میں پوری طرح سویا نہیں تھا کہ اچانک مجھے لگا کسی نے میرے منگل سوتر والے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ہے۔ میں نے جلدی سے ہاتھ جھٹک دیا۔ اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے خیال آیا کہ یہ کوئی صحرائی چوہا وغیرہ ہو گا۔ جو میرے ہاتھ کے اوپر سے گزر گیا ہے۔ لیکن دل نہیں مانتا تھا۔ کیونکہ میں نے اپنے ہاتھ پر باقاعدہ کسی کے ہاتھ کی گرمی اور انگلیوں کا دباؤ محسوس کیا تھا۔ میں نے سوچا ہو سکتا

ہے یہاں کسی کی بدروح بھٹکتی پھر رہی ہو۔ مجھے وہ سارا علاقہ ہی آسیب زدہ لگنے لگا تھا۔

میں دوبارہ بنچ پر لیٹ گیا۔ اس کے بعد مجھے نیند آگئی اور کوئی ہوش نہ رہا۔ آنکھ اس وقت کھلی جب دن نکل آیا تھا اور پنڈت مجھے جگاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"بالک! مڑھی سے کب واپس آئے؟ جاپ پورا کر لیا تھا کیا؟"

میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا اور پنڈت سے کہا۔

"جاپ پورا ہو گیا تھا گورو دیو!"

"کیا اوتار ساوردھن کی آتما نے تمہارا منگل سوتر سویکار کر لیا؟"

میں نے دل میں کہا کیسا مکار پنڈت ہے۔ اسے سب کچھ معلوم ہے مگر مجھے بے وقوف بنا رہا ہے۔ میں نے کہہ دیا۔

"ہاں گورو دیو! میرا منگل سوتر ساوردھن کی آتما نے سویکار کر لیا ہے۔ میں نے دو سو روپے کی دکھشنا بھی سوراخ میں ڈال دی تھی"

پنڈت نے بڑی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"دھن ہو۔ دھن ہو۔ بچہ تو بڑا خوش قسمت ہے۔ جا اب تیرا ہر جنم میں کلیان ہو گا"

میں نے کہا۔ "گورو جی اب آگیہ دیں۔ میں واپس احمد آباد جاؤں گا"

پنڈت مجھ سے کچھ اور رقم بٹورنی چاہتا تھا۔ دونوں ہاتھ نفی میں ہلاتے ہوئے بولا۔

"نہ نہ نہ بچہ۔ ابھی تیرا کرم کانڈ پورا نہیں ہوا۔ تیرے منگل سوتر پر مجھے مہاویر جی کا خاص منتر پڑھ کر پھونکنا ہو گا۔"

میں نے بیزاری سے پوچھا۔

"اس کے کتنے پیسے ہوں گے؟"

پنڈت نے فوراً جواب دیا۔

"ایک سو روپیہ دکھشنا ہو گی۔ زیادہ نہیں"

میں وہاں سے جتنی جلدی ہو سکے نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے پنڈت کو سو روپے نکال

کر دیئے) اور کہا۔

"یہ کرم کانڈ بھی ابھی پورا کر دیں گورو جی۔ یہ لیجئے پورے سو روپے ہیں"

پنڈت بڑا خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

"تم یہاں بیٹھو۔ پہلے کچھ چائے پانی کر لیں۔ وہاں برآمدے میں آجاؤ۔"

کوٹھڑی کی دائیں جانب ایک چھوٹا سا ورانڈا تھا جہاں ایک چارپائی اور کرسی پڑی تھی۔ پنڈت نے اپنے کسی چیلے کو آواز دے کر چائے اور پوڑیاں لانے کو کہا۔ ہم برآمدے میں آکر بیٹھ گئے۔ پنڈت نے میرا منگل سوتر والا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور سنسکرت کے اشلوک پڑھنے لگا۔ سنسکرت زبان کو میں فوراً پہچان لیتا تھا۔ اگرچہ میں پڑھ لکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ منتر پڑھ رہا تھا کہ ملازم چائے اور پوڑیاں لے کر آگیا۔ اس نے ٹرے چارپائی پر رکھ دیا۔

پنڈت نے منتر مختصر کر کے میری کلائی پر بندھے ہوئے زعفرانی منگل سوتر پر دو بار پھونکا اور مسکراتا ہوا کہنے لگا۔

"اب تیرا سارا کام ہو گیا ہے۔ اب تو اوتار ساوردھن کا پکا بھگت بن گیا ہے۔ یہ لو پوڑیاں کھاؤ"

جلدی جلدی میں نے تھوڑا بہت کھایا۔ پنڈت نے کیتلی میں سے چائے پیالی میں ڈال کر مجھے دی۔

"داس وردھن! تو بڑا وردان ہے۔ تو نے جینی دھرم کا کرم کانڈ بھی پورا کر لیا ہے۔ اب تو جین بھگت بن کر مہاویر جی کے بھگتی مارگ کا پرچار کر۔ تیرا پنر جنم ختم ہو جائے گا"

میں نے کہا۔

"گورو جی! یہ سب تمہاری کرپا ہے۔ میں نے یہی سوچا ہے کہ اب باقی جیون مہاویر جی کی بھگتی کرکے ہی گذاروں"

جہاں ہم ورانڈے میں بیٹھے تھے وہاں ذرا فاصلے پر ایک درخت تھا۔ شاید کیکر کا

درخت تھا۔ اسی درخت کے ساتھ ایک بکری اور ایک گائے بندھی ہوئی تھی۔ میری نگاہ یونہی اس طرف گئی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی رات والی عورت درخت کے پاس کھڑی میری طرف دیکھ رہی ہے۔ مجھے بڑا غصہ آیا کہ یہ کم بخت یہاں بھی آگئی ہے۔ پھر سوچا کہ یہ تو پنڈت ہی کی تنخواہ دار ملازمہ ہے اور اسی کے کہنے پر رات کو مڑھی پر جاپ کرنے والوں کے پاس جاتی ہے اور اپنے آپ کو پرلوک کی دیوی ظاہر کر کے ان پر اثر ڈالتی ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس عورت کے سامنے پنڈت کی خبر لیتا ہوں۔ اسی عورت نے وہی رات والی زعفرانی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ دن کی روشنی میں اس کی شکل صاف نظر آرہی تھی۔ اس کے نقش بڑے تیکھے تھے اور رنگ سانولا تھا وہ مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ چلتی ہماری طرف آنے لگی۔

میں نے پنڈت جی سے کہا۔

"گوروجی! آپ بڑے وروان جینی ہیں۔ آپ تو اپنے پجاریوں کو جو کہیں وہ آپ کو پیش کر دیتے ہیں۔ پھر آپ کو کیا ضرورت ہے کہ آپ عورت کو پیسے دے کر مڑھی پر جاپ کرنے والوں کے پاس ان پر اثر ڈالنے کے لئے بھیجتے ہیں۔"

پنڈت تو بڑا حیران ہو کر مجھے تکنے لگا۔ بولا۔

"میں نے تو ایسا کبھی نہیں کیا۔ وہ جو میں نے تمہیں برہنہ عورت کے بارے میں خبردار کیا تھا تو وہ تو ایک بدروح ہے۔ یہاں سب قبریں اور مڑھیاں ہیں۔ یہاں رات کو اکثر بدروحیں پھرتی رہتی ہیں۔ میں نے اسی کام کے لئے کوئی عورت نہیں رکھی ہوئی"

اسی دوران وہ زعفرانی ساڑھی والی عورت جس نے مجھے اپنا نام چندریکا بتایا تھا ہمارے قریب آکر کھڑی ہو گئی تھی اور میری طرف مسلسل دیکھے جا رہی تھی۔ میں نے اس عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ذرا ترش لہجے میں کہا۔

"تو پھر یہ عورت رات کو میرے پاس کس نے بھیجی تھی؟"

میں نے جس طرف اشارہ کیا تھا پنڈت جی نے اس طرف دیکھا۔ پھر زیادہ حیران ہو کر میری طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"تو کس عورت کی بات کر رہا ہے؟"

میں نے مزید غصیلی آواز میں کہا۔

"یہ عورت جو ہمارے سامنے کھڑی ہے کیا آپ کو نظر نہیں آرہی؟"

پنڈت نے ایک بار پھر جس طرف میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا تھا۔ اس طرف دیکھا۔ اب پنڈت کے چہرے پر ایسے تاثرات ظاہر ہوئے جیسے اسے میری دماغی صحت پر شک ہونے لگا ہے۔ اس نے کہا۔

"یہاں تو کوئی عورت نہیں ہے۔ تم کس عورت کی بات کر رہے ہو؟"

مجھے بڑا غصہ آیا کہ یہ پاکھنڈی پنڈت دن کی روشنی میں میری آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایک عورت ہمارے سامنے کھڑی ہے اور یہ مجھے یہ تاثر دے کر بیوقوف بنا رہا ہے کہ یہاں تو کوئی عورت نہیں ہے۔ زعفرانی ساڑھی والی عورت مجھ سے کوئی ایک قدم دور کھڑی تھی۔ میں غصے میں اٹھا کہ اس عورت کا ہاتھ پکڑ کر پنڈت کو بتاؤں کہ میں اس عورت کی بات کر رہا ہوں۔ جو تمہاری رکھیل ہے جیسے ہی میں نے اس عورت کی کلائی پکڑنی چاہی میرا ہاتھ اس عورت کی کلائی کے آر پار ہو گیا۔ جیسے میں نے ہوا کو پکڑنے کی کوشش کی ہو۔ میں نے بوکھلاہٹ میں عورت کے بازو پر ہاتھ ڈالا تو اس کا بازو بھی میرے ہاتھ میں نہ آیا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ عورت ہوا کی بنی ہوئی ہے۔

زعفرانی ساڑھی والی عورت میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور ہاتھ باندھ کر کہا۔

"پتی دیو! جب تک تم میرے پتی ہونے کا اقرار نہیں کرو گے مجھے اس جنم میں نہیں چھو سکو گے"

میں کچھ ڈر ضرور گیا تھا۔ لیکن اپنے ہوش و حواس میں تھا میں نے اسے کوئی بدروح سمجھتے ہوئے ڈانٹ کر کہا۔

"تو جس کی بدروح ہے اسی کے پاس واپس چلی جا میں تیرے آسیب میں آنے

والا نہیں ہوں"

پنڈت کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے تک رہا تھا۔ بولا۔

"بچہ! تجھ پر اوم نام کے جاپ کا اثر ہو گیا ہے۔ کوئی بدروح تیرے پیچھے لگ گئی ہے۔ یہاں لیٹ جا۔ میں ابھی منتر پڑھ کر بدروح کو بھگاتا ہوں"

زعفرانی ساڑھی والی چندریکا کی ساری توجہ میری طرف تھی۔ اس نے پنڈت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ کہنے لگی۔ "میں جاتی ہوں پتی دیو۔ بھگوان تمہیں سکھی رکھے"

اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کیا اور خاموشی سے واپس درخت کی طرف چلی گئی۔ درخت کے پیچھے جاتی وہ مجھے ضرور نظر آئی۔ اس کے بعد جیسے وہ غائب ہو گئی۔ پنڈت نے مجھے بازو سے پکڑ کر کہا۔

"بیٹا یہاں چارپائی پر لیٹ جا۔ میں ابھی بدروح کو بھگا دیتا ہوں"

میں نے پنڈت جی سے کہا۔

"اس کی اب ضرورت نہیں ہے گوروجی! بدروح چلی گئی ہے۔ اب مجھے اجازت دیں۔ میں واپس جاؤں گا"

میں نے پنڈت جی کے گھٹنوں کو ہندوؤں کی طرح چھوا اور ریت کے ٹیلوں کی طرف چل دیا جن کے پیچھے نندی کنڈ کا چھوٹا سا گاؤں تھا۔ وہاں سے اکثر یکے بیکانیر شہر کی طرف جاتے رہتے تھے۔ زعفرانی ساڑھی والی عورت کا خیال میرے دل میں ضرور تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ یہیں نندی کنڈ میں ہی رہ جائے گی۔ میرے ساتھ نہیں لگی رہے گی۔ میں اسے کوئی بدروح ہی سمجھ رہا تھا۔ یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا کہ میں نے کسی بدروح کو دیکھا تھا اور وہ بھی ایک خوبصورت عورت کی شکل میں۔

نندی پور گاؤں میں یکوں کا اڈہ تھا۔ وہاں تین چار یکے کھڑے تھے۔ سواریاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں بھی ایک یکے میں بیٹھ گیا۔ اب مجھے خفیہ پولیس کے آدمی کا خیال آگیا کہ کہیں وہ بھی میرا پیچھا کرتا وہاں نہ آگیا ہو۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ گردن گھما کر

آس پاس دیکھا۔ وہاں تقریباً سب دیہاتی عورتیں اور مرد ہی تھے۔ وہ خفیہ پولیس والا آدمی مجھے دکھائی نہ دیا۔ میں مطمئن ہو کر بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد یکہ سواریوں کو لے کر بیکانیر شہر کی طرف چل پڑا۔ بیکانیر وہاں سے آٹھ میل دور تھا۔ یہ کچا ریتلا راستہ تھا جو بڑی سڑک سے نکل کر نندی کنڈ کے گاؤں کی طرف جاتا تھا۔ جب بڑی سڑک آئی تو یکہ اس کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ اسی سڑک پر سے کبھی کبھی کوئی ٹرک گاڑی یا فوجی جیپ گذر جاتی تھی۔

بیکانیر شہر پہنچ کر میں اپنے ہوٹل میں آگیا۔ یہ ایک درمیانے درجے کا ہوٹل تھا جو لاری اڈے کے عقب میں واقع تھا۔ میرا کمرہ دوسری منزل پر تھا۔ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ غسل خانہ ساتھ ہی تھا۔ اسی لئے مجھے دوگنا کرایہ دینا پڑا تھا۔ میں نے کمرے میں آتے ہی غسل کیا۔ کپڑے پہنے ہوٹل کا ملازم لڑکا آگیا۔ اس نے پوچھا۔

"بھوجن کس وقت لاؤں سر"

میں نے اس سے پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہے جودھپور کو گاڑی کس وقت جاتی ہے؟"

لڑکا بولا۔

"گاڑی تو شام کو سات بجے جاتی ہے سر آپ لاری پر کیوں نہیں چلے جاتے۔ یہاں سے گھنٹے گھنٹے بعد جودھپور کو لاریاں چلتی ہیں"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم ایسا کرو میرے لئے چائے لے آؤ"

کمرے میں کل کا ہندی کا اخبار پڑا تھا۔ میں ہندی پڑھ لکھ لیتا تھا۔ میں پلنگ پر لیٹ کر اخبار پڑھنے لگا۔ چھت کے ساتھ لگا ہوا پنکھا دھیمی رفتار سے چل رہا تھا۔ کمرے کی کھڑکی کھلی تھی جس میں سے ہوا اندر آرہی تھی جو آہستہ آہستہ گرم ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے دیکھا تھا کہ بیکانیر میں دن کے وقت تیز ہوائیں چلتی رہتی تھیں اور ان میں ریت کے ذرے شامل ہوتے تھے۔ اس وقت بھی یہی گرم ہوا کھڑکی میں سے اندر آرہی تھی۔ میں

اخبار رکھ کر کھڑکی بند کرنے کے لئے اٹھا۔ یہ کھڑکی ہوٹل کی پچھلی جانب کھلتی تھی۔ یہاں سے دور دور تک پھیلے ہوئے ریت کے ٹیلے اور ان میں بنے ہوئے مکان نظر آتے تھے۔ کھڑکی سے تھوڑے فاصلے پر نیچے ایک درخت تھا۔ میں کھڑکی بند کرنے لگا تو زعفرانی ساڑھی والی عورت چندریکا مجھے ایک بار پھر دکھائی دی۔ وہ درخت کے نیچے کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑ رکھے تھے اور جیسے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ مجھے غصہ آگیا۔ کم بخت یہ بدروح میرا پیچھا کرتے یہاں بھی آگئی تھی۔ میں نے کھڑکی بند کر کے چٹخنی لگا دی اور پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ اس بدروح سے کس طرح پیچھا چھڑاؤں؟ پھر خیال آیا کہ یہ بے ضرر سی ہوائی مخلوق ہے۔ مجھے خوامخواہ اپنا خاوند جتانے لگی ہے۔ ہندو عورت کی بدروح ہونے کی وجہ سے وہ آواگون پر عقیدہ رکھتی ہے اور یہ سمجھ بیٹھی ہے کہ میں پچھلے جنم میں اس کا خاوند رہ چکا ہوں۔ میں ہندوؤں کے آواگون کے عقیدے سے بخوبی واقف تھا۔ اپنا نام چندریکا بتاتی ہے اور کسی کو چھو بھی نہیں سکتی نہ اسے کوئی چھو سکتا ہے۔ بالکل بخارات کی طرح ہے۔ اگر کبھی کبھی سامنے آجاتی ہے تو آتی رہے۔ میرا کیا بگاڑتی ہے◆

میں نے اٹھ کر کھڑکی کھولی درخت کی طرف دیکھا۔ چندریکا کی بدروح وہاں پر نہیں تھی۔ اب میری ساری توجہ اپنے مشن کی طرف تھی۔ میں نے کھڑکی بند کر دی اور کرسی پر بیٹھ کر غور کرنے لگا کہ مجھے را کے انچارج گوگل داس پانڈے کی بیٹی میناکشی پر کس طرح غلبہ حاصل کرنا چاہئے۔ آرام دہ کرسی پر نیم دراز تھا۔ غنودگی سی طاری ہو گئی اور سو گیا۔ آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا تھا۔ جلدی سے اٹھ کر بتی جلائی گھڑی دیکھی۔ شام کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ ہوٹل کے لڑکے نے کہا تھا کہ بیکانیر سے شام کے وقت گاڑی جودھپور کو جاتی ہے۔ میں نیچے جانے لگا تو دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے ہوٹل والا لڑکا چائے کی پیالی لئے کھڑا تھا۔

"سر! میں پہلے بھی دروازہ کھٹکھٹا کر چلا گیا تھا۔ آپ شاید سو رہے تھے"

میں نے کہا۔

"جودھپور جانے والی گاڑی کا ٹائم کیا ہے؟"

لڑکا بولا

"سات بجے والی گاڑی تو چلی گئی ہوگی۔ اب رات کو بارہ بجے ایک گاڑی جائے گی"

مجھے بڑا افسوس ہوا کہ خوامخواہ سو گیا اور گاڑی چھوٹ گئی۔ میں اب ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا اور جتنی جلدی ہو سکے واپس احمد آباد پہنچ کر اپنے مشن کا آپریشن شروع کر دینا چاہتا تھا۔ میں نے چائے کی پیالی لے لی اور لڑکے سے کہا۔

"میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ اگر سو گیا تو مجھے گیارہ بجے رات کو آکر جگا دینا۔ دروازہ کھلا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے سر!"

لڑکا چلا گیا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور کرسی پر بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ چائے ختم کی کمرے میں کچھ گرمی سی محسوس ہوئی اٹھ کر کھڑکی کھول دی۔ کھڑکی میں سے بیکانیر کے صحرائی خنک ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے۔ میرے پاس کوئی سامان تو تھا نہیں۔ اکیلی جان تھی۔ کلائی میں منگل سوتر بندھا تھا۔ ماتھے پر جین مت کا تلک لگا تھا۔ جیب میں انڈین کرنسی کے ڈیڑھ دو سو روپے باقی محفوظ پڑے تھے۔ بظاہر احمد آباد تک میرا راستہ صاف تھا۔ خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ میرا حلیہ پورا جینی ہندوؤں ایسا تھا۔ میں ہندی میں بات کر سکتا تھا۔ کسی کو ذرا سا بھی شک نہیں پڑ سکتا تھا۔ کہ میں مسلمان ہوں۔

جودھپور کی گاڑی چھوٹنے میں ابھی تین چار گھنٹے پڑے تھے۔ کمانڈو ٹریننگ نے میرے اعصاب کو فولاد سے بھی زیادہ صبر آزما اور مضبوط بنا دیا تھا۔ میں بند کمرے میں بیٹھ کر تین چار گھنٹے انتظار کر سکتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے سے آگاہ کر رہی تھی۔ پہلے تو میں نے یہی سمجھا کہ چونکہ میری ساری توجہ جلد از جلد احمد آباد پہنچنے کی ہے اس لئے غیر شعوری طور پر میرے اعصاب اضطراب کا اظہار کرنے لگے ہیں۔ میں پلنگ سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔

آنکھیں بند کرلیں۔ سوچا تھوڑی دیر آرام کرلیتا ہوں۔ آگے ٹرین میں احمد آباد تک بڑا
لمبا سفر ہے۔ جودھپور میں گاڑی بھی بدلنی پڑے گی۔ میرا خیال خفیہ پولیس کے آدمی کی
طرف چلا گیا۔ کہیں وہ میرا پیچھا کرتا ہوٹل تک نہ پہنچ گیا ہو۔ لیکن سارا دن وہ مجھے کہیں
نظر نہیں آیا تھا۔ ہو سکتا ہے میرے بارے میں اس کا یہ شبہ کہ میں ہندو کے بھیس میں
مسلمان پاکستانی جاسوس ہوں دور ہو گیا ہو اور اس نے میرا پیچھا کرنا ترک کر دیا ہو۔ ورنہ
وہ ہوٹل کے اردگرد منڈلاتا ضرور نظر آجاتا۔ اتنے میں مجھے دروازہ کھلنے کی ہلکی سی آواز
آئی۔ میں نے لیٹے لیٹے آنکھیں کھول دیں۔ کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ اس کی روشنی
میں میں نے جو منظر دیکھا اس نے ایک بار تو میرے جسم کو برف کی طرح ٹھنڈا کر دیا۔ مجھے
یوں لگا جیسے میرا خون میری رگوں میں جم گیا ہے۔ دروازے میں وہی خفیہ پولیس والا آدمی
کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور پستول کا رخ میری طرف تھا۔ اس نے بڑے
سکون سے کہا۔

"تم مسلمان ہو۔ پاکستانی جاسوس ہو۔ یہ بات ثابت ہو گئی ہے کوئی حرکت نہ
کرنا۔ میرا پستول بھرا ہوا ہے اور میرا نشانہ کبھی خالی نہیں گیا"

میں نے بھی بڑی جلدی اپنے حواس پر قابو پالیا اور کہا۔

"مہاشہ جی آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نہ تو مسلمان ہوں نہ پاکستانی جاسوس
ہوں۔ میں جینی ہندو ہوں۔ میرا نام داس وزدھن ہے۔ نندی کنڈ کے پنڈت
جی سے منگل سوتر لینے آیا تھا۔ اب واپس احمد آباد جا رہا ہوں"

خفیہ پولیس والے نے مجھے گالی دے کر کہا۔

"تھانے چل کر جب تمہارا پاجامہ اتروایا گیا تو تمہارے مسلمان ہونے کا راز
کھل جائے گا۔ نیچے پولیس کی گارد تمہیں گرفتار کرنے کے لئے موجود ہے۔
بھاگنے کی کوشش کرو گے تو تمہاری لاش خون میں تڑپ رہی ہوگی۔ خاموشی
سے اٹھ کر میرے آگے لگ کر نیچے چلو"

اگر دیکھا جائے تو میں مصیبت میں پوری طرح پھنس چکا تھا۔ اگرچہ اس خفیہ پولیس

والے ہندو سپاہی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ ایک تجربہ کار ٹرینڈ کمانڈو کو للکار رہا ہے۔ لیکن
جب دشمن کے ہاتھ میں پستول ہو اور پستول کی نالی کا رخ کمانڈو کے سینے کی طرف ہو تو
کمانڈو بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ جو بات مجھے سب سے زیادہ پریشان کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ
میں نہیں چاہتا تھا کہ یہاں کی پولیس میرا چہرہ ایک مشتبہ جاسوس کی حیثیت سے دیکھے۔ اگر
مجھے تھانے لے جایا گیا تو وہ پولیس آفیسر میری تصویر بھی اتاریں گے۔ میرے ہاتھوں کی
انگلیوں کے نشان بھی لے لیں گے۔ میں اگر اس کے بعد پولیس کی حراست سے فرار بھی
ہو جاؤں تو راجستھان کی پولیس کے پاس میری تصویر اور انگلیوں کے نشان ریکارڈ میں
موجود ہوں گے۔ میری تصویر اخباروں میں ایک مفرور پاکستانی جاسوس کی حیثیت سے
چھپ جائے گی اور یہ تصویر ظاہر ہے را کے احمد آباد والے ہیڈ آفس کے انچارج گوکل
داس پانڈے کی نظر سے بھی گذرے گی جو میرا اصل ٹارگٹ ہے اور یوں میرا انتہائی اہم
مشن شروع ہونے سے پہلے ہی ملیامیٹ ہو جائے گا۔ اس وقت ضرورت اس بات کی تھی
کہ اس خفیہ پولیس والے ہندو آفیسر کو کمرے کے اندر ہی قتل کر دیا جائے تاکہ میرا راز
کمرے سے باہر نہ نکلنے پائے۔ کیونکہ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت تھی کہ میرے ختنے ہو
چکے تھے اور یہ راز کھل جانے کے بعد میرے سارے مشن کے برباد ہو جانے میں کوئی
شک شبہ نہیں تھا۔ میرے اندر کا کمانڈو بیدار ہو گیا۔ مجھے ہر حالت میں اس خفیہ پولیس
والے کو قتل کرنا تھا۔ میں نے ایک طریقہ سوچ لیا اور آہستہ سے پلنگ پر سے اٹھا۔ خفیہ
پولیس افسر کے پستول کی نالی کا رخ سیدھا میرے دل کی طرف تھا۔

اس کے بعد کیا ہوا بھارت کے فرعون حصہ دوم

"کمانڈو آپریشن" میں پڑھیئے